ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔ تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ سرمایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم۔ خلافت بنی امیہ۔

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت جلد چہارم۔ خلافت ہسپانیہ۔ تاریخ ملت حصہ پنجم خلافت عباسیہ اول۔

سنہ ۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل) تاریخ ملت حصہ ششم، خلافت عباسیہ دوم، بصائر

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ، تدوین قرآن، اسلام کا نظام مساجد۔ اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم۔ خلافت عثمانیہ۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ کتابت حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ تاریخ ملت جلد نہم تاریخ صقلیہ

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام۔ تاریخ ادبیات ایران۔ تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم۔ سلاطین ہند اول۔ تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی۔

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد سوم۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات۔

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم۔ صدیق اکبرؓ۔ تاریخ ملت حصہ یازدہم۔ سلاطین ہند دوم۔ انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد۔

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ تاریخ گجرات۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مصائب سرمد کونین

برہان

جلد ۱۱۱　جنوری و فروری ۱۹۹۳ء مطابق رجب المرجب و شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ　شمارہ ۱، ۲

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر میں عوام الناس اخلاقی قدروں سے اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ اب انھیں اخلاقیات کی کسی بھی تعلیم و وعظ ہی کو سننے میں کوفت اور بوریت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آئے دن وہ واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جو حیوانیت کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔ قدرت نے انسان اور حیوان میں جو فرق و امتیاز قائم کیا ہوا ہے۔ موجودہ دور کے انسانوں کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اسے ختم کر کے اپنے لئے وہ منحوس راستہ انتخاب کیا ہے جو انسانیت سے کوسوں دور ہے اور حیوانیت کے بالکل قریب ہے۔ جس کی وجہ سے انسانوں کے لئے مشکلات ہی مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ قدرت نے جس انسان کے لئے آسانیاں اور راحتیں پیدا کی تھیں اس انسان نے اپنی خودی کے زعم میں مبتلا ہو کر خود اپنے لئے تباہی و بربادی کا سامان خود ہی مہیا کر لیا ہے ۔ انسان نے اپنی محدود عقل کی بنا پر قدرت کی آسائشوں کو اپنے لئے ناکافی سمجھا جس کی وجہ سے وہ مزید آسائشوں کے حصول کے چکر میں ایسا جا پھنسا کہ اب اسے اس میں سے نکلنے کے لئے کوئی راہ نہیں سوجھتی دکھائی دے رہی ہے۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا ہے کہ قدرت نے انسان کے لئے جو اصول و نظام بنایا ہے وہ ہی اس کے لئے مفید ہے اور انسان خود جو اصول اپنے لئے بناتا ہے وہ اس کی کم عقلی و ناواقفیت کی بنا پر مضر و نقصاندہ اور انسانیت کے لئے باعثِ ہلاکت ہی ہے ۔ یعنی قدرت نے انسان کے لئے جو راستہ بنایا اس پر چلنے میں انسان کی فلاح و بہبودگی ہے اور انسان نے اپنے لئے جو راستہ بنایا اس پر چلنے سے انسان خود اپنی تباہی و بربادی کا سامان پیدا کرنے کا باعث بنا۔

قانونِ قدرت سے راہ فرار اختیار کرنے سے بنی نوع انسانی کے لئے کس قدر مسائل پیدا ہوئے ہیں اسے آج بڑے بڑے سائنسداں اور ماڈرن علوم کے ماہر و دلدادہ بھی ماننے پر مجبور ہیں کہ انسان نے خود ہی اپنی تباہی و بربادی کا کنواں کھود ڈالا ہے اس سے کسی بھی طرح نکلنا اب انسانی دسترس سے باہر کی بات ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہیاں ہمارے سامنے ہیں کہ انسانوں کے پیدا کردہ ہتھیاروں ہی سے ہزاروں لاکھوں انسان آناً فاناً موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ ہیروشیما و ناگاساکی میں انسانوں کے بنائے ہوئے بموں سے انسانی زندگی کے نام و نشان ہی مٹ گئے تھے۔ آج بھی ایسے ایسے ہتھیار و بم انسانوں کے ہاتھوں سے بنے ہوئے ہیں کہ جس کے استعمال سے خود بنی نوعِ انسانی کی مکمل تباہی کا سامان موجود ہے۔ امریکہ کے پاس بیس ہزار بم، راکٹ و میزائل ہیں اور روس کے پاس دس ہزار راکٹ وغیرہ ہیں جن کے لئے مبصرین کا کہنا ہے کہ یہ اس قدر تباہ کن طاقت ہے اگر اسے استعمال کیا جائے تو ساری دنیا دس دس بار آناً فاناً تباہ ہوسکتی ہے تباہی کے اتنے سارے سامان بنا تو دیئے گئے مگر جب ان کی تباہیوں کے نقشے سامنے آئے تو ہی دنیا کے انسان پریشان ہیں کہ انہیں ضائع کس طرح کریں۔

اسی طرح قانونِ قدرت سے راہِ فرار اختیار کرکے ہم نے دیگر گناہ کاریوں کے راستے بھی اپنا رکھے ہیں، شرم و حیا کو بالائے طاق رکھکر بے حیائی کے ساتھ عریانیت کو اپنایا ہے۔ مرد و عورت کے پاکیزہ رشتوں کی مٹی پلید کرکے رکھدی ہے۔ اونچی اونچی سوسائٹی میں بے حیائی رواج پا چکی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں شہزادہ ایڈورڈ برطانیہ کے تخت پر جب بیٹھا تو اس کی محبت ایک ایسی عورت سے تھی جو ایکبار نہیں دو بار کی طلاق شدہ تھی اور آج ۱۹۹۳ء میں اسی برطانیہ میں ۱۹۳۶ء سے دو قدم اور آگے شاہی خاندان کے خوبصورت ترین شہزادہ چارلس کی شادی انتہائی حسین و جمیل لڑکی ڈائنا سے ہوئی، وہ آپس میں ایک دوسرے سے بدظن ہیں اور طلاق لینا چاہتے ہیں، امریکہ کے سابق صدر جان کینڈی کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اپنے سرکاری دفتر کے ساتھ ایک مخصوص کمرے میں خوب صورت عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتے تھے حالیہ سابق صدر رونالڈ ریگن کے ساتھ اسی قسم کی کہانیاں مخصوص ہیں۔ برطانیہ کی مہارانی

الزبتھ کی چھوٹی بہن اپنے خاوندوں کو طلاق دے چکی ہیں اور ان کی بیٹی و چھوٹا بیٹا بھی طلاق دے چکا ہے ایک بیٹے کی بیوی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ مغربی ملکوں میں تو یہ بات عرصہ سے عام تھی کہ مرد اپنی بیوی کے ساتھ اور بیویاں اپنے مردوں کے ساتھ وفادار نہیں ہوتیں۔ مگر یہ بات صرف مغربی ملکوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے مشرقی ملکوں میں بھی ایسی باتیں خاص نہیں عام ہو چکی ہیں۔ ایک مرد کسی دوسری عورت سے تعلق جنسی پیدا کر لیتا ہے اور اسی طرح کوئی عورت کسی بھی دیگر مرد سے جنسی تعلق پیدا کرنے میں کوئی جھجھک نہیں سمجھتی ہے اور اب تو حد ہو چکی ہے کہ ہم جنسیات کی لت و شوق بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔

تاریخ میں ہم قوم لوط کے قصے پڑھا کرتے تھے مگر آج ہم جنسیات مرد مرد ہی میں نہیں رہی بلکہ عورتوں عورتوں میں بھی ہو گئی ہے۔ بے شرمی کی حد ہے کہ ان خرافات کے لئے کھلے عام آئینی حق بھی مانگا جا رہا ہے۔ ان سب کا جو نتیجہ ہے وہ انسانوں کی ہلاکت کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ نت نئی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں کینسر کی بیماری کا علاج ابھی ڈھونڈا نہیں جا سکا ہے کہ ایڈس کی خطرناک بیماری نے انسانوں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہے یہ بیماری اس قدر خطرناک ہے کہ اس کے جراثیم ہی انسانوں کے جم غفیر کو بربریت کے ساتھ ہلاک کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

عیش و عشرت کے اس ماحول میں انسانی خواہشات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے جس کی وجہ سے آج پورا انسانی معاشرہ اخلاقیات کی کسی بندش میں بندھنے کو تیار و آمادہ نہیں ہے بھرشٹاچار کسی دور میں عام انسانوں کے لئے نہ معلوم چیز تھی آج معلوم و معروف چیز ہے ہر جگہ بھرشٹاچار ہے رشوتوں کا بازار گرم ہے سرکاری محکموں میں اور بڑے بڑے افسران کے یہاں رشوت کے بغیر کوئی کام ہی نہیں ہوتا ہے زندگی کے ہر شعبہ میں بھرشٹاچار کی فرمانروائی ہے جس سے عام انسان مہنگائی کے مارے بے بس رہا ہے بھرشٹاچار کی وجہ سے مہنگائی ہوتی ہے اور عام انسان چونکہ بے سہارا و بے بس ہوتا ہے اس لئے ان سب باتوں کا اس پر زیادہ ہی اثر پڑتا ہے۔ ان حالات میں عقل حیران ہے دماغ پریشان ہے کہ انسان خود اپنی زندگی کی راہوں

کو غلط راستوں پر بھٹکا کر اور غلط اندازوں سے اپنے آسائش و آرام کے سامان مہیا کر کے زندگی کو کس قدر بھول بھلیوں میں پھنسا چکا ہے۔

یہ وقت ہے کہ ہم بنی نوع انسان کے سامنے انسانیت کی صحیح معنوں میں فلاح و بہبودگی کی خاطر اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات کا پیغام پیش کریں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اور اپنائے ہوئے اسوۂ حسنہ کا ذکر کریں۔ بنی نوع انسان کی ترقی کامیابی کے لئے اس سے اچھا راستہ اور کوئی نہیں ہوسکتا ہے۔ انسانیت کی ہلاکت کی یہ بیماری کسی ایک ملک میں نہیں ہر ملک میں پیدا ہوچکی ہے اس لئے ہمارا خطاب پوری انسانی عالمی برادری سے ہے اور اس کے لئے صحیح علاج اسلامی راہ عمل و اسلامی نظام ہی کی آغوش میں چلے جانے میں ہے۔ تمام دنیا کے انسان اپنے پیدا کئے ہوئے غلط اسباب سے عاجز ہیں اور وہ تلاش میں ہیں فلاح و عافیت کے راستے کی۔ علماء اسلام کا فرض ہے کہ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اسلام کے بہترین پیغام عمل کو عالم انسانیت کے سامنے بلا تکلف پیش کریں۔

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ جامع مسجد دہلی میں مسلسل کرفیو کے نتیجے میں درپیش مسائل اور رکاوٹوں کی وجہ سے جنوری کا شمارہ وقت پر شائع نہیں ہوسکا۔ اس لئے موجودہ شمارہ جنوری اور فروری کا یکجا شائع کیا جارہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین کرام ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے۔　　(ادارہ)

وفیات

انتقال پرملال

حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے انتہائی عقیدت مند سردار نرنجن سنگھ لانبہ
۴ جنوری ۱۹۹۴ء کی علی الصبح کو اچانک انتقال فرماگئے۔ وہ ۸۴ سال کے تھے۔ اور بڑے ہی
مخلص اور غریبوں کے ہمدرد و بہی خواہ تھے۔ بہت بڑے کاروباری ہوتے ہوئے بھی
بے سہاروں، بیواؤں، یتیموں کی فلاح و بہبودگی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے
تھے انسانیت کی خدمت میں ہمیشہ جٹے رہتے تھے۔

مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے جاں نثار و فدائی تھے۔ ان سے تعلق خصوصی قیام پاکستان
سے قبل راولپنڈی ہی سے تھا برابر اس وقت خط و کتابت رہتی تھی قیام پاکستان کے بعد
حضرت مفتی صاحبؒ کی عقیدت و محبت ہی انہیں دہلی کھینچ لائی تھی۔ تعصبات و تنگ نظری
سے بالکل پاک و صاف تھے بلا لحاظ مذہب و ملت ضرورت مندوں کی امداد کرتے رہتے تھے۔
حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے انتقال کی خبر سنتے ہی بلک بلک کر رونے لگے اور کہنے لگے
کہ آج ہمارے مسلمانانِ ہند اور ملک کے اوپر سے سایۂ شفقت اٹھ گیا ہے۔ مفتی صاحبؒ کے
جنازے میں باوجود سخت بیماری و تکلیف کے جامع مسجد سے مہندیان تک پیدل ہی چلتے
رہے لوگوں نے ان کے درد کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے انھیں سواری میں بیٹھنے کے
لئے کہا تو بولے کہ جس ہستی نے ملک و قوم کی خدمت میں اپنی پوری زندگی قربان کر دی
اس ہستی کے لئے ہم پیدل بھی نہیں چل سکتے کیا؟۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لانبہ صاحب قدیم روایات و تہذیب کے امین تھے۔ ان کے
انتقال سے ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ انکے انتقال پرملال پر ہم سب کو
ان کے متعلقین کو اور ان کے تمام احباب کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)
ادارہ ندوۃ المصنفین، رسالہ برہان انکی اہلیہ اور ان کے صاحبزدگان کلدیپ، کیول
سورن، جتندر اور جگ پربیت سنگھ سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

مہر کا فلسفہ اور اس کے احکام

از:- مولانا محمد شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور۔

پہلی قسط

مہر میں عورت کا شرعی حق:

عورت سے جسمانی طور پر مستفید ہونے کے لئے شریعت نے مرد پر ایک معقول معاوضہ عائد کیا ہے جسے فقہی اصطلاح میں مہر کہا جاتا ہے۔ اور اس معاوضہ یا صلہ کی ادائیگی شوہر پر واجب ہے۔

المھر ھو المال یجب فی عقد النکاح علی الزوج فی مقابلۃ منافع البضع۔

مہر وہ مال ہے جو شوہر پر عقد النکاح کے وقت منافع فرج کے مقابلہ میں واجب ہوتا ہے۔[92]

مہر عورت کا ایک خاص شرعی حق ہے اور وہ اس کی پوری طرح مالک قرار پاتی ہے۔ کہ وہ اسے جس طرح چاہے اپنی مرضی سے خرچ کرے۔ کسی کو روکنے ٹوکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شوہر بھی اسے روک ٹوک نہیں سکتا۔

دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلامی شریعت کا ایک خاص امتیاز ہے کہ وہ عورت کو نکاح کے موقع پر مہر کے نام سے ایک معقول رقم دلاتی ہے اور اس پر اسے پوری طرح مالکانہ حقوق عطا کرتی ہے۔ چونکہ عورت نہ صرف مرد کا گھر بسانے کے لئے اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر اس کے یہاں چلی آتی ہے بلکہ اس کے ماتحت رہتے ہوئے اپنا سب کچھ شوہر اور بچوں پر لٹا دیتی ہے۔ اس کا شوہر اور اس کے بچے ہی اس کی دنیا ہوتے ہیں۔ انہی کی خاطر وہ جیتی اور مرتی ہے۔ لہٰذا اس کا اپنا بھی کچھ حق ہونا چاہیئے۔

---

[92] عنایہ شرح ہدایہ، برحاشیہ فتح القدیر: ۳/۲۰۴۔

وفیات

انتقالِ پُرملال

حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے انتہائی عقیدت مند سردار نرنجن سنگھ لامبہ ۴ جنوری ۹۵ء کی علی الصبح کو اچانک انتقال فرما گئے۔ وہ ۸۴ سال کے تھے۔ اور بڑے ہی مخلص اور غریبوں کے ہمدرد و بہی خواہ تھے بہت بڑے کاروباری ہوتے ہوئے بھی بے سہاروں، بیواؤں، یتیموں کی فلاح و بہبودگی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے انسانیت کی خدمت میں ہمیشہ جٹے رہتے تھے۔

مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے جاں نثار و فدائی تھے۔ ان سے تعلق خصوصی قیامِ پاکستان سے قبل راولپنڈی ہی سے تھا برابر اس وقت خط و کتابت رہتی تھی قیامِ پاکستان کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کی عقیدت و محبت ہی انہیں دہلی کھینچ لائی تھی۔ تعصبات و تنگ نظری سے بالکل پاک و صاف تھے بلا لحاظ مذہب و ملت ضرورت مندوں کی امداد کرتے رہتے تھے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے انتقال کی خبر سنتے ہی بلک بلک کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ آج ہمارے مسلمانانِ ہند اور ملک کے اوپر سے سایۂ شفقت اٹھ گیا ہے۔ مفتی صاحبؒ کے جنازے میں باوجود ضعف بیماری و تکلیف کے جامع مسجد سے مہندیان تک پیدل ہی چلتے رہے لوگوں نے ان کے درد کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے انھیں سواری میں بیٹھنے کے لئے کہا تو بولے کہ جس ہستی نے ملک و قوم کی خدمت میں اپنی پوری زندگی قربان کر دی اس ہستی کے لئے ہم پیدل بھی نہیں چل سکتے کیا؟۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لامبہ صاحب قدیم روایات و تہذیب کے امین تھے۔ ان کے انتقال سے ایک خلا رسا محسوس ہو رہا ہے حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ انکے انتقال پر ملال پر ہم سب کو ان کے متعلقین کو اور ان کے تمام احباب کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

ادارہ ندوۃ المصنفین، رسالہ برہان انکی اہلیہ اور ان کے صاحبزدگان کلدیپ، کیول سورن، جتندرا و رجگ پریتا سنگھ سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

مہر کا فلسفہ اور اس کے احکام

از: مولانا محمد شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور

پہلی قسط

مہر میں عورت کا شرعی حق!

عورت سے جسمانی طور پر مستفید ہونے کے لئے شریعت نے مرد پر ایک معقول معاوضہ عائد کیا ہے جسے فقہی اصطلاح میں مہر کہا جاتا ہے۔ اور اس معاوضہ یا صلہ کی ادائیگی شوہر پر واجب ہے۔

المھر ھو المال یجب فی عقد النکاح علی الزوج فی مقابلۃ منافع البضع

مہر وہ مال ہے جو شوہر پر عقد النکاح کے وقت منافع فرج کے مقابلہ میں واجب ہوتا ہے[۹۲]۔

مہر عورت کا ایک خاص شرعی حق ہے اور وہ اس کی پوری طرح مالک قرار پاتی ہے کہ وہ اسے جس طرح چاہے اپنی مرضی سے خرچ کرے۔ کسی کو روکنے ٹوکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شوہر بھی اسے روک ٹوک نہیں سکتا۔

دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلامی شریعت کا ایک خاص امتیاز ہے کہ وہ عورت کو نکاح کے موقع پر مہر کے نام سے ایک معقول رقم دلاتی ہے اور اس پر اسے پوری طرح مالکانہ حقوق عطا کرتی ہے۔ چونکہ عورت نہ صرف مرد کا گھر بسانے کے لئے اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر اس کے یہاں چلی آتی ہے بلکہ اس کے ماتحت رہتے ہوئے اپنا سب کچھ شوہر اور بچوں پر لٹا دیتی ہے۔ اس کا شوہر اور اس کے بچے ہی اس کی دنیا ہوتے ہیں۔ انہی کی خاطر وہ جیتی اور مرتی ہے۔ لہٰذا اس کا اپنا بھی کچھ حق ہونا چاہیئے۔

---

۹۲ عنایہ شرح ہدایہ، برحاشیہ فتح القدیر: ۳/۲۰۴۔

مہر کے نام سے جو تھوڑی بہت رقم اسے ملتی ہے وہ اس کی خدمات کا پورا پورا صلہ تو نہیں ہو سکتی۔ ہاں البتہ اُس کی وحشت دور کرنے کی راہ میں ایک درجہ میں باعث اطمینان ہو سکتی ہے۔ شریعت نے اگرچہ کم سے کم مہر کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے مگر زیادہ کی حد بھی مقرر نہیں کی ہے اور اس میں حکمت عملی یہ معلوم ہوتی ہے کہ مہر مرد کی مالی و اقتصادی حالت کے مطابق ہو۔ اگر کوئی صاحب تیسیر اپنی منکوحہ کو ہزاروں بلکہ لاکھوں روپئے بھی دیدے تو وہ جائز ہوگا۔ کیونکہ قرآن مجید میں ایک ڈھیر سا مال دینے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ (نسار: ۲۰)

عورت پر بعض صورتوں میں بُرا وقت بھی آسکتا ہے۔ مطلقہ یا بیوہ ہونے کی صورت میں تو اسے نئے سرے سے زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ اور ہندوستان جیسے ملکوں میں ایک بیوہ یا مطلقہ (طلاق شدہ) عورت کی دوبارہ شادی ایک مشکل مسئلہ ہے۔ لہذا عورت کے مستقبل کے پیش نظر اس کا کچھ نہ کچھ تحفظ تو ہونا ہی چاہیئے۔ اس مقصد کے پیش نظر اگر وہ اپنے مہر کے پیسوں کا استعمال عقلمندی سے کرتے ہوئے اگر کچھ جائداد وغیرہ خرید کر چھوڑ دے تو وہ ایک حد تک دوسروں کی دست نگر بنے بغیر اپنی کفالت آپ کر سکتی ہے۔

جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے صحیح اسلامی قانون کے مطابق عورت کا مہر (پورا یا اس کا کچھ حصہ) پیشگی (معجّل) ادا کرنا ضروری ہے۔ بیوی کے منافع نقد اور مہر ادھار قرار دینا یا اس میں ٹال مٹول کرنا اسلامی اُصولوں کے خلاف ہے۔ بلکہ بعض حدیثوں کے مطابق اگر کوئی مہر نہ دینے کی نیت کرتے ہوئے نکاح کرتا ہے تو وہ زانی ہے۔ مہر عورت کا شرعی حق ہے جسے دبا کر بیٹھنا کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔ اسلامی شریعت نے عورت کو جو حقوق عطا کئے ہیں وہ حد درجہ معقول اور متوازن ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو اس بارے میں احکام الٰہی کا اتباع کرنا چاہیئے۔

مہر کی فرضیت:

مہر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اسے بعض جگہ "فریضہ" یعنی ایک فرض (ایک مقرر شدہ) چیز قرار دیتے ہوئے اسے ادا کرنے کی تاکید کی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً : جن عورتوں سے تم لطف اندوز ہو چکے ہو ان کے مقررشدہ معاوضے تم دے دو۔ (نساء : ۲۴)

پھر چونکہ اس آیت کریمہ میں مہر کو اجر یا معاوضہ قرار دیا گیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ بھی ہوا کہ نکاح کا معاہدہ "ایک اجرت" کے عوض میں وجود میں آتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے "حق بُضع" بھی کہا گیا ہے۔ یعنی عورت کی شرمگاہ کو حلال کئے جانے کا حق۔ اور اسی وجہ سے منکوحہ عورت کے "بائنہ" ہو جانے کے بعد شریعت نے نیا مہر ضروری قرار دیا ہے۔

واضح رہے قرآن مجید میں لفظ "اُجور" (اجر کی جمع) چھ جگہ آیا ہے۔ اور ان میں سے پانچ جگہوں پر وہ مہر کے معنی میں آیا ہے۔ اور صرف ایک جگہ دودھ پلائی کی اُجرت کے طور پر (طلاق: ۶) اس سے مہر کی تاکید اور اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً :

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ : اور تم ان عورتوں کے بندھے ہوئے مہر انہیں معروف طریقے سے دے دو۔ (نساء : ۲۵)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ : اور تم پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم (دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرکے آئی ہوئی) ان عورتوں سے نکاح کر لو جب کہ تم انہیں ان کے مہر دے دو۔ (ممتحنہ : ۱۰)

نیز قرآن مجید میں عورتوں کے مہر کو "صَدُقَات" بھی کہا گیا ہے۔ اور تاکید ہے کہ اس چیز کو پوری خوش دلی کے ساتھ ادا کیا جائے۔

وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً : اور تم اپنی عورتوں کے مہر انہیں خوشی سے دیدیا کرو (النساء : ۴)

اسلامی شریعت میں مہر کی اہمیت اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر صاف صاف فرمایا ہے کہ نکاح کا حصول مال کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ : اور ان (محرّمات) کے سوا بقیہ تمام عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں بشرطیکہ تم اپنے مال کے بدلے میں انہیں طلب کرو۔ (نساء : ۲۴)

اور حدیث نبوی کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مہر نکاح صحیح اور نکاح فاسد دونوں صورتوں میں واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ "حق بضع" ہونے کیوجہ سے فرج کو حلال قرار دیئے جانے کا معاوضہ ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما استحل به فرج المرأۃ من مہر او عدۃ فهو لها:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس مہر یا تحفہ کے ذریعہ عورت کی فرج حلال کی گئی تو وہ اسی کا حق ہے۔[93]

فان دخل بها فلها المهر بما استحل من فرجها: (نکاح فاسد میں) مرد اگر عورت سے صحبت کرلے تو عورت کو اس کی فرج حلال کیے جانے کی وجہ سے مہر ملے گا۔[94]

فان اصابها فلها المهر بما استحل من فرجها: اگر مرد نے صحبت کرلی ہے تو اسے مہر دینا پڑے گا، عورت کی فرج حلال کرنے کیوجہ سے۔[95]

من کشف امرأۃ فنظر الی عورتها فقد وجب الصداق: جس نے منکوحہ عورت کا کپڑا کھولا اور اس کی پوشیدہ چیز کی طرف نظر ڈالی تو مہر واجب ہوگیا۔[96]

یہ ہے اسلامی شریعت میں مہر کی اہمیت اور اس کے ادا کرنے کی تاکید۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان موجودہ دور میں اس فرض چیز کو ادا نہیں کرتے۔ بلکہ اس کی ادائیگی سے غفلت برتتے ہوئے نکاح کے موقع پر فضول چیزوں اور خرافات میں ہزاروں لاکھوں روپئے برباد کر دیتے ہیں۔ مگر جو چیز شریعت کی نظر میں انتہائی اہم ہے اس کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اس طرح جو چیزیں غیر اہم ہی نہیں بلکہ بدعات و خرافات سے تعلق رکھتی ہیں

---

[93] مسند احمد ۶/۱۲۲، الفتح الربانی ۱۶/۱۷۷، بیہقی منقول از کنز ۱۶/۳۲۵۔

[94] ترمذی کتاب النکاح: ۳/۴۰۸، دار احیاء التراث العربی۔

[95] سنن دارمی کتاب النکاح: ۲/۱۳۷۔

[96] بیہقی، کنز ۱۶/۳۲۳۔

انہیں فرائض و واجبات کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم خدا کی رحمتوں کے طالب رہتے ہیں اور مصائب کے وقت خدا سے شکوہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عجیب سی بات ہے۔

شریعت نے مہر کی مقدار متعین نہیں کی:

اوپر سورہ نساء کی جو آیت (۲۴) پیش کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر میں ایسی کوئی چیز دی جانی چاہیئے جو "مال" کہلا سکتی ہو۔ چاہے وہ نقد روپیہ ہو، یا سونا چاندی، یا کوئی دوسری چیز۔ مگر اس کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مقدار کیا ہو؟ اس کی تصریح شریعت نے نہیں کی۔ بلکہ اس کے بارے میں مختلف حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ مہر لوہے کی ایک انگوٹھی کے عوض بھی ہو سکتا ہے، دو جوتیوں کے عوض بھی، مٹھی بھر کھانے کے عوض بھی ہو سکتا ہے اور تعلیم قرآن کے عوض بھی۔ مگر فقہ حنفی کی رُو سے مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے۔ (موجودہ دور کے حساب سے تقریباً دو یا سوا دو سو روپئے) اگر کسی نے اس سے کم مقدار پر نکاح کیا تو اسے دس درہم دینے پڑیں گے۔[۹۷]

طرفین کی رضامندی کے ساتھ کوئی بھی مہر صحیح ہوگا:

دورِ رسالت میں ایک خاتون بطور مہر صرف دو جوتیوں پر راضی ہو جاتی ہیں:

اِنَّ امْرَاَۃً مِنْ بَنِیْ فَزَارَۃَ تَزَوَّجَتْ عَلٰی نَعْلَیْنِ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَرَضِیْتِ مِنْ نَفْسِکِ وَمَالِکِ بِنَعْلَیْنِ؟ قَالَتْ نَعَمْ۔ قَالَ فَاَجَازَہٗ:

بنی فزارہ کی ایک عورت نے دو جوتیوں کے عوض نکاح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا کہ کیا تو ان دو جوتیوں سے راضی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ تو آپ نے اسے جائز قرار دیا۔[۹۸]

---

۹۷ مگر دس درہم والی حدیثیں ضعیف ہیں۔

۹۸ ترمذی ۲/۲۰۴، ابن ماجہ ۱/۶۰۸، سنن کبری ۷/۲۳۹۔

بقول امام ترمذیؒ اس حدیث کی بنا پر بعض اہل علم کا رجحان یہ ہے کہ وہ مہر (صحیح ہے) جس پر طرفین راضی ہو جائیں[99] (چاہے وہ کم ہو یا زیادہ)۔ چنانچہ اس سلسلے میں بعض ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن کے ملاحظہ سے یہ اصول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے مہر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

عُلَمَا اَصْطَلَحَ عَلَیْہِ اَھْلُوْھُمْ: مہر وہ ہوگا جس پر عورت کے لوگ راضی ہو جائیں[100]۔ نیز اس سلسلے میں آپ کے مزید ارشادات اس طرح ہیں:

لَیْسَ عَلَی الرَّجُلِ جُنَاحٌ اَنْ یَّتَزَوَّجَ بِقَلِیْلٍ اَوْ کَثِیْرٍ مِنْ مَالِہِ، اِذَا تَرَاضَوْا وَاَشْھَدُوْا؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ کم یا زیادہ مال پر نکاح کرے، جبکہ (طرفین) راضی ہوں اور اس پر گواہ بنالیں[101]۔

لَیْسَ عَلَی الْمَرْءِ جُنَاحٌ اَنْ یَّتَزَوَّجَ مِنْ مَالِہِ بِقَلِیْلٍ اَوْ کَثِیْرٍ اِذَا اَشْھَدَ؛ کسی شخص پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ تھوڑے یا بہت مال پر نکاح کرے، جبکہ وہ گواہ بنالے[102]۔

کم سے کم مہر کی مقدار!

جیسا کہ عرض کیا گیا کم سے کم مہر کی مقدار متعین نہیں ہے۔ بلکہ مہر تعلیم قرآن کے عوض بھی ہو سکتا ہے اور ایک مٹھی بھر جو یا کھجور وغیرہ کے عوض بھی۔ تو یہ بات دراصل کسی شخص کی مجبوری پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ اتنی حقیر اور معمولی سی چیز کو مہر قرار دینے لگ جائیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی نیک اور اچھی عادت و اطوار کا شخص موجود ہے مگر وہ بیحد غریب ہے تو ایسے موقعوں پر اگر عورت کے سرپرست راضی ہوں تو اتنی حقیر سی چیز پر بھی نکاح صحیح ہو جائے گا۔ حدیثوں کے مطالعہ سے یہی بات زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد

---

[99] ترمذی ۳/ ۴۲۱۔

[100، 101] سنن کبریٰ از امام بیہقی: ۷/ ۲۳۹، مطبوعہ ملتان (پاکستان)

[102] سنن دارقطنی: ۳/ ۲۴۴، مطبوعہ قاہرہ۔

رہے کہ اس قسم کے احکام کے ذریعہ مہر کی قدر و قیمت گھٹائی نہیں گئی بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اہمیت بڑھائی گئی ہے۔ چنانچہ اس حکم کے ذریعہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ بغیر مہر کے نکاح نہیں ہو سکتا، خواہ وہ چیز کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اور پھر اس کے ذریعہ یہ تاکید بھی نکلتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مہر پیشگی ادا کرنا چاہیئے۔ اور جو کچھ اپنے پاس موجود ہو وہ فوری طور پر دے دینا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ لمبا چوڑا مہر تو باندھ لیا مگر دینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بلکہ اسے عمر بھر ٹالتے رہے۔ اور مرتے وقت یا تو بخشوا لیا یا ہو رد کے قرضدار ہو کر مر گئے۔ یہ اسلامی شریعت کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے۔ اور قیامت کے دن اللہ بندوں کے حقوق کو معاف نہیں کرے گا۔ لہذا اگر کوئی شخص دنیا میں کسی کا حق مارتا ہے تو پھر قیامت کے دن اسے چکانا پڑے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کا نکاح ایک عورت سے کرنا چاہا مگر اس صحابی کے پاس مہر میں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

تَزَوَّجْ وَلَوْ بِخَاتَمٍ مِّنْ حَدِيْدٍ: نکاح کرو اگرچہ لوہے کی ایک انگوٹھی کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔[۱۰۳]

اِلْتَمِسْ وَلَوْ خَاتَمًا مِّنْ حَدِيْدٍ: کوئی چیز تلاش کرو اگرچہ وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔[۱۰۴]

مَنْ اَعْطٰى فِيْ صَدَاقِ امْرَاَةٍ مِّلْءَ كَفَّيْهِ سَوِيْقًا اَوْ تَمْرًا فَقَدِ اسْتَحَلَّ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی عورت کے مہر میں دو کف ستو یا کھجور (وغیرہ) دے دیئے تو اس نے اس عورت کو حلال کر لیا۔[۱۰۵]

---

[۱۰۳] بخاری ۶/۱۳۸

[۱۰۴] بخاری ۶/۱۳۵، ابوداؤد ۲/۵۸۶، ترمذی ۳/۴۲۲، نسائی ۶/۱۲۳، موطا ۲/۵۲۶
مسند احمد ۵/۳۳۶، الفتح الربانی ۱۶/۱۷۱، سنن کبریٰ ۷/۲۳۶۔

[۱۰۵] ابوداؤد کتاب النکاح ۲/۵۸۵، سنن کبریٰ ۷/۲۳۸، سنن دارقطنی ۳/۲۴۳
بلوغ المرام ص ۲۱۶، نیل الاوطار ۶/۳۰۹۔

عن انس ان عبد الرحمان بن عوف تزوج امراۃ علی نواۃ من ذھب :
حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک عورت سے ایک گٹھلی بھر سونے کے عوض نکاح کیا۔ [۱۰۶]

گٹھلی بھر سونے سے مراد پانچ درہم ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن اثیرؒ اس کی تحقیق میں تحریر کرتے ہیں:
النواۃ : اسم لخمسۃ دراھم کما قیل للاربعین اوقیۃ، وللعشرین نش : نوات پانچ درہم کو کہتے ہیں، جس طرح چالیس درہم کو ایک اوقیہ اور بیس درہم کو نش کہا جاتا ہے۔ [۱۰۷]

قال علیؓ : لا یکون مھراً اقل من عشرۃ دراھم : حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مہر دس درہم سے کم نہیں ہو سکتا۔ [۱۰۸]

مہر میں آسانی کی تاکید :

جہاں تک ہو سکے مہر آسان ہونا چاہیئے تاکہ اس کی ادائیگی میں سہولت رہے کیونکہ وہ مؤجل (تاخیر سے ادا کیئے جانے والا) ہونے کی صورت میں شوہر کے ذمہ ایک قرض ہوتا ہے۔ لہذا شوہر کی حیثیت اور اس کی طاقت سے بڑھ کر مہر باندھنا صحیح نہیں ہے۔ اور بعض لوگ تو اس میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ مہر ادا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اور اس سے لڑکی والوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلاق کی کبھی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ اور اگر آئے بھی تو شوہر مشکل میں پڑ جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات مہر کے مقصد اور اس کے فلسفہ کے خلاف ہے۔ جیسا کہ تفصیل گذر چکی ہے مہر عورت سے

---

۱۰۶ یہ حدیث صحاح ستہ میں مختلف طرق سے مروی ہے۔ بخاری ۶ / ۱۳۸

۱۰۷ النھایہ فی غریب الحدیث، از ابن اثیرؒ ۵ / ۱۳۱، مطبوعہ المکتبۃ الاسلامیۃ : نیز ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ۲۰ / ۱۳۸، نیل الاوطار ۶ / ۳۱۰۔

۱۰۸ سنن دار قطنی ۳ / ۲۴۵، سنن کبریٰ ۷ / ۲۴۰، اس سلسلے میں علامہ عینیؒ نے تصریح کی ہے کہ دس درہم والی حدیثیں اگرچہ ضعیف ہیں مگر چونکہ وہ کئی طرق سے مروی ہیں اس لیئے "درجہ حسن" میں شمار ہو سکتی ہیں۔ دیکھئے عمدۃ القاری : ۲۰ / ۱۳۸، مطبوعہ پاکستان۔

متمتع ہونے کا ایک صلہ اور معاوضہ ہے جسے شریعت نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا اسے بیوی کو شوہر کے گلے باندھنے کے لئے بطور ایک ہتھیار استعمال کرنا مہر کی حقیقت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

خَيْرُ الصَّدَاقِ أَيْسَرُهُ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین مہر وہ ہے جو آسان ہو۔[۱۰۹]

مِنْ يُمْنِ الْمَرْأَةِ أَنْ يَتَيَسَّرَ فِي خِطْبَتِهَا، وَأَنْ يَتَيَسَّرَ فِي صَدَاقِهَا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کی سعادت کی بات یہ ہے کہ اُسے نکاح کا پیغام دیا جانا آسان ہو اور اس کا مہر آسان ہو۔[۱۱۰]

أَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ صَدَاقًا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برکت کے اعتبار سے عظیم ترین عورتیں وہ ہیں جو مہر کے اعتبار سے آسان ہوں۔[۱۱۱]

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مہر میں مبالغہ کرنے سے بسا اوقات شوہر کو بیوی سے ایک طرح کی عداوت و نفرت پیدا ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث کے مطابق اس بارے میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:

إِنَّ الرَّجُلَ لَيُغَالِي بِصَدُقَةِ امْرَأَتِهِ حَتَّى يَكُونَ لَهَا عَدَاوَةٌ فِي نَفْسِهِ وَحَتَّى يَقُولَ كُلِّفْتُ لَكُمْ عِرْقَ الْقِرْبَةِ:

کوئی شخص اپنی عورت کا بہت زیادہ مہر باندھ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ (اسے ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے) اسے اپنی بیوی سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس سے کہنے لگتا ہے کہ میں تمہاری وجہ سے مشقت میں پڑ گیا۔[۱۱۲]

---

۱۰۹ سنن کبریٰ ۷/۲۳۲، مستدرک حاکم ۲/۱۸۲، ابوداؤد ۲/۵۹۱، بلوغ المرام۔

۱۱۰ صحیح ابن حبان ۷/۱۵۸، سنن کبریٰ ۷/۲۳۵، حاکم و نسائی منقول از کنز ۱۶/۴۸۴، ورواه الطبرانی فی الصغیر والاوسط: مجمع الزوائد ۴/۲۸۱۔

۱۱۱ مستدرک حاکم: ۲/۱۷۸، السنن کبریٰ: ۷/۲۳۵۔

۱۱۲ نسائی ۶/۱۱۸، ابن ماجہ ۱/۶۰۷، مستدرک ۲/۱۷۵، سنن سعید بن منصور ۱/۱۵۲، دارمی ۲/۱۴۱، سنن کبریٰ ۷/۲۳۴، مصنف عبدالرزاق ۶/۱۷۵۔

مہر میں مبالغہ نہ کرنے کی تاکید!

دورِ رسالت میں لوگ غالباً اپنے مہر کا مطالبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے جیسا کہ بعض حدیثوں سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق ایک صحابی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ میں نے نکاح کر لیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے ہیں کہ کتنے مہر پر؟ وہ کہتے ہیں کہ چار اُوقیہ (ایک سو ساٹھ درہم) پر اس پر آپ فرماتے ہیں۔

علی اربعة اواق! كانما تنحتون الفضة من عرض هذا الجبل. ما عندنا ما نعطيك: چار اوقیے! گویا کہ تم چاندی اس پہاڑ سے چھیل کر لاتے ہو۔ ہمارے پاس اتنا نہیں ہے جو تمہیں دے سکیں۔[113]

امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب شوہر کی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے زیادہ مہر باندھنے کی کراہت ہے۔[114]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی ملکیت میں فی الحال جو چیز موجود ہو اسی کے مطابق مہر باندھنا چاہیئے۔ اور غیر مملوکہ چیزوں پر نکاح کرنا ناپسندیدہ ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک دوسرے صحابی (ابو حدرد اسلمیؓ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر مہر کے بارے میں استعانت طلب کرتے ہیں اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دریافت کرتے ہیں کہ تم نے کتنا مہر باندھا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ دو سو درہم۔ اس پر آپ فرماتے ہیں:

لو كنتم تغرفون من بطحان ما زدتم: اگر تم وادی بطحان (مدینے کی ایک وادی) کو کاٹ رہے ہوتے تو اتنا مہر نہ باندھتے۔[115] یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طنز یہ طور پر فرمائی۔ مطلب یہ کہ اپنی وسعت و طاقت سے زیادہ مہر باندھنا ناپسندیدہ ہے۔ (باقی آئندہ)

113۔ صحیح مسلم کتاب النکاح: ۲/۱۰۴۰، سنن کبریٰ ۷/۲۳۵، ورواہ البزار: مجمع الزوائد ۴/۲۸۱۔

114۔ شرح صحیح مسلم: ۹/۲۱۱

115۔ مستدرک ۲/۱۷۸، السنن کبریٰ ۷/۲۳۵، ورواہ احمد والطبرانی فی الکبیر والاوسط ورجال احمد رجال الصحیح: مجمع الزوائد ۴/۲۸۲۔

مولانا فیض الحسن سہارن پوری۔ ایک مطالعہ

عبدالحق حقانی القاسمی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

باوج پایہ اشس من خود ندیدم در جہاں کس را
وزیں پس مثل او ہرگز نہ بیند چشم افتہ ام
علامہ شبلی نعمانی

مولانا فیض الحسن سہارن پوری عربی کے ممتاز ادیب ہیں۔ انھوں نے طلبا میں عربی ادب کا صحیح ذوق و شعور پیدا کیا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن کے متعدد پہلوؤں پر مولوی سعید اقبال قریشی نے لاہور یونیورسٹی سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔

۱۔ سوانحی کوائف :

مولانا فیض الحسن نے سہارن پور کے ایک زمین دار گھرانے میں ۱۸۱۶ء میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد ماجد خلیفہ علی بخش زبردست عالم فاضل تھے۔ ان سے ہی ابتدا سے مختصرات تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر رامپور کا علمی سفر کیا جہاں معقولات کے امام علامہ فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ) سے اکتساب فیض کیا۔ اسی دوران ۲۰ سال کی عمر میں شادی ہو گئی مگر حصول علم کا شوق دل میں موجزن تھا اس لئے دلّی کی راہ لی اور مشہور زمانہ عالم مفتی صدر الدین آزردہ (م ۱۸۶۸ء) کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے یہیں شاہ احمد سعید مجددی (م ۱۲۷۷ھ) اور آنون صاحب ولایتی سے بھی استفادہ کیا اور حدیث کے کچھ اسباق پڑھے۔ ادب سے دلچسپی کی وجہ سے حکیم مومن خاں مومن (م ۱۸۵۲ء) اسد اللہ خاں غالب (م ۱۸۶۹ء) اور ابراہیم ذوق (م ۱۸۵۴ء) کی محفلوں میں بھی شرکت کرتے رہے اور شعر و سخن کے سلسلے میں امام بخش صہبائی (م ۱۸۵۷ء) سے مشورۂ سخن لینے لگے۔

دلی ہی میں حکیم امام الدین خاں سے طب کا علم بھی حاصل کیا۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں تک دلی ہی میں تدریسی خدمات انجام دیں مگر ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی سہارن پور آگئے اور طب کو ہی ذریعہ معاش بنایا۔ ۱۸۶۱ء میں مولوی سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) نے سائنٹفک سوسائٹی میں ترجمہ کی خدمت کے لئے غازی پور آنے کی دعوت دی۔ مولانا نے وہاں یہ کام بخوبی انجام دیا اور پھر سر سید احمد خاں کے علی گڑھ تبادلے کی وجہ سے ان کے ساتھ مولانا بھی علی گڑھ آگئے اور عربی کتابوں کے ترجمے کرتے رہے۔

۱۸۷۰ء کے اوائل میں ڈاکٹر لائٹنر (۱۸۳۲ء۔۱۸۹۹ء) کے ایما پر اورینٹل کالج لاہور آگئے جہاں عربی کے صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ ان کی ادبی اور علمی شہرت کی وجہ سے ملک کے کونے کونے سے استفادہ کی خاطر طلبا آنے لگے۔ درس و تدریس کے علاوہ یہاں تصنیفی سرگرمیاں بھی رہیں اس کے ساتھ کالج سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی مجلہ "شفاء الصدور" کی ترتیب و ادارت کا فرض بھی انجام دینے لگے اس زمانے میں کالج میں مشہور ادیب اور انشا پرداز "آب حیات" کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد بھی تھے جن سے انتظامی اختلافات کی وجہ سے ہمیشہ چپقلش جاری رہتی تھی۔ مولانا ۱۷ برس تک اس کالج سے وابستہ رہے آخر ۶ فروری ۱۸۸۷ء میں انتقال فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد مولوی رشید احمد جو کہ مولانا کے صاحبزادے تھے عربی اور فارسی کی تعلیم دینے لگے۔[1]

۲- مولانا کی کائنات شعر و ادب :

مولانا مختلف زبانوں کے شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں انہوں نے شعر کہے ہیں اور اس میدان میں اپنی ایک نمایاں اور مستحکم حیثیت بھی بنائی ہے اردو میں ان کا تخلص دیاؔل تھا۔ امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ اس زبان میں بہت سے شعر کہے ہیں۔ ان کا اردو شعری مجموعہ "گلزار فیض" کے نام سے مولوی رشید احمد نے شائع کر دیا ہے۔ لالہ سری رام نے اپنے مشہور تذکرے "خمخانہ جاوید" میں ان کی ادبی عظمت کے اعتراف کے ساتھ اردو کے کچھ شعر درج کئے ہیں :

"فیض الحسن دیاؔل سہارنپور کے باشندے، بڑے جید استاد اور فاضل دہر مانے جاتے ہیں۔

اورینٹل کالج لاہور میں پندرہ بیس برس تک علوم مشرقی کے پروفیسر رہے اور صد ہا شاگرد وں نے آپ سے فیض پایا۔ پروفیسر آزاد کے ہم عصر تھے۔ سنا ہے کہ خود مولانا مرحوم حضرت صہبائی کے نامور تلمیذ تھے۔ چند شعر بڑی کوشش سے ہاتھ آئے جو بطور یادگار درج تذکرہ کئے گئے۔ مولانا شبلی کو بھی مرحوم سے تلمذ تھا۔

اس جفا پر بھی کی وفا ہم نے
کیا کیا تم نے کیا کیا ہم نے

کرتے ہیں سہرستہ دامان فراق
خوب سوجھی ہے یہ دوا ہم نے

چھیڑ کر ان کو بزم دشمن میں
جو نہ سننا تھا وہ سنا ہم نے

کہتے ہیں جور بھی غنیمت ہے
جب کیا شکوہ جفا ہم نے

رونے میں نہ تھا جو تری آنکھوں کا تصور
آئے گل نرگس مرے دامن میں کہاں سے

کس نے لیا اس چاند سے رخسار کا بوسہ
یہ داغ لگا یار رخ روشن میں کہاں سے

اڑتی تھی ابھی خاک گلستاں میں خدایا
اک بار یہ پھول اگے گلشن میں کہاں سے[۲]

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اچھی شاعری کی ہے، نواب صدیق حسن خاں (م ۱۸۸۹ء) نے "شمع انجمن" میں منتخب شعری نمونے درج کیے ہیں ویسے فارسی کلام کا مجموعہ "نسیم فیض" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فارسی کے کچھ شعر دیکھئے:

زاہد بریں منازکہ دنیا گذاشتم ۔۔۔ ایں ہمت من ست کہ عقبیٰ گذاشتم
چوں پای خود بدامن راحت نمی کشتم ۔۔۔ آسودگی بنقش کف پا گذاشتم

شرم آمدم کہ شکوہ درد جگر کنم ‏ ‏ دست طبیب و پای مسیحا گذاشتم
این است فیض صحبت پیر مغاں کہ باز ‏ ‏ زہد و صلاح و توبہ و تقوٰی گذاشتم[۲]

ان دونوں زبانوں میں انہوں نے تفنن طبع کی خاطر شاعری کی ہے اور بنیادی طور پر عربی شعر و ادب سے ہی حقیقی شغف رہا ہے۔ ہندوستان میں عربی کے چند جو اہم صاحب دیوان شعراء گزرے ہیں ان میں ایک اہم نام فیض الحسن کا بھی ہے ان کا عربی دیوان "دیوان الفیض" حیدر آباد سے شائع ہوا ہے جس میں ایک ہزار پانچ سو انچاس (۱۵۴۹) اشعار ہیں۔

عربی کے مختلف اصناف سخن میں انہوں نے شعر کہے ہیں۔ ان کے دیوان میں مدح، مرثیہ اور غزل کے بہترین عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنے بزرگوں اور محسنوں کے مدحیہ قصیدے لکھے ہیں۔ ان خوش نصیب بزرگوں میں نواب کلب علی خاں (م ۱۳۰۴ھ) نواب محمد صدیق خاں علوی (م ۱۸۸۹ء) بھی شامل ہیں۔

نواب کلب علی خاں کی مدح میں کہے گئے چند شعر دیکھئے؛

سمعت صباح الیوم صوناس الکبری ‏ ‏ فهاج من التغريد مالم اكن ادرى
فنمت على فوری و غـردت مطربا ‏ ‏ بكلب عليخان الكريم عـلى قدرى
فتى جده فوق الجـد وو وجده ‏ ‏ يعد مجدا فهو عيـن الغى البدر
فد ور لـه مرفوعـة وهولـ يرى ‏ ‏ جفان لـه مرضوعـة وهولـ يدرى
ابوالفيف يقـرى كل من ضيافه بـان ‏ ‏ يحكمـه فى المرق واللحـم والقـدر[۴]

ان کے علاوہ دوسری ہستی نواب محمد صدیق خاں کی ہے جن کی علمی اور ادبی حیثیت سے مولانا بہت متأثر تھے۔ ان کی شان میں کہے گئے یہ شعر؛

آآل على ابشروا ثـم ابشـروا ‏ ‏ بـان فتى منكم كـريـم و خيبـر
جواد كـريـم ارسلت قبـل عارض ‏ ‏ سری فغدا يد نومن الارض يمطـر
كـريم لـه عـزو فضـل وسودد ‏ ‏ دعـرق بـه يعلو و مجـد ومفخر
لـه ذكـر خيـر فى النوادى وخيـره ‏ ‏ كثير ولـ ينفك يـمنو ويكثـر
ترى كل صندید سوار و حولـه ‏ ‏ قيان ويجريـه مغـن ومـزهـر[۵]

اس کی واضح مثال ہیں :

مولانا نے مرثیے بھی بہت سے لوگوں کے کہے ہیں۔ جن میں کچھ بزرگ، کچھ اپنے دوست اور عزیز بھی شامل ہیں۔ بزرگوں میں فضل حق خیرآبادی اور احمد علی سہارنپوری (م ۱۲۹۷ء) دوستوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ء) مولوی احمد حسن مرادآبادی (م ۱۳۰۳ھ) اور مولوی سلطان حسن اور عزیزوں میں اپنے چھوٹے بیٹے کی وفات پر مرثیے کہے ہیں۔

فضل حق خیرآبادی کی وفات حسرت آیات پر بہت ہی دردانگیز اور پرسوز مرثیہ لکھا ہے اور ان کی علمی اور شخصی عظمت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے :

لقد مات مولانا الذی لا یماثله ۔۔۔ اغر کریم النفس جم فواضله
فواضله جم و غر کانها ۔۔۔ نجوم علی ان تزانهن فضائله
لقد کان ذا فضل و علم و حکمة ۔۔۔ له حجج عز و منها رسائله
لقد کان فیمن کان راسا و هامة ۔۔۔ و ماذاك قولا باطلا انا قائله
لقد کان نحریرا جلیلا و مقتنا ۔۔۔ لما دق من علم خفی مسائله
لقد کان بحرا لو جمعنا صفاته ۔۔۔ لکان کتابا تم کنا ند واله ۲

مولانا احمد علی سہارنپوری جیسے عظیم محدث کی وفات پر مندرجہ ذیل دردناک شعر کہے ہیں :

دهانی بغتة امر مریم ۔۔۔ فهام به فواد لا یهیم
فلما ان تحقق ان توفی ۔۔۔ الهمام همامه احتاج الاحیم
ایا من کان یجدی الناس نفعا ۔۔۔ درجت ولم یفر بك الدروج ۳

اپنے رفیق خاص قاسم نانوتوی کی وفات سے انہیں جو گہرا صدمہ پہونچا اس کا اظہار ان شعروں سے ہوتا ہے :

نعی ناعیا عن الکریم فاسمعا ۔۔۔ نعیا یدق المحل همته فصدعا
جوادا جلیلا ورمته بجندل ۔۔۔ یدا حارث لم تلفه متمدعا
سمعنا فعندنا اذ سمعنا نعیه ۔۔۔ کمثل رماح لا تراهن مشرعا

... ولم اسمع نداء اولا صدی — وهل یسمعن من کان مثلی مفجعا
وکان شعی دهرا انفرق بینها — فصرنا کانا لم نبت لیلة معا
... باسقا انی القول والفعل صادقا — اعز کریم النفس ندیا سمیدعا ...

مدح و مرثیہ کے علاوہ مولانا نے شب و روز کی کہانی اور زندگی کے اہم ترین واقعات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ دل پہ جو بھی گزرتی ہے اسے رقم کیا ہے۔ بچپن کوائف اور جوانی کے دنوں کی یادوں کو کس خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے:

کان ... وکنت صغیرا بالغا — وشربته عذبا فراتا سائغا
عهدی به ... مربعا ممرعا — ورعیته روضا خضبا ... فصنا
الم تر ان الجمال عاد و رائع — وان الغنی مما تطیح الطوائح
ان الفتی من بعد ما فاته الغنی — یعود کغصن حفیقته البوارح
ولکن اصابتنی مرارا کثیرا — مصائب حتی استا صلتنی الجوائح ۹

مولانا نے ایک شہر کی ہجو بھی کی ہے جہاں وہ بہت دنوں تک مقیم رہے تھے۔ درج ذیل شعروں سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

نقد حللت علی بالی ببلبالی — ببلدة ما بها عمی ولا فالی
ببلدة لا تری فیها فتی کملت — جیرانه وجلیسانا عم البال
ببلدة قد خلت عن کل مکرمة — وهل سمعتم بمصر فارغ خال
ببلدة ما بها جهد و ماثرة — وما بها کریم النفس مفضال
اکبرهم الدنیا ومبلغهم — من الوسائل ما کانت الی المال
ما کنت فیهم بمقذور ولا قذر — ولا لدیهم بمقلی ولا قال
لو کنت فظا غلیظا جافیا جلفا — لکنت فیهم طریدا من العال
وما لکان هذی الارض قاسیة — قلوبهم کجلامید الاجبال
لانت صخور وما لانت قلوبهم — فلم یزل وزلت هم ادعال ۱۰

مولانا کی عربی شاعری کے بارے میں کوئی رائے دینے سے پہلے ہندوستان میں عربی شاعری

کا ایک عمومی جائزہ لینا زیادہ بہتر ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) کی یہ رائے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ:

"مسعود بن سعد بن سلمان لاہوری، قاضی عبدالمقتدر شریحی، احمد تھانیسری، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید طفیل محمد بلگرامی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، آزاد بلگرامی، فضل حق خیرآبادی اور فیض الحسن سہارنپوری جیسے فضلاء عربیت کے اساطین کہے جاسکتے ہیں حالانکہ ان کی تربیت و پرداخت عربیت کی فضا سے مختلف ماحول میں ہوئی اور ان کا وطن سرزمین عرب سے بہت دور ہے۔ کوئی بھی نقادان کے عربی کلام پر نقد و تبصرہ کر کے کچھ خامیاں ظاہر کرسکتا ہے جس کا ہمیں مطلق افسوس نہیں کیونکہ ہندوستان میں مختلف قوموں کے ربط و ضبط اور عربی ماحول سے بیگانگی وغیرہ ایسے صریح اسباب و علل ہیں جن کے پیش نظر یہ نتیجہ آسانی کے ساتھ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں عربی زبان کو بلند مقام اور ادبی فنون کو خاطر خواہ فروغ حاصل نہیں ہوا اس لیے ان حالات میں عربی شاعری کی حیثیت کا بلند نہ ہونا کلام کا صنائع و بدائع سے ایک حد تک خالی ہونا اور اہل ہند کی عربی شاعری کا منظوم موزون اور مقفی ہونا خصوصیت ہے۔ اور بس"۔[۱۱]

اسی سے ملتی جلتی رائے ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی بھی ہے: "اس میں شک نہیں ہے کہ فطری شاعر جس خوبی سلاست اور روانی کے ساتھ اپنی مادری زبان میں شعر کہہ سکتا ہے اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ ایک اجنبی اور خاص کر عربی جیسی قدیم زبان میں اس طرح شعر کہے جس طرح اہل زبان کہتے ہیں، درست نہ ہوگا۔ شاعر جس ماحول میں پلتا ہے اور جس زبان کے الفاظ سے اس کے کان عہد طفولیت سے آشنا ہوتے ہیں ان میں جذبات و خیالات کا اظہار ایک طبعی امر ہے ایک اجنبی زبان میں جس کا ماحول، بندش اور ترکیب مختلف ہوتی ہے انہی خیالات و جذبات کا ظاہر کرنا اکتسابی اور مشکل ہے اس پر بھی ہندوستان کے شعراء نے جو قادر الکلامی دکھائی ہے وہ اہل زبان سے بھی خراج تحسین حاصل کرچکی ہے۔"[۱۲]

یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر کا معاملہ نثر سے بہت مختلف ہے۔ عربی کے نثری ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان میں سید مرتضیٰ بلگرامی (م ۱۷۹۱ء) مصنف تاج العروس شرح قاموس رضی الدین حسن صغانی (م ۱۲۵۲ء) مصنف "العباب الزاخر"، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی صاحب "کشاف

اصطلاحات الفنون" جیسے جید علماء اور ادبا مل جائیں گے جن کی تحریر میں عرب نژاد ادبا کے لئے بھی مشعل راہ ہیں۔ مگر "شعر چیزے دیگر است" اس لئے یہاں کے عربی کلام میں حد درجہ عجمی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر زبیر احمد: "یہاں کے بہترین شعراء بھی صرف عمدہ فن کار تھے جو حسین الفاظ سے کھیلنے کے سوا کچھ اور نہ کرسکے۔"[۳۱]

ویسے ہندوستان میں عربی کے بہترین شاعروں میں مسعود بن سعد سلمان، امیر خسرو، نصیر الدین چراغ دہلوی، قاضی عبد المقتدر شریحی، احمد تھانیسری، شاہ احمد شریفی، محمد بن عبد العزیز مالاباری سید علی خاں ابن معصوم، سید عبد الجلیل بلگرامی اور علامہ آزاد بلگرامی صاحب مرآۃ الجمال کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ مولانا کی شاعری کے مطالعہ کے بعد مجموعی طور پر یہ تاثر ذہن میں ابھرتا ہے کہ ان کی شاعری ہند نژاد عربی شعراء میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اور محدود اصناف سخن میں طبع آزمائی کے باوجود ان کا شعری کردار بہت بلند نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے متنبی اور دیوان حماسہ کو ایک زمانے تک مطالعہ میں رکھا ہے اور تعلیم بھی دی ہے اس لئے عرب شاعروں کے افکار و خیالات اور محاسن کلام سے وہ بہت حد تک مانوس ہو چکے تھے۔ عربی فضاء ان کے لئے اس قدر مانوس ہوگئی تھی کہ ہندوستان میں بیٹھ کر عرب دنیا کے بارے میں سوچتے ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود عرب دنیا میں موجود ہیں اور عربی کے اہم شعراء متنبی، ابو نواس، بشار بن برد بھی ان کے ساتھ ہیں۔

انہوں نے شاعری میں بھی سادہ اور سہل لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ کلاسیکی شاعری سے متاثر ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کا رنگ بھی کلاسیکی نظر آتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کا انکی شاعری کے بارے میں یہ خیال ہے: "در نظم عربی کار نامہ شعراء عرب پیش می برد و در یں فن ید بیضا می نماید" اس جملے میں گو کہ مبالغہ کا عنصر بھی ہے مگر اس سے ان کی عظمت ظاہر ہوتی ہے

۳- تصانیف پر ایک نظر:

مولانا نے علمی دنیا میں یادگار کے طور پر بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں جو اپنے متعلقہ

موضوعات پر خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں سے اکثر نایاب یا کم یاب ہیں۔ ان کی جملہ تصانیف میں "تحفہ صدیقیہ، عروج المفتاح، ریاض الفیض، حل ابیات بیضاوی، شرح دیوان الحماسہ، تعلیقات الجلالین گلزار فیض، ترتیب دیوان حسان قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں چند دستیاب کتابوں کا اجمالی تعارف پیش ہے۔

۱۔ تحفہ صدیقیہ:

یہ کتاب مشہور حدیث "ام زرع" کی توضیح و تشریح ہے جسے مولانا نے نواب صدیق حسن خاں کی فرمائش پر تحریر کیا ہے۔ یہ ان گیارہ عورتوں کی دلچسپ اور عبرت آموز کہانی ہے جنہوں نے ایک دوسرے سے یہ قسمیں کھائی تھیں کہ اپنے شوہر سے متعلقہ خبروں کو کسی طور پر بھی نہیں چھپائیں گی۔ شارحین حدیث نے اس کی مختلف طرح سے توضیحات پیش کی ہیں۔ مولانا نے ان لوگوں سے ہٹ کر ادبی انداز سے اس کی تشریح کی ہے۔ مستند اور کلاسیکی شعراء کے شعری استشہاد، لفظی، لغوی استناد اور تجزیے کی وجہ سے اس کی بہت اہمیت ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع خورشید عالم لاہور سے ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۲۔ شرح دیوان الحماسہ المعروف بالفیضی:

ابوتمام (م ۲۳۶ھ) عباسی دور کے ممتاز شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک شعری انتخاب "دیوان الحماسہ" کے نام سے شائع کیا۔ اس انتخاب کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے اس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں جن میں ابن جنی (م ۳۹۲ھ) مرزوقی (م ۴۲۱ھ) اور خطیب تبریزی (م ۵۰۲ھ) کی شرحیں خاص طور پر تذکرے کے قابل ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس کی شرحیں ہوئیں مگر اس کے باوجود مولانا کے دل میں اس کی شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کی وجہ بتلاتے ہوئے مولانا فیض نے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

"دیوان حماسہ ایک زمانے سے مدارس اسلامیہ میں مقبول و متداول رہا ہے۔ اس کے اشعار کی توضیح و تشریح تبریزی نے کی ہے مگر طویل اور ضخیم ہونے کی وجہ سے عام طالب علموں کی دسترس سے باہر ہے اس لئے میرے دل میں دیوان کی شرح لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اس میں دیوبند اور سہارنپور

کے طلبار کی محنتوں کا بھی خاص دخل ہے۔ میں نے اس کتاب میں اپنی تمام تر کوششیں لفظی تشریح و توضیح، مشکلات و معضلات کی تفہیم و تسہیل، شعری مفاہیم، پس منظر کے ساتھ سوانحی اشاریے پر مرکوز کر دی ہیں۔ اور ادوار کے امتیازات و تفرقات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس شرح میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جس کا تذکرہ متقدمین میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لئے تبریزی، اغانی، مقدمہ ابن خلدون، وفیات ابن خلکان، کامل، اصابہ اور اسد الغابہ کے مصنفین اور صنادید عربی ادب کی تحریروں سے خصوصی استفادہ کیا ہے۔"[۴]

"مولانا کی یہ شرح جو" الفیضی" کے نام سے شائع ہوئی ہے انتہائی جامع اور مفید مطلب شرح ہے مصنف نے خود ہی اپنی انفرادیات اور وجدانیات کا ذکر کیا ہے۔ ہر شعر کی تشریح، بحر و قافیہ کا تعین شعرار کے سوانحی اشارے کی وجہ سے عام طالب علموں کے لئے ایک کام کی چیز ہے، مولانا کی یہ توضیح و تشریح تصنیف نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی ہے اور ۸۰۰ صفحات پر محیط ہے۔

۳۔ حل ابیات بیضاوی :

عبداللہ بن عمر ناصر الدین (م ۶۸۵ھ) نے ایک تفسیر" انوار التنزیل و اسرار التاویل" کے نام سے لکھی ہے جو مدارس اسلامیہ کے نصاب میں متداول ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں منظر عام پر آگئی ہیں ہندوستان میں اس پر سب سے مقبول حاشیہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۷ھ) کا مانا جاتا ہے مولانا نے بھی طالب علموں کی خاطر اس کی ایک شرح لکھی ہے جس میں کلام پاک کے معانی کی تشریح میں پیش کئے گئے کلام شعرار عرب کی وضاحت کی ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دہلی سے ۱۲۰۰ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ تعلیقات الجلالین :

جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے جو ایک کثیر التصانیف بزرگ ہیں جلال الدین محلی کے اشتراک سے ایک تفسیر لکھی جو" جلالین" کے نام سے مدارس عربیہ میں مشہور ہے۔ اس کی بہت ساری عربی اور اردو شروحات لکھی گئی ہیں۔ ہندوستان میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد

میں سے سلام اللہ (م ۱۸۱۳ء) نے "الکمالین" کے نام سے حاشیہ لکھا ہے اور علامہ ترابِ علی نے "الہلالین" کے نام سے۔ مولانا نے بھی اس کے مشکل الفاظ و تراکیب کو حل کرنے کے لیے ایک شرح لکھی جو ۱۸۷۰ء میں علی گڑھ سے چھپی۔

ان کے علاوہ سبع معلقہ کی ایک شرح ریاض الفیض ہے جو لاہور میں ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ ان کی ایک تصنیف ضوء المشکوٰۃ ہے جس کا قلمی نسخہ ٹونک میں محفوظ ہے۔ انھوں نے حضرت حسان بن ثابت کے دیوان پر حواشی بھی لکھے ہیں جو متن کے ساتھ لاہور سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔

۴۔ علمی اور ادبی مرتبہ:

مولانا کے علمی اور ادبی مرتبے کا تعین ان کے فنی شہ پاروں کے علاوہ ان جوہر قابل اور یگانہ روزگار تلامذہ سے کیا جا سکتا ہے جن میں سرسید احمد خاں (م ۱۸۹۸ء) علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) خواجہ الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) وحید الدین سلیم پانی پتی (م ۱۹۲۸ء) عبد الحمید فراہی (۱۸۶۲ء-۱۹۳۰ء) مفتی عبد اللہ ٹونکی (م ۱۹۲۴ء) خلیل احمد سہارن پوری (م ۱۳۴۶ھ) نذیر احمد سہسوانی (م ۱۳۰۹ھ) مولانا اسماعیل علی گڑھی (۱۲۶۳ھ) مشتاق احمد انبیٹھوی (۱۲۷۲ھ-۱۳۶۰ھ) محمد عرفان بریلوی (۱۲۶۵ھ) عبد العلی میرٹھی (م ۱۳۴۰ھ) عبد الرحمٰن سہارن پوری (م ۱۳۴۶ھ) اصغر علی روحی (۱۸۶۷ء) عبد الجبار عمر پوری (۱۲۷۷ھ) ظفر الدین لاہوری (۱۲۷۵ھ) احمد الدین لاہوری محمد بن احمد ٹونکی (۱۲۷۳ھ) ایسر باز خاں سہارن پوری جیسے اہم اور معتبر نام شامل ہیں۔ ان کی بلند مرتبت اور علمی عظمت کا اعتراف مشاہیر نے کیا ہے۔ متاخرین علماء نے بھی ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی کا ان کی بلند شخصیت کے بارے میں یہ خیال ہے کہ:

"مولانا فیض الحسن اس زمانے کے اصمعی اور ابو تمام سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے پورے اسلامی دور میں قاضی عبد المقتدر کے سوا یہی ایک فرد تھا جو عربی شاعری کا صحیح مذاق رکھتا تھا ان کی شرح حماسہ اور دیگر ادبی تصنیفات اس کی شاہد عدل ہیں اور اب ان کا عربی دیوان بھی چھپ گیا ہے جو اہل زبان کی ٹکر کا ہے۔" [۱۵]

ایک جگہ اور شبلی نعمانی کے ذیل میں سید سلیمان ندوی نے ان کی عظمت کا اعتراف یوں کیا ہے:

"مولانا فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ

خاک ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔ مولانا فیض الحسن صاحب کا بڑا فیض یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں انقلاب برپا کر دیا اور متاخرین سے ہٹا کر طلبہ کو قدیم شعرائے عرب کی طرف متوجہ کیا۔" [16]

مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول: "مولانا فیض الحسن مرحوم اس وقت اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے اور عربی ادب میں پورے ملک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ادب میں مولانا شبلی بھی ان ہی کے شاگرد تھے" [17]

مولانا کی علمی شہرت کی وجہ سے دور دراز سے طلبا اکتساب و استفادے کی خاطر آیا کرتے تھے اور اس وقت انساب و ایام عرب کے سلسلے میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ پنجاب میں مولانا کی وجہ سے علم و ادب کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ مولوی عبداللہ قریشی کے خیال میں: "ان کے دم قدم سے پنجاب میں اردو کا باغ لہلہا رہا تھا ان کی موجودگی سے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بڑی رونق ہوتی تھی اور وہ اپنے لائق شاگردوں کے ساتھ اس کے مشاعروں میں شریک ہوکر داد سخن دیتے تھے۔" [18]

علامہ شبلی نعمانی نے ان کی وفات کے بعد خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کا ایک ایک لفظ محبت، عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے اور ایک ایک حرف ان کی علمی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ چند شعر اس مرثیے کے بھی دیکھئے:

درین آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم	جہانے را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم
بہ تحسیں صبوری چند بفرستی مرا ناصح	دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
بمرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد	ہنر بر خویشتن گریدچو من بی خویشتن گریم
نگویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید	عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستان بودن
سخن را این چنین شیرازہ بستن تا کہ بتواند	پس از دی دفتر معنی پریشان گشت وابتر ہم
بایں پایہ اش من خود ندیدم در جہاں کس را	ولیں پس مثل او ہرگز نہ بیند چشم اختر ہم" [19]

ان کے علاوہ مولانا حمید الدین فراہی نے بھی مولانا کی شان میں ایک طویل عربی قصیدہ لکھا ہے۔ اور اپنے استاد کی عظمت، رفعت اور بلندی سے بھرپور عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مولانا ایک جلیل القدر عالم، ادیب لبیب اور عظیم فن کار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ اور ان کی انہی نمایاں علمی خدمات کی وجہ سے مولوی سعید اقبال قریشی نے لاہور یونیورسٹی سے ان کے فن و شخصیت کے مختلف

پہلوؤں سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔

حواشی

۱۔ تفصیل کے لئے، عبدالحی الحسنی: "نزہۃ الخواطر" (دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۹۷۰ء) جلد ۸ ص ۳۶۶ - ۳۶۸، نواب صدیق حسن خاں "شمع انجمن"، (مطبوعہ شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۲ھ) ص ۳۷۹ - ۳۸۰، نظامی بدایونی: "قاموس المشاہیر" (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۶ء) جلد دوم ص ۱۳۲، عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی: "مفتی صدرالدین آزردہ حیات اور خدمات" (مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۷ء) ص ۱۰۷ ـ ۱۱۵، لالہ سری رام: "خمخانۂ جاوید" (مطبوعہ دہلی ۱۹۱۷ء) جلد ۳ ص ۶۵۱، عبدالحی الحسنی: "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" ترجمہ ابوالعرفان ندوی (مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۹ء) ص ۷۲، ۷۳، حامد حسن قادری: "داستان تاریخ اردو" (مطبوعہ لکشمی نرائن اگروال آگرہ، ۱۹۶۶ء بار سوم) ص ۶۱۰ - ۶۱۱، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" (ادارہ معارف اسلامیہ لاہور) جلد دوم ص ۴۰۲ - ۴۰۴) شیخ نذیر حسین: "مولانا فیض الحسن ادیب اور شاعر" موشومہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (ستمبر ۱۹۹۰ء)، محمد اسماعیل پانی پتی: "ادیب اور مصنف" مجلہ "نقوش" پاکستان (لاہور نمبر فروری ۱۹۶۲ء) ص ۹۲۶۔

۲۔ لالہ سری رام: "خمخانۂ جاوید" جلد ۳ ص ۶۵۱۔

۳۔ صدیق حسن خاں: "شمع انجمن" ص ۳۷۹ - ۳۸۰۔

۴۔ دیوان الفیض (مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۰۴ھ) ص ۲۲ - ۲۳۔

۵۔ دیوان ص ۲۳ - ۲۴۔

۶۔ دیوان ص ۵۶ - ۵۷۔

۷۔ دیوان ص ۱۰۔

۸۔ دیوان ص ۳۹۔

۹۔ دیوان ص ۴۱۔

۱۰۔ دیوان ص ۵۴ - ۵۵۔

۱۱۔ دیکھئے: عبدالرحمٰن کاشغری ندوی: "الزہرات" بحوالہ حامد علی خاں، "ہندوستان کی عربی شاعری"

(تحقیقی مقالہ، علی گڑھ) ص ۳۶۰ -

۱۲ - دیکھئے: وحیدالدین عالی: "عقد اللآلی" بحوالہ حامد علی خاں: "ہندوستان کی عربی شاعری" ص ۳۶ -

۱۳ - ڈاکٹر زبید احمد: "عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ" ترجمہ شاہد حسین رزاقی (مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، بار دوم، ۱۹۸۷) ص ۲۳۳ -

۱۴ - فیض الحسن سہارنپوری: "شرح دیوان الحماسۃ" (مطبوعہ نول کشور لکھنؤ) -

۱۵ - دیکھئے، سید سلیمان ندوی: "یاد رفتگاں" (مطبوعہ اعظم گڈھ، ۱۹۸۶) ص ۲۲ -

۱۶ - دیکھئے، " " : "حیات شبلی" (مطبوعہ معارف اعظم گڈھ، ۱۹۴۳) ص ۸۰-۸۴ -

۱۷ - دیکھئے، عبدالرحمن ناصر اصلاحی (مرتب): "مختصر حیات حمید" ص ۳۰ -

۱۸ - مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے، محمد عبداللہ قریشی: "امام الادب مولانا فیض الحسن سہارنپوری" مشمولہ "المعارف" لاہور (جولائی ۱۹۷۷ء) ص ۴۶ -

۱۹ - شبلی نعمانی: "کلیات شبلی" (فارسی) مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ ص ۴۴-۴۵، شبلی نعمانی "مجموعہ نظم" (مطبوعہ مفید عام آگرہ، ۱۸۹۳ء) ص ۲۹-۳۰ -

خطۂ کشمیر میں دعوت اسلامی اور اسکا اسلوب

پہلی قسط

مولوی محمد عمر فاروق، میر واعظ کشمیر

الحمد للہ علی نعمتہ الظاھرۃ والباطنۃ قدیماً وحدیثاً۔ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ ورسولہ محمد والہ واصحابہ۔ الذین سارو فی نصرۃ دینہ وعلی اتباعھم الذین ورثوا علمھم والعلماء ورثۃ الانبیاء اکرم منھم وارثاً وموروثاً (امّا بعد)

قال اللہ تعالیٰ فی کتابہ القدیم۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ صدق اللہ العلی العظیم۔

ترجمہ:- "اور بھلا اس شخص سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جس نے اللہ کی طرف لوگوں کو بلایا اور نیک اعمال کئے اور خود بھی اپنی گردن اس کے سامنے جھکائی"

جناب صدر عالی وقار، حضرات علمار اکابرین، عمائدین اور اساطین امت — "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" میرے جیسے طالب علم کے لئے " دعوت وفکر اسلامی" کے موضوع پر منعقدہ پرشکوہ عالمی سیمنار میں شرکت وشمولیت اور اس علمی اور تاریخی موضوع پر اظہارِ خیال کرنا انتہائی سعادت اور مسرت کی بات ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے میری دعا ہے اور یہ میری دلی خواہش ہے کہ جس مبارک اور احسن مقصد کے لئے دور دراز علاقوں، دنیا بھر کے ممالک اور خطوں سے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں ہم اس میں ہر طرح کامیاب ہوں، رب کائنات ہماری نیتوں اور ہمارے اعمال میں زیادہ سے زیادہ اخلاص اور للہیت پیدا فرمائے۔ آمین۔

بزرگانِ ملت! میرے مقالہ کا عنوان ہے" خطۂ کشمیر میں دعوت اسلامی اور اس کا اسلوب"۔ اس ذیل میں گفتگو سے قبل ہمیں کشمیر کی تاریخی، تمدنی اور جغرافیائی حیثیت پر بھی ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ کشمیر کی تمدنی تاریخ اس کی سیاسی تاریخ کے برعکس نہایت ہی شگفتہ وسیع اور ممتاز رہی ہے۔

سیاسی طوائف الملوکی اور استحصال کے باوجود اس قوم نجیب اور چرب دست قوم نے ہر دور میں اپنے وجود اور اپنی زندگی کا ثبوت دیا ہے۔ محل وتوع کے اعتبار سے کشمیر کی گلپوش وادی روز اول سے مختلف قوموں کی جولانگاہ رہی ہے اور جہد کی کوشش میں اس ملک میں رہنے والوں کو اپنے ذہن اور ادراک کے دریچے ہمیشہ کھلے رکھنا پڑے ہیں اور وقت کی محراب سے گذرتے ہوئے ہر نئے رجحان کو نہ فقط سمجھنا پڑا ہے بلکہ اس حد تک برتنا بھی پڑا ہے۔ جس حد تک اس کی جڑیں یہاں کی تہذیب میں پیوستہ ہو پائیں اس صورت حال نے کشمیر کو مآل اندیش، متحمل مزاج کشادہ جبیں اور دلنواز بنا دیا ہے۔ تاریخ کے گہرے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ناگ وہ پہلی فاتح قوم ہے جس نے پہلی بار اس وادی گل بار کو نہ فقط اپنا مسکن بنایا بلکہ یہاں بڑی بڑی بستیاں آباد کیں یہی لوگ چشموں کو مقصد حیات جان کر ان کی پوجا کرتے تھے۔

چشموں کی دنیا کشمیر میں آریوں کی آمد تاریخی شواہد اور ثبوت سے زیادہ افسانوں میں کھو گئی ہے۔ بعض مورخین نے انہیں شمالی دروں سے آئی ہوئی قوم اور بعض تاریخ دانوں نے ہندوستان سے آئی ہوئی ذات سمجھا ہے۔ آریوں کے دور ہی میں وادی میں سنسکرت زبان پنپنا شروع ہوئی چنانچہ کلہن کی "راج ترنگنی" کے مطابق کشمیر کا پہلا سنسکرت شاعر کنڈک تھا۔ جو راجہ تان سین کے وقت میں گذرا ہے۔ اور کشمیر ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے تمام سنسکرت کا سرمایہ کشمیر میں تخلیق ہونے والے سنسکرت ادب کے نصف کے برابر ہے ـــ تاریخ کے فرہادوں نے اس بات کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یونانی اور بنی اسرائیل بھی کشمیر میں وارد ہوئے ہیں اور یہاں کی تہذیب وثقافت میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ہندو دور کے بعد کشمیر میں بدھ مت کو عروج حاصل ہوا اور اس سرزمین میں کنشک کے عہد میں تیسری بین الاقوامی کانفرنس ہارون کے نزدیک چھ ریشیوں کے بن میں منائی گئی تھی۔

اسلام کی آمد:۔

بدھ دور کے فوراً بعد کشمیر میں اسلامی دور شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ آخری بدھ بادشاہ رینچن شاہ مسلمان ہو کر صدر الدین نام پاتا ہے۔ جنت نظیر خطہ کشمیر میں اسلام کی آمد کی شجرکاری، تاریخ، پس منظر اور پیش منظر عالمانہ، محققانہ اور فاضلانہ گفتگو کرتے ہوئے شہید ملت میر واعظ مولوی محمد فاروقؒ (اش ۱۹۹۰ء)

لکھتے ہیں:-

"برصغیر ہند کے مغربی علاقوں سندھ، ملتان، گجرات اور جنوبی کناروں کیرالہ وغیرہ میں دینِ اسلام پہلی صدی ہجری میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری تک بجز خطۂ کشمیر کے برصغیر کا کوئی علاقہ ایسا نہ تھا۔ جس میں مسلمان نہ پائے جاتے ہوں بلکہ وادیٔ کشمیر آج سے تقریباً سات سو سال قبل تک یعنی آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا تک ظلمات النظلمت تھی۔ اسلام کی تعلیم اور ہدایت سے لوگ یکسر ناآشنا تھے۔ آٹھویں صدی ہجری میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نورِ اسلام کی ضَو پاشیوں نے اس ظلمتکدہ کو بقعۂ نور میں بدل دیا۔"

شہیدِ ملت لکھتے ہیں: "یوں تو کشمیر میں اسلام کی مکمل تبلیغ اور وادی کے دور افتادہ علاقوں اور دیہات تک کونے کونے تک اس کی توسیع حضرت میر سید علی ابن شہاب الہمدانی قدس اللہ سرہ العلی (المتوفی ۷۸۶ھ) کی آمد اور ان کے رفقاء، علماء و سادات خاص کر ان کے فرزند حضرت میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے لیکن اس سرزمین میں سب سے پہلے اسلام کی تخم ریزی کا فخر حضرت شیخ عبدالرحمٰن شرف الدین المعروف بلبل شاہ (المتوفی ۷۲۷ھ) کو حاصل ہے جن کے طفیل بدھ دور کے آخری بادشاہ رینچن شاہ نے بخوشی اسلام قبول کر کے کشمیر میں دینِ اسلام کی اشاعت کی راہ ہموار کر دی۔"

اسلام کی معجزانہ قوتِ تسخیر کے دیگر ہزاروں واقعات کی طرح راجہ رینچن شاہ کے مسلمان ہونے کا واقعہ بھی اپنی نوعیت کا مثالی واقعہ ہے مورخین رقمطراز ہیں کہ راجہ کے دل میں جب ہدایت اور صراطِ مستقیم پر چلنے کا جذبہ موجزن ہوا۔ اور تلاشِ حق نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تو ایک روز اس نے فیصلہ کیا کہ کل سویرے جس شخص پر میری نظر پڑے گی۔ اس کا جو مذہب ہو گا اسے میں بخوشی قبول کروں گا۔ قدرت نے سعادت ازل سے قسمت میں لکھ دی تھی لہٰذا سب سے پہلے جس قدسی الاصل شخصیت پر اس کی نظر پڑی وہ عارف باللہ سید شرف الدین ہی کی ذات گرامی تھی۔ جو شاہی محل کے بالمقابل دریائے جہلم کے دوسرے کنارے پر خشوع و خضوع کے ساتھ صبح کے وقت یادِ الٰہی اور نماز میں مستغرق تھے۔ بادشاہ کو ان کی یہ عبادت پسند آئی اور فوراً آپ نے پورے خاندان اور ساتھیوں سمیت اسلام قبول

کر لیا۔ حضرت بلبل شاہؒ نے نو مسلم بادشاہ کا نام "صدرالدین" رکھا۔
حضرت شیخ شرف الدین علیہ الرحمۃ اور راجہ رینچن شاہ جواب صدرالدین کے نام سے کشمیر پر حکمران رہے۔ چند سال کے اندر اندر وفات پاگئے ان کی وفات کے بعد ایک تھوڑا سا چند سال کا وقفہ ہندو حکومت کا آیا لیکن یہ شعلۂ مستعجل تھا۔ ذرا ٹھہر کا پھر بجھ گیا۔

سلطان شاہ میر:

اس کے بعد سلطان شاہ میر نے مسلم سلاطین کی بنیاد ڈالی جو دیر پا ثابت ہوئی کشمیر کے اس خاندان سلاطین کا دور حکومت بڑا ہی بابرکت تھا۔ اس میں شہاب الدین، قطب الدین، سکندر اور زین العابدینؒ (بڈشاہ) جیسے غیر معمولی صلاحیت کے سلاطین پیدا ہوتے۔ جن کے کارہائے نمایاں کے نقوش صفحۂ کشمیر پر ثبت ہیں۔ سلطان شاہ میر کے پوتے سلطان قطب الدین کے دور میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی کشمیر میں آمد ورفت شروع ہوئی اور آپ نے اسلام کے شجرۂ طیبہ کی یہاں باقاعدہ آبیاری کی اور اسلام کی دعوت توحید قرآن وسنت کی اشاعت کے لئے آپ نے ختلان (ایران) سے آکر کشمیر کے یکے بعد دیگرے تین دورے کئے اور اس پورے خطہ کو چمنستانِ اسلام میں تبدیل کر ڈالا۔

شاہِ ہمدانؒ اور کشمیر:

آپؒ کا پہلا دورہ کشمیر ۷۷۴ھ میں ہوا اس دورے سے کشمیر میں دینِ اسلام کو وسعت وفروغ حاصل ہوا اور اس دوران آپ نے متعدد مقامات پر مساجد اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ آپؒ کا تیسرا دورۂ کشمیر ۷۸۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ دعوت اسلامی کے لحاظ سے تکمیلی مرحلہ تھا۔ جس سے نہ صرف یہاں کے لوگوں کے عقائد واعمال، افکار ونظریات، اخلاق وکردار اور تہذیب وتمدن یکسر بدل گیا بلکہ ان میں ایک مکمل روحانی اور فکری انقلاب آگیا۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے اسلام کے اس بطلِ جلیل کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

سیدالسادات، سالارِ عجم — دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم
تا غزالی درسِ اللہ ھو گرفت — ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
سیدِ آں کشورِ مینو نظیر — میر و درویش و سلاطین را مشیر

خطۂ را آں شاہ دریا آستین داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آں مرد ایران صغیر باہنرہائے غریب و دل پذیر

علماء، صلحاء اور سادات کی کشمیر میں آمد:

حضرت شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانیؒ کے بعد آپ کے فرزند حضرت امیر محمد ہمدانیؒ (المتوفی ۸۵۴ھ) اور ان کے ساتھ ایران سے آئے ہوئے علماء و صلحاء اور سادات کی ایک بڑی جماعت کشمیر میں ترویج دین اور اشاعت اسلام کے عظیم کام میں اس طرح مصروف کار ہوگئی کہ اسلام کا پیغام وادی کے شہر و دیہات میں گھر گھر پہونچا کر تقریباً تمام آبادی کو اس شان سے داخل اسلام کر دیا کہ "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا حسین نظارہ پیش نظر ہو کر رہ گیا۔

حضرات گرامی! آٹھویں صدی ہجری کے اختتام تک کشمیر میں اسلام اپنی جڑیں دُور دُور تک پھیلا چکا تھا۔ اب اس کے نام لیوا اپنی حکومت کے زیر سایہ امن و انصاف، انفرادی اور اجتماعی ترقیات سے متمتع ہو رہے تھے اور ریاست جموں و کشمیر کا عظیم اسلامی مرکز "جامع مسجد" اور تصوف و روحانیت کی درس گاہ "خانقاہ معلیٰ" ۸۰۰ھ میں مکمل ہو کر مسلمانان کشمیر کے لئے تبلیغ و ارشاد اور علم و عرفان کا مرکز بن چکی تھیں۔ نویں، دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے دوران کشمیر میں علوم اسلامیہ کی تعلیم اپنے عروج تک پہونچ گئی۔ عرب، عراق، ایران اور ترکستان کے جو بزرگان دین خطۂ کشمیر کو وقتاً فوقتاً منور کرتے رہے۔ ان کے علاوہ خود خاک کشمیر سے بڑے بڑے علماء، صوفیاء، مشائخ، مفکرین اور قائدین پیدا ہوئے جنہوں نے کشمیر میں اسلامی اور علمی انقلاب برپا کئے۔ سرزمین کشمیر سے جو اہل کمال اٹھے ہیں، ان کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔

ان اسلامی داعیوں اور علماء میں حضرت شیخ یعقوب صرفی علیہ الرحمۃ (المتوفی ۱۰۰۳ھ) ملا ...ناتھ (جنہیں علم حدیث کی تحصیل و تکمیل میں حضرت علامہ ابن حجر مکی علیہ الرحمۃ سے براہ راست شرف تلمذ حاصل تھا) علامہ بابا داؤد خاکیؒ (المتوفی ۹۹۴ھ) ملا فیروز کشمیریؒ (المتوفی ۱۰۷۱ھ) محدث جلیل علامہ داؤد مشکواتیؒ (المتوفی ۱۰۹۷ھ) جنہیں مشکوٰۃ المصابیح جیسی ضخیم کتاب نوک زبان تھی، قابل ذکر ہیں ــــ کشمیر کے مشائخ میں حضرت شیخ نور الدین نورانیؒ (المتوفی ۸۴۱ھ) حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ (المتوفی ۹۸۴ھ) حضرت شیخ بہاؤ الدین گنج بخشؒ (المتوفی ۹۴۳ھ)

کر لیا۔ حضرت بلبل شاہؒ نے نو مسلم بادشاہ کا نام "صدرالدین" رکھا۔
حضرت شیخ شرف الدین علیہ الرحمۃ اور راجہ رینچن شاہ جواب صدرالدین کے نام سے کشمیر پر حکمران رہے۔ چند سال کے اندر اندر وفات پا گئے ان کی وفات کے بعد ایک تھوڑا سا چند سال کا وقفہ ہندو حکومت کا آیا لیکن یہ شعلۂ مستعجل تھا۔ ذرا بھڑکا پھر بجھ گیا۔

سلطان شاہ میر؛

اس کے بعد سلطان شاہ میر نے مسلم سلاطین کی بنیاد ڈالی جو دیرپا ثابت ہوئی کشمیر کے اس خاندان سلاطین کا دورِ حکومت بڑا ہی بابرکت تھا۔ اس میں شہاب الدین، قطب الدین، سکندر اور زین العابدینؒ (بڈشاہ) جیسے غیر معمولی صلاحیت کے سلاطین پیدا ہوئے۔ جن کے کارہائے نمایاں کے نقوش صفحۂ کشمیر پر ثبت ہیں۔ سلطان شاہ میر کے پوتے سلطان قطب الدین کے دور میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی کشمیر میں آمد و رفت شروع ہوئی اور آپ نے اسلام کے شجرۂ طیبہ کی یہاں باقاعدہ آبیاری کی اور اسلام کی دعوتِ توحید قرآن وسنت کی اشاعت کے لیے آپ نے ختلان (ایران) سے آ کر کشمیر کے یکے بعد دیگرے تین دورے کئے اور اس پورے خطہ کو چمنستانِ اسلام میں تبدیل کر ڈالا۔

شاہِ ہمدانؒ اور کشمیر؛

آپؒ کا پہلا دورۂ کشمیر ۷۷۴ھ میں ہوا۔ اس دورے سے کشمیر میں دینِ اسلام کو وسعت و فروغ حاصل ہوا اور اس دوران آپ نے متعدد مقامات پر مساجد اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ آپؒ کا تیسرا دورۂ کشمیر ۷۸۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ دعوت اسلامی کے لحاظ سے تکمیلی مرحلہ تھا جس سے نہ صرف یہاں کے لوگوں کے عقائد و اعمال، افکار و نظریات، اخلاق و کردار اور تہذیب و تمدن یکسر بدل گیا بلکہ ان میں ایک مکمل روحانی اور فکری انقلاب آ گیا۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے اسلام کے اس بطلِ جلیل کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

سید السادات، سالارِ عجم — دستِ او معمارِ تقدیرِ امم
تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت — ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
سید آں کشورِ مینو نظیر — میر و درویش و سلاطین را مشیر

خطۂ را آں شاہ دریا آستیں داد علم وصنعت و تہذیب و دین
آفرید آں مرد ایران صغیر باہنرہائے غریب و دل پذیر

علماء، صلحاء اور سادات کی کشمیر میں آمد:

حضرت شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانیؒ کے بعد آپ کے فرزند حضرت میر محمد ہمدانیؒ (المتوفی ۸۵۴ھ) اور ان کے ساتھ ایران سے آئے ہوئے علماء و صلحاء اور سادات کی ایک بڑی جماعت کشمیر میں ترویج دین اور اشاعت اسلام کے عظیم کام میں اس طرح مصروف کار ہو گئی کہ اسلام کا پیغام وادی کے شہر و دیہات میں گھر گھر پہونچا کر تقریباً تمام آبادی کو اس شان سے داخل اسلام کر دیا کہ "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا حسین نظارہ پیش نظر ہو کر رہ گیا۔

حضرات گرامی! آٹھویں صدی ہجری کے اختتام تک کشمیر میں اسلام اپنی جڑیں دور دور تک پھیلا چکا تھا۔ اب اس کے نام لیوا اپنی حکومت کے زیر سایہ امن و انصاف، انفرادی اور اجتماعی ترقیات سے متمتع ہو رہے تھے اور ریاست جموں و کشمیر کا عظیم اسلامی مرکز "جامع مسجد" اور تصوف و روحانیت کی درس گاہ "خانقاہ معلیٰ" ۸۰۰ھ میں مکمل ہو کر مسلمانان کشمیر کے لئے تبلیغ و ارشاد اور علم و عرفان کا مرکز بن چکی تھیں۔ نویں، دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے دوران کشمیر میں علوم اسلامیہ کی تعلیم اپنے عروج تک پہونچ گئی۔ عرب، عراق، ایران اور ترکستان سے جو بزرگان دین خطۂ کشمیر کو وقتاً فوقتاً منور کرتے رہے۔ ان کے علاوہ خود خاک کشمیر سے بڑے بڑے علماء، صوفیاء، مشائخ، مفکرین اور قائدین پیدا ہوئے جنہوں نے کشمیر میں اسلامی اور علمی انقلاب برپا کئے۔ سرزمین کشمیر سے جو اہل کمال اٹھے ہیں، ان کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔

ان اسلامی داعیوں اور علماء میں حضرت شیخ یعقوب صرفی علیہ الرحمۃ (المتوفی ۱۰۰۳ھ) ملا جوہر ناتھ (جنہیں علم حدیث کی تحصیل و تکمیل میں حضرت علامہ ابن حجر مکی علیہ الرحمۃ سے براہ راست شرف تلمذ حاصل تھا) علامہ بابا داؤد خاکیؒ (المتوفی ۹۹۴ھ) ملا فیروز کشمیریؒ (المتوفی ۱۰۱۷ھ) اور محدث جلیل علامہ داؤد مشکواتیؒ (المتوفی ۱۰۹۷ھ) جنہیں مشکوٰۃ المصابیح جیسی ضخیم کتاب بھی نوک زبان تھی، قابل ذکر ہیں ـــ کشمیر کے مشائخ میں حضرت شیخ نور الدین نورانیؒ (المتوفی ۸۴۲ھ) حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ (المتوفی ۹۸۴ھ) حضرت شیخ بہاؤ الدین گنج بخشؒ (المتوفی ۹۸۳ھ)

کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ علماء متاخرین و مفکرین میں امام التفسیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ، مہاجرِ ملت میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہؒ جیسی ممتاز اور بین الاقوامی شخصیتیں سر فہرست ہیں۔

میر واعظین کشمیر!

بارہویں، تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری کا زمانہ کشمیر میں اسلام کے لئے مصیبتوں اور آزمائشوں کا زمانہ تھا کیونکہ وقتی حکومتوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت پر روک لگا دی تھی۔ اس وقت اسلام کی اشاعت سے زیادہ اسلام کا تحفظ اہم اور ضروری بن گیا تھا اور جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسباب اور وسائل مہیا فرمائے۔ چنانچہ مفکرِ اسلام حضرت علامہ سید ابوالحسن علی الندوی لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی اس امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جہاں ناقابل شمار انعامات ہیں اور اس کو وہ خصائص حاصل ہیں۔ جن میں کوئی قوم وملت شریک نہیں ان میں ایک عظیم انعام اشاعتِ اسلام اور حفاظتِ اسلام دونوں کا انتظام ہے۔ جب کسی ملک اور خطہ میں اسلام کا تعارف اس کی طرف دعوت اور اسکی اشاعت کی ضرورت پیش آئی اس نے اس طرح کے نفوس قدسیہ وہاں بھیجے یا پیدا کئے جن کی صحبت میں کیمیا اور پارس کی تاثیر تھی کہ جوان سے چھو گیا وہ بھی سونا بن گیا اور انکو "دمِ عیسیٰ اور نفسِ گرم" کی قوت وحرارت حاصل تھی۔ جس نے مردہ دلوں میں مسیحائی کا کام کیا پھر جب اسلام (اس حد تک جو خدا کو منظور تھا) پھیل گیا اور اب اس کی تحریف اور مقامی جاہلیت کے اثرات سے بچانے اور مشرکانہ رسوم وبدعات سے پاک کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے اس نے اس طرح کی عالی ہمت اور قوی نسبت نفوس بھیجے یا پیدا کئے جنہوں نے عرصہ تک کے لئے اسلام اور اس کے حلقہ بگوشوں کو اس خطرہ سے محفوظ کر دیا۔"

"فجزاهم الله عن الاسلام والمسلمين خير الجزاء"

یہی دونوں سلسلے ایران صغیر، خطۂ مینو سواد کشمیر اور بقول ادباء واہل ذوق جنت نظیر میں نظر آتے ہیں۔ پہلا سلسلہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ اور شیخ کبیر حضرت شیخ

حضرہ مخدوم پر مشتمل و معترف ہے۔ جن کے خلوص، روحانیت، حکمت دعوت اور انسانی دوستی سے اسلام کشمیر کی نہ صرف تاریخ بلکہ تقدیر بن گیا ہے۔ اور تاریخ تو بدلی جا سکتی ہے اور بدلتی رہتی ہے، تقدیر نہیں بدل سکتی" لا راد لقضاء اللہ " پھر جب اسلام خدا کے فضل سے یہاں کی اکثریت کا دین اور موت و حیات کا آئین بن گیا تو قدرتاً اس کی روح، اس کے عقائد اور اسلامی شریعت کی صحیح تشریح اور ان کی حفاظت کی ضرورت پیش آئی۔ نیز ان کے غیر اسلامی عناصر و اثرات اور جاہلی رسوم و معتقدات کو ممیز اور واضح کرنے کی جو قانونِ قدرت اور انسانی نفسیات کے مطابق مرورِ زمانہ اور طول عہد سے ہر مسلم معاشرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ فطال علیہم الامد فقست قلوبہم " اور جس سے کسی زمانہ میں مفر نہیں رہا اس وقت اللہ تعالیٰ نے تیرہویں صدی ہجری کے میر واعظین کے قدیم اور معروف خاندان میں ان ہستیوں کو پیدا کیا۔ جنہوں نے دین کی صحیح تبلیغ اور مسلمانوں کے اعتقادات اور اعمال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں میر واعظ مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ المتوفی (۱۳۱۷ھ) اور خصوصیت کے ساتھ میر واعظ مولانا رسول شاہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۲۷ھ) قابلِ ذکر اور مستحق شکر ہیں۔ جنہوں نے انجمن نصرۃ الاسلام جیسے مبارک ادارہ کی بنیاد رکھی۔ ان کے بعد میر واعظ مولانا احمد اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۴۹ھ)، میر واعظ مولانا محمد عتیق اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۸۱ھ) پھر میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۸۹ھ) کا نام جلی اور زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔

ان کے بعد یہ منصب جلیل عزیز گرامی منزلت مولانا محمد فاروق صاحب میر واعظ کے حصہ میں آیا اور خدا کا شکر ہے۔ کہ انہوں نے اس کی روایات کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ بدلے ہوئے زمانہ، نازک سیاسی صورت حال اور عصر حاضر کے پیچیدہ معاشرہ اور تمدن کے مطابق اس میں نئے فکر و نظر، جدید مطالعہ، حقیقت پسندی اور کشمیر سے باہر ملک کے ملی مسائل و مصائب کا علم و احساس مختلف جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل اور عالم اسلام کے ساتھ وابستگی اور ربط و تعلق کا اضافہ کیا۔"

انجمن نصرۃ الاسلام کا قیام: ریاستِ جموں و کشمیر کے تعلیمی اداروں میں انجمن نصرۃ الاسلام

سب سے قدیم اور زندہ ادارہ ہے۔ جو انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہوا۔ اور تب سے اب تک قوم کی علمی، دینی، اصلاحی، ثقافتی اور سماجی خدمات انجام دینے میں مصروف کار ہے۔ اپنے کم و بیش سو سالہ دورِ حیات میں انجمن نصرۃ الاسلام نے اسلامی علوم کے پہلو بہ پہلو تعلیمِ جدید کو پھیلانے میں جو شاندار کردار ادا کیا وہ تاریخ کشمیر کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔

انجمن کے قائم کردہ چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں میں ایسے لوگوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی جو آگے چل کر ریاست میں دورِ حاضر کے مشاہیر ثابت ہوئے۔ چاہے وہ اہلِ علم و دانش ہوں، یا مذہبی پیشوا، ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، سیاسی رہنما ہوں یا حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار، وکیل ہوں یا جج، اِن سب میں آپ کو ایسے افراد کی کثیر تعداد نظر آئے گی۔ جنہوں نے زندگی کے پہلے اسباق اسی ادارہ میں حاصل کئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انجمن کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

کشمیری مسلمانوں کو غربت، جہالت، ناخواندگی اور ناداری سے نجات دلانے کے لئے حضرت علامہ میر واعظ غلام رسول شاہ صاحبؒ نے ۱۳۱۷ھ میں سری نگر میں انجمن نصرۃ الاسلام کی داغ بیل ڈال دی۔ اس انجمن کا مقصدِ اولین یہ تھا کہ کشمیری مسلمان خاص طور پر تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہونے کے سبب جہالت میں گھرا ہوا ہے۔ اور اسکو تعلیم کے نور سے منور اور علم کے زیور سے آراستہ کر کے حقیقی مسلمان اور صحیح انسان بنانے کی سخت ضرورت ہے انھوں نے سوچا کہ وہ لوگوں کو اگر دنیا میں رہ کر اپنا مقام حاصل کرنا ہے اور خود کو خیر امت ثابت کرنا ہے تو انہیں ایک طرف جدید تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہوگا اور دوسری طرف اپنے مذہبی اور ثقافتی سرمایہ کی بھی حفاظت کرنی ہوگی۔

اس غرض کے لئے اس انجمن نے ابتدائی درس گاہوں کا ایک سلسلہ شروع کیا اور چند ہی برسوں میں ایک ہائی اسکول قائم ہوا۔ اور اسکی شاخیں ریاست بھر میں ایک سایہ دار درخت کی طرح پھیل گئیں۔ اسی ادارہ کے ماتحت میر واعظ مولانا محمد یوسف صاحب نے اپنے دَور میں جس جامع دینی، عربی درس گاہ نور اسلام اورینٹل کا افتتاح کیا۔ اس کا مقصد

واحد خطہ ہذا میں دعوتِ اسلامی کے لئے ایسے افراد کو تیار کرنا تھا۔ جو وقت کے تقاضوں کو سمجھتے۔ کیونکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ اب ایک نئی پود سامنے آ رہی تھی۔ ایک نیا ذہن ابھر رہا تھا۔ چنانچہ اس دارالعلوم سے ابتک علومِ الہیہ اور عالیہ سے آراستہ ایک بڑی تعداد ریاست کے گوشے گوشے میں فریضۂ دعوت کو انجام دینے میں مصروف ہے۔ دعوتِ دین کے کام میں ظاہر ہے کہ قرآن مجید کو لوگوں کی زبان میں سمجھانا لابدی امر ہے۔ لیکن زبانی الفاظ میں سمجھانے کے علاوہ اس زبان کو تحریر میں لاکر پڑھا کر سمجھانا اس سے بھی ایک اہم تر مرحلہ ہے اسی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فارسی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ لکھا پھر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ نے اردو تراجم لکھے تھے (اسی رشتۂ تلمذ کا اتباع کرتے ہوئے میرواعظ مولانا محمد یحییٰؒ نے کشمیری ترجمہ کا بیڑا اٹھایا) چنانچہ میرواعظ مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمۃ نے دعوت کے اسی پہلو کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے قرآن مجید کو کشمیری زبان میں ترجمہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اور سب سے پہلے عام روش سے ہٹ کر پارۂ عَمَّ کا ترجمہ کیا جو بنام نُورالعیون فی ترجمہ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ زائداز ایک صدی قبل اشاعت پذیر ہوا۔ آخری پارہ کو اوّلیت دینے کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے چونکہ کشمیری مسلمان نوے فیصد ان پڑھ تھے۔ کشمیر میں یہ بات زبان زدِ عوام رہی ہے کہ اگر کسی مسلمان کو کہیں سے پوسٹ کارڈ آتا تو اس کو پڑھانے اور سمجھانے کے لئے اسے کسی غیر مسلم پنڈت کی طرف نہ صرف رجوع کرنا پڑتا۔ بلکہ اس پر دھیلہ پیسہ کی اجرت بھی دینی پڑتی۔ ایسے جہالت کے ماحول میں پارۂ عَمَّ سے ہی آغاز کرنا قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے "کَمَا لَا یَخْفٰی عَنِ الْمُتَامِّلِ"۔ لیکن میرواعظؒ کی حیات نے وفا نہ کی اور ان کا ارادہ زیرِ تکمیل رہا۔ اور بحکم كُلُّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِاَوْقَاتِهَا "یا مَا شَآءَ اللّٰهُ فَقَدَّرَ وَكَانَ"، تکمیل ترجمہ وتفسیر ان کے پوتے میرواعظ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی قسمت میں مقدر تھی۔

مرکزِ اسلام!

میرواعظینِ کشمیر رحمہم اللہ اجمعین نے تبلیغِ دین، اسلامی علوم نکھرے ہوئے عقائد کی اشاعت دعوتِ اسلام، اشاعتِ اسلام اور حفاظتِ اسلام کے لئے جامع مسجد کشمیر کو مرکزی

حیثیت دی۔ اس عظیم منصب پر یکے بعد دیگرے جو میر واعظ سریر آرائے وعظ و ارشاد ہوئے۔ ان میں مولوی صدیق اللہ صاحبؒ (المتوفی سنہ ۱۱۷۰ھ) مولوی عبدالسلام صاحبؒ (المتوفی سنہ ۱۲۰۵ھ) میر واعظ رسول شاہ صاحب اولؒ (المتوفی سنہ ۱۲۶۱ھ) میر واعظ مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ (المتوفی سنہ ۱۳۰۵ھ) میر واعظ علامہ رسول شاہ صاحب دومؒ (المتوفی سنہ ۱۳۲۷ھ) بانی انجمن نصرۃ الاسلام کشمیر، میر واعظ مولانا احمد اللہ صاحبؒ (المتوفی سنہ ۱۳۴۹ھ) میر واعظ مولانا عتیق اللہ صاحبؒ (المتوفی سنہ ۱۳۸۱ھ) میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحبؒ (المتوفی سنہ ۱۳۸۹ھ) اور شہید ملت میر واعظ مولانا محمد فاروق صاحبؒ (شہادت سنہ ۱۴۱۱ھ) قابل ذکر ہیں۔

بقیہ: آئندہ

حیاتِ ذاکر حسین

(از خورشید مصطفیٰ رضوی)

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی خدمت علم اور ایثار و قربانی سے بھرپور زندگی کی کہانی جس میں اردو ماخذ اور ملکی و بیرونی اخبارات و رسائل کی چھان بین سے تمام حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

شروع میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا قیمتی پیش لفظ ہے۔ قیمت مجلد ۲۵ روپے

تین تذکرے

یہ کتاب ان تین کتابوں کی تلخیص ہے "مجمع الانتخاب" "طبقات الشعراء" اور "گلِ رعنا" یہ تلخیص جن قلمی نسخوں سے مرتب کی گئی ہے وہ سب اپنے مؤلفین کی نظروں سے بھی گذر چکے ہیں اس لئے ان کا متن مستند ہے۔ ادبیات اردو کے سلسلے میں یہ تذکرے نہایت اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تلخیص نگار نثار احمد فاروقی صاحب

مجموعی صفحات ۴۱۳

قیمت مجلد ۳۰ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

برہان

جلد ۱۱۱ | مارچ ۱۹۹۳ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

رمضان شریف کے مہینے کو حدیث نبوی صلعم میں صبر کا مہینہ کہا گیا ہے۔ اللہ کے حکم پر بندہ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ انسان کو زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کھانا پینا چھوڑنا پڑتا ہے بندہ رضائے الہٰی کے حصول کے لئے ہر وہ عمل کرتا ہے جو اللہ کے لئے قبول ہو اور ہر اس عمل سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ دراصل روزہ محبت الٰہی کا ایک بڑا نشان ہے۔ خوش نصیب ہے وہ بندہ، جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اللہ کے پسندیدہ اعمال کو بخوشی بجالانے میں مستعدِ عمل ہو۔ شدید بھوک و پیاس میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں جب بندہ سربسجود ہو کر دعائیں مانگتا ہے۔ تو مالکِ حقیقی اپنے بندہ کی دعاؤں کو سنتا ہے قبول کرتا ہے روزہ عاجز بندہ کی فریاد قادر مطلق کی بارگاہِ عالی میں پہنچانے کا ایک بڑا ذریعہ بھی ہے۔ رمضان شریف کے متبرک مہینے میں بندہ اللہ کی رضا جوئی کے لئے روزے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو بجالاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے خوش ہو جاتا ہے اور جب مالک اپنے بندہ سے خوش ہو جائے تو پھر اس بندہ کی خوش قسمتی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ اس مبارک مہینے میں قرآن پاک کا نزول ہوا اسی مبارک مہینے میں بندہ اللہ کی خوشنودی و حکم کی خاطر اپنی نیک کمائی میں سے بمد زکوٰۃ غریب و نادار یتیم، محتاج و بیوہ لاچار عزیز واقارب اور مستحق پڑوسیوں کی امداد و اعانت کرتا ہے۔ تراویح میں قرآن پاک سننا اور سنانا یہ سب نیک اعمال دراصل بندہ کی ہی بہتری کے لئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسے بندہ کو کر نیکی تاکید کر کے اس پر اپنی خوشی و رضا بتا کر بندۂ ناچیز پر وہ زبردست احسان کیا ہے جس پر بندہ کو بارگاہِ عالی کا شکر بجالانا چاہیئے۔

۹۴-۱۹۹۳ء کا سالانہ بجٹ وزیر مالیات جناب منموہن سنگھ نے پارلیمنٹ میں پیش کر دیا

ہے سرسری نگاہ ڈالنے سے مذکورہ بجٹ کی خامیوں کے باوجود عام لوگوں کی ضروریات کے موافق ہی دکھائی دے رہا ہے، روزمرہ استعمال کی چیزوں پر ٹیکس میں چھوٹ دی گئی ہے جس سے کسی قدر مہنگائی میں کمی ہی ہوگی۔ چنانچہ اس کے اثرات بھی ہونے لگے ہیں تیل، گھی دالیں کسی قدر سستی ہوگئی ہیں۔ بجٹ میں انکم ٹیکس کی حد بڑھادی گئی ہے۔ حزب اختلاف نے بھی بجٹ کو اگر مگر کے ساتھ اچھا ہی کہا ہے۔ بجٹ میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لئے حوصلہ کن مراعاتیں ہیں۔ کسانوں کے لئے اس بجٹ میں خاص خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن پورے بجٹ میں بیروزگاری جیسے مسئلے سے جس طرح ان دیکھی کی گئی ہے وہ کوئی اچھی بات نہیں ہے ہندوستان میں بیروزگاری جس طرح بڑھ رہی ہے اچھا ہوتا اگر وزیر مالیات اس طرف بھی زیادہ دھیان مرکوز کرتے چھوٹے اور درمیانہ طبقے کے لئے بجٹ میں کوئی خاص خوشخبری نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا جس طرح استقبال کیا گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم بھی سنہ ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ کو ان خوش فہمیوں کے ساتھ کہ کبھی تو عام لوگوں کی ضروریات کا خیال تو رکھا ہی جائے گا۔ عوام الناس کے لئے راحت رسانی کا کسی حد تک بجٹ کہنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے ہیں۔ ریل بجٹ میں مال بھاڑہ، پلیٹ فارم ٹکٹ اور سیزن ٹکٹ کے کرایوں اور کوئلے کی سپلائی پر سرچارج میں اضافہ ڈیزل پر رعایت کے خاتمہ سے عام بجٹ کی افادیت عام لوگ محسوس نہیں کرسکیں گے۔ ایسا ہمارا خیال ہے۔

اگر ۶ دسمبر سنہ ۱۹۹۲ء ہندوستان کی تاریخ میں سیاہ ترین دن کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا تو ۲۵ فروری سنہ ۱۹۹۳ء کا دن ہندوستان کی تاریخ میں یادگار دن مانا جائے گا، ۶ دسمبر سنہ ۱۹۹۲ء کو فرقہ پرستوں کی منمانی چلی، یوپی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی صوبائی سرکار اور مرکز میں کانگریس حکومت کی موجودگی میں ایودھیا میں جس طرح آئین کی دھجیاں اڑائی گئیں اور صوبائی حکومت یوپی کی سپریم کورٹ کو حلفیہ یقین دہانی کے باوجود بابری مسجد کو فرقہ پرستوں زیادہ صحیح فسطائی طاقتوں کے ذریعہ آناً فاناً شہید کیا گیا اس پر سیکولر طاقتیں یا تنظیمیں جتنا بھی ماتم کریں کم ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر جس منظم اور خفیہ پلان کے تحت ان فسطائی طاقتوں نے ہندوستان کے باوقار قانون کی مٹی پلید کی اسے ہم سیکولر تنظیموں وجماعتوں کی پسپائی تو نہیں کہیں گے بلکہ ان کی لاپرواہی سے

تعبیر کئے بغیر نہ رہیں گے۔ ۲۵ فروری ۱۹۹۳ء کو بھارتیہ جنتا پارٹی کی ریلی پر حکومت ہند کی طرف سے پابندی لگائی گئی اس کی تائید تمام ہی سیکولر ذہن کے افراد نے کی۔ پابندی کے باوجود بی جے پی کا ریلی کرنے پر سختی سے بضد رہنا اور پھر حکومت ہند کی طرف سے ریلی روکنے کے سخت ترین انتظامات جس منظم طریقے سے کئے گئے اور بالآخر ۲۵ فروری کی ریلی بے مثال ناکامی سے ہمکنار ہو کر رہی اس کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت نے جس طرح ریلی کو ناکام کرنے کے لئے تمام آئینی ذرائع استعمال کئے کیا ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کو اسی منظم اور تمام آئینی ذرائع کو بروئے کار لاکر مسماری سے نہیں بچایا جاسکتا تھا؟ جبکہ مرکزی حکومت کے پاس تمام خفیہ جانکاری حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ کیا اسے اپنے خفیہ ذرائع سے بابری مسجد کی کسی بھی وقت لاکھوں جنونی "کارسیوکوں" کے ذریعہ مسماری کے اندیشے سے باخبر نہیں کیا گیا تھا؟ اگر کیا گیا تھا تو یہ مرکزی حکومت کی مجرمانہ لاپرواہی کے زمرے میں آئے گا اور اگر باخبر نہیں کیا گیا تھا تو مرکزی حکومت کو اپنے خفیہ ذرائع کی کیسوں خامیوں اور ان میں فرقہ واریت کے جراثیم پیدا ہونے کی چھان بین کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جس آئین پر ہمارے ملک کے نظام کی بنیادیں کھڑی ہوئی ہیں جب وہ بنیاد ہی ڈھانے کی حرکتیں ہونے لگیں اور خفیہ ذرائع اسے نہ بھانپ سکیں تو اس کی ذمہ داری حکومت ہی پر آن پڑتی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ۲۵ فروری کی بھاجپا ریلی دراصل مرکزی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش کا حصہ تھی اس سلسلے میں امریکہ کے مشہور اخبار "نیو یارک ٹائمز" کے اداریئے پر بھی ایک نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اخبار مذکورہ نے اپنے اداریئے میں لکھا ہے "لاکھوں ہندو اندولن کاری ایک سرکاری پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نئی دہلی کی گلیوں سے پارلیمنٹ کی طرف کوچ کریں گے۔ کٹر پنتھیوں کے تشدد اور حالات سے بے خبر سرکار کے رویہ نے دنیا کے سب سے بڑے جمہور کو بربادی کے راستے پر کھڑا کر دیا ہے۔ ۴۵ برسوں سے جمہوریت اور سیکولرزم کے دو اصولوں نے بھارت کے مختلف فرقوں کو آپس میں جوڑ رکھا تھا لیکن اب لگتا ہے کہ یہ تانا بانا کمزور ہو کر ٹوٹ رہا ہے۔ اس کے نتائج بہت ہی بھیانک ہوں گے اس کا اثر نہ صرف بھارت بلکہ پورے برصغیر پر پڑے گا۔ افغانستان کے مسلم کٹر پنتھیوں سے لیکر سری لنکا کے بودھ راشٹر وادی بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ جمہوریت اور مساوات کا حامی امریکہ اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔ بھارت ایک ملک ہی نہیں بلکہ برصغیر

ہے یہاں کے ۹۰ کروڑ لوگ آپسی معاشرہ و تاریخ سے جڑے ہوئے ہیں لیکن ان کی زبان مذہب اور کلچر الگ الگ ہیں۔ آج بڑا خطرہ ہندو کٹر پنتھیوں والی بھاجپا اور کانگریس پارٹی کی کمزوری سے پیدا ہوا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی مضبوط ہو رہی ہے اسے امریکہ میں رہ رہے بھارتیوں سے بڑی تعداد میں اقتصادی مدد حاصل ہے۔ چاہے چناؤ ہوں یا اندولن بھاجپا کی جیت بھارت کے ساتھ ساتھ دنیا کے لئے بھی بُری خبر ہوگی۔" (ماخوذ روزنامہ "جاگرن" نئی دہلی ۲۶ر فروری ۹۳ء)

غیر ممالک میں ہندوستان کے حالات پر کتنی گہری نظر رکھی جارہی ہے یہ بات "نیویارک ٹائمز" کے مذکورہ بالا ایڈیٹوریل سے نمایاں ہوگئی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھارت کی سیکولر جماعتیں بھاجپا کے اس فرقہ وارانہ چیلنج کا مقابلہ اسی ڈھیلے ڈھالے ڈھنگ سے کرتی رہیں جسطرح ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء تک کرتی رہی ہیں یا اسی منظم طریقہ سے متحد ہو کر کرنے پر آمادہ ہیں جس منظم طریقہ سے فرقہ پرست تنظیم ہندوستانی آئین کی بنیاد کو ڈھانے کے لئے کررہی ہیں؟ یہ لمحہ فکریہ ہے اور اس پر ہر اس محب وطن کو غور و فکر کرنا ہوگا جسے ہندوستان کے آئین ہندوستان کے اتحاد و اتفاق اور شاندار اصولوں و روایات سے پیار و محبت ہے۔ اور جنھیں ہندوستان کی آزادی ہی سب سے زیادہ عزیز ہے ـــــ ۲۵ر فروری کی ریلی کو حکومت ہند کی طرف سے تمام آئینی ذریعوں کے ذریعہ جس طرح ناکام بنایا گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ حکومت ہند ان فسطائی طاقتوں کی فرقہ وارانہ حرکات و سکنات، ان کی طرف سے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں میں خوف و دہشت پھیلانے کی مذموم و ناپاک کوششوں کو نہ صرف ناکام و نامراد کرے گی بلکہ تمام جائز ذرائع کو عمل میں لاکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کچل دیگی۔ نیت ثابت منزل آسان۔

فسطائی طاقتیں بزدل ہوتی ہیں انھیں جب یہ یقین ہوجائے گا کہ ہماری ان ناپاک حرکات کی ہندوستان میں کسی بھی طرح پذیرائی نہیں ہے تو یہ خود بخود برساتی مینڈکوں کی طرح غارت و تباہ و برباد ہو جائیں گی۔

مہر کا فلسفہ اور اسکے احکام

از: مولانا شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور

قسط نمبر ۲

ازواجِ مطہرات کا مہر:

آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ تھا۔ اور جیسا کہ تفصیل گزر چکی ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے ساڑھے بارہ اوقیہ کا مطلب ہوا پانچ سو درہم۔ یعنی موجودہ حساب سے تقریباً سوا کلو چاندی جس کی قیمت آجکل نو ہزار روپیوں کے قریب بنتی ہے۔

کان صداقہ لازواجہ ثنتی عشرۃ اوقیۃً ونشاً: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ تھا[۱۱۶]

اس باب میں صرف حضرت ام حبیبہؓ کا استثناء ہے، جن کا مہر چار ہزار درہم تھا۔ لیکن اسے حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے اپنی طرف سے ادا کیا تھا۔

عن ام حبیبۃ انہا کانت تحت عبید اللہ بن جحش، فمات بارض الحبشۃ فزوجہا النجاشی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامہرہا عنہ اربعۃ آلاف وبعث بہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع شرحبیل بن حسنۃ:

---

[۱۱۶] مسلم ۲/۱۰۴۲، ابوداؤد ۲/۵۸۲، مستدرک حاکم ۲/۱۸۱، نسائی ۶/۱۱۷، ابن ماجہ ۱/۶۰۷، دارمی ۲/۱۴۱، السنن کبریٰ ۷/۲۳۴۔

حضرت ام حبیبہ سے روایت ہے کہ وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں آنے سے پہلے) [ع]بید اللہ کی منکوحہ تھیں، جن کا سرزمین حبشہ میں (ہجرت کے موقع پر) انتقال ہوگیا تو ان کا نکاح نجاشی [شاہ] حبشہ کے عیسائی بادشاہ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کردیا اور انہیں بطور مہر چار ہزار درہم اپنی [ط]رف سے ادا کئے۔ پھر انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شرجیل بن حسنہ کے ساتھ (مدینہ منورہ) [بھ]یجدیا۔[117]

ما اصدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احداً من نسائہ ولا بناتہ فوق اثنی عشر وقیۃ الا ام حبیبۃ، فان النجاشی زوجہ ایاھا واصدقھا اربعۃ آلاف ونقد عنہ:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں اور صاحبزادیوں میں [س]ے کسی کا مہر بھی بارہ اُوقیہ سے زیادہ نہیں باندھا سوائے ام حبیبہؓ کے۔ کیونکہ نجاشی نے ان کا [ن]کاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرکے چار ہزار (درہم) اپنی طرف سے نقد ادا کر دیئے تھے۔[118]

حضرت علیؓ نے حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے مہر میں ایک زرہ دی تھی جس کی قیمت چار سو درہم تھی۔

ما ثمنھا الا اربع مائۃ درھم: جس کی قیمت صرف چار سو درہم تھی۔[119]

مگر بعض روایات کے مطابق اس زرہ کی قیمت چار سو اسی (۴۸۰) درہم تھی۔[120]

یہ ایک معیاری مہر ہے جو متوسط اور خوشحال طبقے کے لئے قابل عمل ہوسکتا ہے۔ مگر اس سلسلے [م]یں کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ مہر میں ایک تو شوہر کی مالی واقتصادی حالت کا بھی اعتبار [ک]رنا پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ طرفین جتنے پر بھی راضی ہوجائیں وہ صحیح ہوجائے گا۔

---

[117] ابوداؤد نکاح ۲/۵۸۳، نسائی نکاح ۶/۱۱۹، مستدرک نکاح ۲/۱۸۱
الفتح الربانی نکاح ۱۶/۱۷۰، جامع الأصول ۱۱/۴۱۳۔

[118] سنن کبریٰ کتاب النکاح، از بیہقی: ۷/۲۳۴

[119] سنن کبریٰ: ۷/۲۳۵، نیز ملاحظہ ہو مجمع الزوائد: ۴/۲۸۳

[120] ابوداؤد ۲/۵۸۳، ترمذی ۳/۴۲۳، نسائی ۶/۱۱۷۔

زیادہ مہر کی کوئی حد نہیں!

شریعت نے اگرچہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ مگر پھر بھی بہت زیادہ مہر مقرر کرنا کسی کے لئے فخر کی بات نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! عورتوں کے مہر میں مبالغہ مت کرو۔ کیونکہ اگر یہ چیز دنیوی اعتبار سے قابل فخر یا تقویٰ کی کوئی بات ہوتی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہوتے۔ جبکہ آپ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ اور کسی بھی صاحبزادی کا مہر چار سو اسّی درہم سے زیادہ مقرر نہیں کیا۔[۱۲۱]

اسی طرح ایک اور مرتبہ حضرت عمرؓ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ لوگو! تم عورتوں کے مہر میں مبالغہ مت کرو۔ پھر فرمایا کہ دیکھو اگر مجھے تمہارے بارے میں ایسی کوئی اطلاع ملے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مہر باندھا ہے تو میں زائد رقم اس سے لیکر بیت المال میں داخل کردوں گا۔ اس پر قریش کی ایک خاتون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اے امیرالمؤمنین! اللہ کی کتاب زیادہ قابل اتباع ہے یا آپ کا قول؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب ہی زیادہ قابلِ اتباع ہے مگر وہ بات کیا ہے؟ اس پر اس خاتون نے کہا کہ ابھی آپ عورتوں کے مہر میں مبالغہ نہ کرنے کی بات کہہ رہے تھے، جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا: اور تم ان میں سے کسی ایک کو ایک ڈھیر سا مال بھی اگر دے چکے ہو تو (طلاق کی صورت میں) اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو۔ (نساء: ۲۰)

(اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ عورت کو مہر میں یا تحفے کے طور پر ایک ڈھیر سا مال دینا بھی جائز ہے۔) تو اس پر حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی کا صاف صاف اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ) ہر ایک عمر سے زیادہ فقیہہ (سمجھدار) ہے۔ اس بات کو آپ نے دو تین مرتبہ دہرایا۔ پھر آپ منبر سے نیچے اُتر آئے اور لوگوں سے فرمایا کہ میں نے تم کو عورتوں کا مہر بہت زیادہ باندھنے سے منع کیا تھا

---

[۱۲۱] ابوداؤد ۲/۵۸۳، ترمذی ۳/۴۲۳، نسائی ۶/۱۱۷۔

تو اب سمجھ لو کہ اب ہر شخص اس معاملہ میں آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔[122]

ایک اور مرتبہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ میں اس ارادہ سے نکلا تھا کہ تم لوگوں کو مہر کی زیادتی سے منع کروں، یہاں تک کہ یہ آیت (اوپر مذکور شدہ) میرے سامنے آگئی۔ (تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے)[123]

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کے دور میں ملک فارس و عراق اور شام و مصر کی فتوحات کے باعث مسلمان بہت مالدار ہو گئے تھے اور ان کا غربت و افلاس ختم ہو گیا تھا اس لئے وہ اظہار امارت کے طور پر عورتوں کے مہر بھی بہت زیادہ باندھنے لگ گئے تھے۔ جیسا کہ بعض روایات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

ابن سیرینؒ (تابعی) سے مروی ہے کہ امام حسنؓ نے ایک عورت سے نکاح کیا تو انکے پاس سو لونڈیاں بھیجیں اور ہر لونڈی کے ہمراہ ایک ہزار درہم تھے۔[124]

حضرت انس بن مالکؓ نے ایک عورت سے بیس ہزار (درہم) کے عوض نکاح کیا۔[125]

اور علامہ عینیؒ نے ابوالفرج اموی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ مصعب بن زبیر نے عائشہ بنت طلحہ سے دس لاکھ درہم کے عوض نکاح کیا۔ اور خود حضرت عمرؓ نے ام کلثوم بنت علیؓ و بطور مہر چالیس ہزار (درہم) ادا کئے۔[126]

حاصل بحث یہ کہ اسلامی شریعت نے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں

---

[122] سنن سعید بن منصور ۱/۱۵۳، سنن کبریٰ ۷/۲۳۳، ابویعلی، مجمع الزوائد ۴/۲۸۴۔

[123] سنن کبریٰ ۷/۲۳۳، سنن سعید بن منصور ۱/۱۵۳-۱۵۴۔

[124] رواہ الطبرانی و رجالہ رجال الصحیح، مجمع الزوائد ۴/۲۸۴۔

[125] سنن کبریٰ از بیہقی، کتاب النکاح، ۷/۲۳۳۔

[126] دیکھئے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری از بدرالدین عینی: ۲۰/۱۳۷۔

کی۔ بلکہ یہ بات مردوں کی مالی واقتصادی حالت پر منحصر ہے۔ اور طرفین کو اختیار ہے کہ
وہ اپنے حالات کے مطابق اسے آپس کی رضامندی سے طے کریں۔ مگر ایسا کوئی بھی مہر جو مرد
کی مالی واقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی طاقت واستطاعت سے باہر ہو سخت
ناپسندیدہ ہے۔ کیونکہ اسے ادا نہ کرسکنے کی صورت میں مرد گنہگار ہوگا۔ شریعت میں اگرچہ
مہر تاخیر سے ادا کرنے کی بھی اجازت موجود ہے مگر زیادہ بہتر اور پسندیدہ طریقہ یہ ہے
کہ عورت کا مہر شبِ زفاف یعنی وصال سے پہلے ہی ادا کر دیا جائے اور بعض حدیثوں میں تاکید
ہے کہ عورتوں سے لطف صحبت اپنے بہترین اموال کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔

اِسْتَحِلُّوْا فُرُوْجَ النِّسَاءِ بِاَطْيَبِ اَمْوَالِكُمْ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ تم عورتوں کی شرمگاہوں کو اپنے بہترین مال کے ذریعہ حلال کرو۔[۱۲۷]

مہر پیشگی ادا کرنے کی تاکید:

مہر کی دو قسمیں ہیں: (۱) مہر مُعجّل، یعنی پیشگی ادا کیا جانے والا۔ (۲) اور مہر مؤجّل، یعنی
کچھ مہلت اور تاخیر کے ساتھ ادا کیا جانے والا۔ مگر اس کی مدت متعین ہونی چاہیئے یعنی نکاح
کے وقت اس کی صراحت ہونی چاہیئے کہ مہر مُعجّل ہے یا مؤجّل؟ اور اگر مؤجل ہے تو وہ کتنی
مدت میں ادا کیا جائے گا؟ یہ نہیں کہ بغیر صراحت کے مہر تو باندھ لیا مگر ادائیگی کی نوبت ہی نہ
آئی۔ ایسا کرنا اسلامی قانون کی رو سے سخت گناہ کی بات ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بات کا بہت
زیادہ اہتمام فرمایا کرتے تھے کہ عورت کا مہر جہاں تک ہو سکے نکاح کے موقع پر پیشگی ادا
ادا کر دیا جائے۔ کیونکہ مہر اصلاً عورت کی فرج کو حلال کئے جانے کا صلہ ہے، جیسا کہ اس پر
تفصیلی بحث پچھلے صفحات میں گذر چکی۔ چنانچہ اس سلسلے میں چند تاکیدی حدیثیں ملاحظہ

---

۱۲۷ رواہ الدارقطنی ... [illegible]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کا نکاح کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ مہر میں دینے کے لئے تمہارے پاس کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے اس پر آپ نے فرمایا:

اذهب فاطلب ولو خاتما من حديد: جاؤ اور کچھ تلاش کرو اگرچہ وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔[128]

عن ابن عبّاس قال: لما تزوّج علی فاطمة قال رسول الله صلی الله علیه وسلّم اعطها شیئاً۔ قال ما عندی شئ۔ قال: این درعك الحطمیّة؟

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے نکاح کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فاطمہ کو (بطور مہر) کوئی چیز دو۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری حُطمی زرہ کیا ہوئی؟[129]

ایک دوسری روایت میں اس پر اتنا اضافہ اور ہے:

فاین درعك الحطمیّة التی اعطیتك یوم کذا وکذا؟ قال هی عندی قال فاعطها ایاه: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ وہ حطمی زرہ کیا ہوئی جو میں نے تمہیں فلاں دن دی تھی؟ حضرت علیؓ نے کہا کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ فاطمہ کو وہی (بطور مہر) دے دو۔[130]

فقومت الدرع اربع مائة وثمانین درهماً: اس زرہ کی قیمت کا اندازہ چار سو اسی درہم لگایا گیا[131]

---

[128] بخاری کتاب النکاح: ۶/۱۳۸۔

[129] ابوداؤد کتاب النکاح: ۲/۵۹۶، بلوغ المرام ص ۲۱۵۔

[130] الفتح الربانی (ترتیب مسند احمد) ۱۶/۱۷۴، سنن سعید بن منصور ۱/۱۵۴۔

[131] رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر: مجمع الزوائد ۴/۲۸۳۔

اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ کا مسلک یہ تھا کہ وہ منکوحہ عورت کو بطور پیشگی کچھ مہر دیئے بغیر اس سے صحبت کرنا مکروہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ اس مسئلہ میں آپ سے مروی ہے:

عن ابن عباس انہ یکرہ ان یدخل بامراتہ حتی یعطیھا شیئاً: حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ کوئی شخص اپنی منکوحہ کو کوئی چیز دیئے بغیر اس سے صحبت کرے۔[۱۳۲]

عن ابن عباس انہ سئل عن رجل تزوج امراۃ فرض لھا، ھل لہ ان یدخل بھا ولم یعطھا شیئاً: قال لا یدخل بھا حتی یعطیھا ولو نعلیہ:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ سے ایسے شخص کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا جس نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس کا مہر بھی مقرر کر دیا۔ تو کیا وہ اسے کوئی چیز (مہر کا کچھ حصہ) دیئے بغیر اس سے مجامعت کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اسے کچھ نہ کچھ نہ دے دے، اگرچہ اپنی جوتیاں ہی سہی۔[۱۳۳] اور اس سلسلہ میں بعض تابعین اتنی سختی برتتے تھے کہ مہر دیئے بغیر عورت کو چھونا بھی جائز نہیں تصور کرتے تھے۔ فلا یستھا حتی یرسل الیھا بصداق او فریضۃ: جب تک کہ شوہر مہر نہ دیدے بیوی کو چھو نہیں سکتا۔[۱۳۴]

ان روایات کا لحاظ کرتے ہوئے مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی عورتوں کا پورا مہر یا اس کا کچھ حصہ پیشگی ادا کر دیا کریں۔ اور مہر مؤجل (تاخیر سے ادا کیا جانے والا) ہر ممکن طریقے سے اسے جلد سے جلد ادا کر کے اپنے شرعی فرض سے عہدہ برآ ہو جائیں۔ مگر آجکل اس سلسلے میں حد درجہ کوتاہی برتتے ہوئے غیر ضروری رسوم میں خوب روپیہ لٹایا جاتا ہے مگر ایک فرض کی ادائیگی میں غفلت برتی جاتی ہے۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے کہ غیر شرعی رسوم

---

[۱۳۲] سنن سعید بن منصور: ۱/ ۱۸۹

[۱۳۳] ابن جریر، منقول کنز العمال: ۱۶/ ۵۴۰

[۱۳۴] مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۱۸۱

وخرافات کو ترک کر کے پہلے فرائض و واجبات کی ادائیگی پر زور دیا جائے۔

عورت جب چاہے مہر طلب کر سکتی ہے!

واضح رہے مہر معجل (وہ مہر جو فوری طور پر ادا کیا جانا طے ہوا ہو) اگر ادا نہ کیا جائے یا اسکی مدت بھی مقرر نہ ہو تو عورت کو اختیار رہے گا کہ وہ شوہر سے جب چاہے اپنے مہر کا مطالبہ کرے۔ اور اسے یہ بھی اختیار رہے گا کہ وہ اپنا مہر حاصل کئے بغیر اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کرنے سے انکار کر دے۔ مگر اس صورت میں شوہر ناراض ہو کر یا طیش میں آ کر اس کا نفقہ (خرچہ) بند نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نفقہ کا مہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ نفقہ صرف عورت کی نافرمانی کیوجہ سے بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عورت کو اپنے مہر کا مطالبہ کرنا نافرمانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ مہر عورت کا وہ حق ہے جسے شریعت نے اس کے تحفظ کی خاطر مقرر کیا ہے۔ اس لحاظ سے مسئلۂ ہذا میں وہ صرف اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہے نہ کہ شوہر کی نافرمانی۔ چنانچہ اس مسئلہ میں فقہا نے صراحت کی ہے کہ:

"شوہر اگر مہر ادا کر دے تو وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر لے جا سکتا ہے۔ اگر عورت اپنے پورے مہر کا مطالبہ کرتے ہوئے اپنے گھر میں رک جائے تب بھی وہ نفقہ کی مستحق ہو گی کیونکہ وہ اپنے حق کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔" [135]

اور صاحب ہدایہ تحریر کرتے ہیں:

وَاِنِ امْتَنَعَتْ مِنْ تَسْلِيْمِ نَفْسِهَا حَتّٰى يُعْطِيَهَا مَهْرَهَا فَلَهَا النَّفَقَةُ؛ اگر بیوی اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کرنے سے روک لے، جب تک کہ وہ اس کا مہر ادا نہ کر دے تو وہ نفقہ کی مستحق رہے گی۔ [136]

---

[135] کتاب النفقات از خصاف، مطبوعہ حیدر آباد۔

[136] ہدایہ اولین باب النفقہ، ص ۴۱۷، مطبوعہ دہلی۔

اس کی مزید وضاحت دُرّ مختار میں اس طرح ملتی ہے کہ عورت کو حق حاصل رہتا ہے کہ وہ اپنا مہر وصول کرنے تک شوہر کو جنسی تعلق اور بوس وکنار سے بھی روکے اور اس کے ساتھ سفر کرنے سے بھی انکار کردے۔

ونها منعه من الوطی و دواعیه والسفر بها۔[۱۳۷]

اور اگر شوہر مہر معجّل (فوری طور پر ادا کیا جانے والا) ادا نہ کرے تو اس کے حاصل ہونے تک عورت کو اپنے اعزّہ سے ملنے کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی جانے کا حق حاصل رہے گا۔

ولها زیارة اهلها بلا اذنه مالم تقبضه ای المعجّل۔[۱۳۸]

مہر کے تذکرہ کے بغیر بھی نکاح صحیح ؛

اوپر جو مسائل بیان کئے گئے وہ مہر پہلے سے مقرر کئے جانے کے سلسلے میں تھے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ اگر کسی نے مہر مقرر کئے بغیر یا اس کا تذکرہ کئے بغیر نکاح کر لیا تو اس سے نکاح پر کیا اثر پڑے گا؟ آیا مہر اس صورت میں ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟ تو اس مسئلہ میں از روئے قرآن اگر کسی نے مہر مقرر کئے بغیر بھی نکاح کر لیا تو اس صورت میں نکاح تو صحیح ہو جائے گا (البقرہ:۲۳۶) مگر اس سے مہر ساقط نہیں ہوگا بلکہ واجب رہے گا۔

کیونکہ نکاح کے لفظی معنی جوڑنے کے ہیں جو میاں بیوی کو جوڑنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس سلسلے میں جو شرعی دلائل موجود ہیں ان کی رو سے مہر واجب ہے، خواہ نکاح کے وقت اس کا تذکرہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔[۱۳۹]

اب اس مسئلہ میں تین صورتیں ہو جائیں گی، جن کی تفصیل اس طرح ہے :

---

[۱۳۷] درمختار برحاشیہ ردّ المحتار: ۲/۳۸۸، مطبوعہ کوئٹہ۔
[۱۳۸] ایضاً، ۲/۳۹۰
[۱۳۹] ماخوذ از ہدایہ مع فتح القدیر: ۳/۲۰۴، مطبوعہ پاکستان۔

(۱) اگر نکاح کے بعد خدانخواستہ کسی وجہ سے صحبت سے پہلے طلاق ہو جائے تو قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق اس صورت میں "متعۂ طلاق" یعنی طلاق کا تحفہ دینا پڑے گا۔ جیسا کہ حسبِ ذیل آیت سے اس کا حکم ثابت ہوتا ہے:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ۔

اور تم (کسی وجہ سے) عورتوں کو ہاتھ لگانے (یعنی صحبت کرنے) اور مہر ٹھہرانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کو کچھ تحفہ دو۔ امیر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق دے گا۔ (البقرہ: ۲۳۶)

اس صورت میں عورت کو تحفہ (متعۂ طلاق) دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایک جوڑا کپڑے (کرتہ، پائجامہ اور اوڑھنی) دے دیئے جائیں۔ جیسا کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت (عمرہ بنت الجون) کو بطور متعہ تین کپڑے عطا فرمائے تھے۔[۱۴۰]

(۲) اگر نکاح کے بعد عورت سے صحبت کی جا چکی ہو تو اس صورت میں پورا "مہر مثل" واجب ہو جائے گا۔ اور مہر مثل اس مہر کو کہتے ہیں جو عورت کے خاندان میں رائج ہو۔ خاص کر اس کی سگی یا چچازاد بہنوں یا پھوپھیوں کا جو مہر ہو۔

(۳) اگر مہر مقرر نہیں تھا اور نکاح کے بعد صحبت بھی نہیں ہوئی تھی کہ خاوند کا انتقال ہو گیا تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ اس کی تفصیل حدیثوں میں اس طرح آئی ہے:

عن عبد اللہ فی رجل تزوّج امرأۃً فمات عنہا ولم یدخل بہا ولم یفرض لہا (الصداق)۔ فقال: لہا الصداق کاملاً، وعلیہا العدّۃ، ولہا المیراث۔ فقال معقل بن سنان: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قضی بہ فی بروع بنتِ واشق:

---

۱۴۰ دیکھئے سنن ابن ماجہ باب متعۃ الطلاق: ۱/۶۵۷، دار الفکر بیروت۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ آپ نے ایک ایسے شخص کے بارے میں جس نے ایک عورت سے نکاح کیا تھا مگر اس سے صحبت نہیں کی تھی اور مہر بھی مقرر نہیں تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ یہ فیصلہ دیا کہ اس عورت کو پورا مہر (مثل) ملے گا۔ وہ عدت بھی گزارے گی اور اسے شوہر کے ترکے میں حصہ بھی ملے گا۔ اس پر معقل بن سنانؓ (ایک صحابی) نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بروع بنت واشق کے بارے میں اسی قسم کا فیصلہ کرتے ہوئے سنا ہے۔ [۱۴۱]

اور ایک روایت کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ منکوحہ عورت کو پیشگی کچھ دیئے بغیر شب زفاف منانا بھی جائز ہے (اگرچہ یہ چیز پسندیدہ ہے)

عن عائشۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم امرھا ان تدخل علی رجل امرأتہ قبل ان یعطیھا شیئاً:

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ ایک شخص کے پاس اُس کی بیوی کو (مہر میں پیشگی) کچھ دینے سے پہلے پہنچا دیں۔ [۱۴۲]

(باقی آئندہ)

---

[۱۴۱] ابوداؤد کتاب النکاح ۲/۵۸۸، ترمذی نکاح ۳/۴۵۰، نسائی نکاح ۶/۱۲۱
ابن ماجہ نکاح ۱/۶۰۹، مستدرک حاکم نکاح ۲/۱۸۰، مسند احمد ۴/۲۸۰۔

[۱۴۲] ابن ماجہ کتاب النکاح : ۱/۶۴۱۔

گوپال سنگھ

مترجم:۔ محمد عمر، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہر ایک سیاسی جماعت اور ہر ایک سلیم العقل اور ذی فہم فرد ہندوستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشمکش کے بارے میں پریشان ہے۔ پنجاب، کشمیر اور شمال مشرق وغیرہ کے ہنگامے پوری قوم کے لئے ہوّا بن گئے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی بھی اتنی ہی خطرناک ہے۔ ان کی آبادی تقریباً بارہ کروڑ ہے اور شڈول ٹرائبس اور شڈول کاسٹ کی مجموعی تعداد کے تقریباً برابر ہے۔

شڈول کاسٹ کی اس شکستہ حالی کے بارے میں قوم کو بروقت ہوشیار کر دیا گیا جو انسانوں سے کم درجے کی زندگی گذار رہے تھے۔ یہ کام گاندھی جی کی دور اندیشی اور ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر جیسے دلیر لوگوں کی وجہ سے عمل میں آیا جنہوں نے ان کی حمایت میں جی توڑ جد وجہد کی۔ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم سر رمزے میکڈونالڈ کا بھی ہمیں شکر گذار ہونا چاہیئے جس نے ۱۹۳۲ء کے اپنے کیونل اوارڈ کے ذریعے ہریجنوں کے لئے علیحٰدہ انتخاب کرنے کی اجازت دیدی۔ اس طرح اس نے انھیں ہندو مذہب کے مخصوص دھارے سے ہمیشہ کے لئے علیحٰدہ کر دیا۔

اگر ان حالات کو غالب رہنے دیا جاتا تو ایسا نہیں تھا کہ ہندو اکثریت کبھی بھی ہندوستان پر حکمرانی کرتی۔ بہرحال اس مسئلے کے بارے میں گاندھی جی کے مرن برت اور عوام کے دباؤ میں ڈاکٹر امبیڈکر کے آنے کی وجہ سے پونا کا تاریخی سمجھوتہ عمل میں آیا جس کی رو سے انکی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے قانون ساز اسمبلیوں میں ان کی نشستیں محفوظ کر دی گئیں اور ان کا انتخاب ملے جلے طریقہ پر ہونا تسلیم کر لیا گیا۔ اس طرح سے ایک ٹریجڈی کو رفع دفع کر دیا گیا۔

لیکن اس رعایت نے امتیازیت پیدا کر دی، کیونکہ اس کا اطلاق صرف ہندو اور سکھ ہریجنوں پر کیا

گیا، ان ہریجنوں کو نظرانداز کر دیا گیا۔ جنہوں نے عیسائیت، اسلام یا بدھ مذہب ہی کیوں نہ اختیار کر لیا تھا۔ بدھ مذہب قبول کرنے والوں کے لئے اب ترمیمات کی جارہی ہیں حالانکہ اب تک یہ نہیں معلوم ہے کہ عیسائیت قبول کرنے والوں کے بارے میں کیا ہونے والا ہے (اقلیتوں شڈول کاسٹ اور شڈول ٹرائبس اور کمزور فرقوں کے ہائی پاور کمیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے میں نے ان دونوں کے بارے میں پُرزور سفارش کی تھی۔ بہر حال میری وہ رپورٹ نہ ہی ابھی تک شائع ہوئی ہے اور نہ ہی اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا ہے حالانکہ بارہا اس کی مانگ کی گئی ہے اور احتجاج بھی کئے گئے ہیں)

لیکن مسلمان سرد مہری کے شکار ہیں۔ وہ نہ صرف تعلیم، صنعت و حرفت اور سرکاری نوکری میں پسماندہ ہیں بلکہ سماجی سطح پر بھی وہ ہریجنوں کی طرح برادری سے خارج ہیں۔ ان کی جانوں اور عزت کو نشانہ ہدف بنانا بہت آسان ہو گیا ہے۔" انہوں نے ایک مادر وطن کی مانگ کی۔ اور وہ انہیں مل گیا اب وہ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے ہیں؟" ان کے بارے میں اکثریت کا یہ عام جذبہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہر طرح کی کشمکش کی زیادتی انہیں بہت زیادہ غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔ بہت ہی معمولی اشتعال انگیزی سے خوں ریز فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو سکتے ہیں جن میں جانی اور مالی نقصانات ان کے (مسلمانوں) کے مقسوم میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے قدیم عبادت خانے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ تاریخ کو اس طرح مسخ کیا جارہا ہے اور اس پر اس طرح نظر ثانی کی جارہی ہے جو ان کے لئے نقصان رساں ہو۔ ہم ہی لوگ جو ہندوستان میں اپنی سیکولر ایک جمہوریت پر فخر کرتے ہیں ایک ایسی حکومت بنا رہے ہیں یا بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو مذہبی حکومت کے لگ بھگ ہے۔

ہر ایک غیر مذہبی جماعت اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ اس بات کو ختم ہونا چاہیئے لیکن ان میں سے ہر ایک جماعت اس بات سے اقتصادی اور سیاسی فائدہ بھی اٹھاتی رہتی ہے۔ وہ شخص جسے انتخابات میں ووٹ مانگنے پڑتے ہیں اسے اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنی چاہیئے تاہم وہ بڑی اقلیتوں کی حمایت کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ چاہے کوئی ہو وہ دوغلی رسن بازی کیسے کر سکتا ہے کردہ بازی اس کے مفاد میں ہو اور ساتھ ساتھ وہ فرقہ کی طاقتوں کے خلاف لڑ بھی سکتا ہو ہندوستانی سیاسی جماعتوں کی چالاکی اور خوش تدبیری ہی انہیں اس پیچیدگی سے باہر نکال سکتی ہے۔ بیشتر وہ دونوں حربے استعمال کرتے ہیں اور دونوں کو بے ترتیب اور

تجلک بنا دیتے ہیں۔

کیا اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟ کیا دنیا کی کسی بڑی پسماندہ قوم کی طرح کیا کوئی اقلیت ہمیشہ غیر محفوظ اور بےگانہ رہنا چاہے گی؟ مجھے یقین ہے کہ ہندوؤں کی خصوصیات ایسی بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتیں۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں ان کے برخلاف معاملہ کا جائزہ لینا چاہیئے کیونکہ یہ بات وہ عوام کے سامنے بڑے اعتماد سے ہمیشہ پیش کرتے ہیں۔

یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو یا اس سے بھی زیادہ برسوں تک اس ملک پر حکمرانی کی تھی اور انہوں نے غیر مسلموں پر ناقابلِ بیان مظالم توڑے تھے اور مجموعی طور پر سب لوگوں کو مسلمان بنالیا تھا۔ ان کے مندروں کو منہدم کر دیا تھا، ان کے گروؤں اور مذہبی پیشواؤں کو تہ تیغ کر ڈالا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ انہوں نے کبھی بھی انصاف نہیں کیا تھا۔ ان پر جزیہ لگایا گیا تھا اور چین اور عزت کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی انھیں کبھی بھی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کے سب کے سب مسلمان پہلے ہندو تھے اور وہ مشرف باسلام ہوئے تھے (ان میں بیشتر ہریجن تھے) اور نہ تو ان کے لئے ہندوؤں اور نہ ہی ہندوستان پر کبھی حکمرانی کرنے کا موقع تھا۔ افغانستان یا وسط ایشیا کے دوسرے مقامات سے آئے ہوئے پہلے افغان اور مابعد مغل ہمیں فتح کرنے کے لئے آئے اور ذات پات، مذہب اور ذاتی خواہشوں میں منقسم ہماری افواج کو شکست دینے کے بعد انہوں نے ہم پر حکمرانی کی۔ فاتح قوموں نے کبھی بھی ہندوستانی مسلمانوں کو حکمرانی میں شریک کار نہیں بنایا تھا۔ حالانکہ انہوں نے کئی ہندو راجپوتوں کو خاص مصاحب، سپہ سالار اور وزراء کے عہدے تفویض کئے تھے لیکن یہاں تک کہ اکبر کے عہد میں بھی ہمیں کوئی ایسا مسلمان نظر نہیں آتا جسے کوئی اہم عہدہ دیا گیا ہو۔ افغانوں اور مغلوں میں باہمی شادی بیاہ ممنوع تھے۔ نہ تو افغان اور نہ ہی مغل ایک دوسرے کو کسی اہم عہدے پر مقرر کرتے تھے۔ شمال کے سنی حکمرانوں نے جنوب کی شیعی حکومتوں کو فتح کرنے کے لئے ان پر حملے کئے۔ افغانوں نے افغانوں، مغلوں نے مغلوں اور بیٹوں نے اپنے باپ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں میں شاذ و نادر ہندو

گیا۔ ان ہریجنوں کو نظرانداز کردیا گیا۔ جنہوں نے عیسائیت، اسلام یا بدھ مذہب ہی کیوں نہ اختیار کرلیا تھا۔ بدھ مذہب قبول کرنے والوں کے لئے اب ترمیمات کی جارہی ہیں حالانکہ اب تک یہ نہیں معلوم ہے کہ عیسائیت قبول کرنے والوں کے بارے میں کیا ہونے والا ہے (اقلیتوں شڈول کاسٹ اور شڈول ٹرائبس اور کمزور فرقوں کے بائی پاور کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے میں نے ان دونوں کے بارے میں پُرزور سفارش کی تھی۔ بہرحال میری وہ رپورٹ نہ ہی ابھی تک شائع ہوئی ہے اور نہ ہی اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا ہے حالانکہ بارہا اس کی مانگ کی گئی ہے اور احتجاج بھی کئے گئے ہیں)

لیکن مسلمان سرد مہری کے شکار ہیں۔ وہ نہ صرف تعلیم، صنعت و حرفت اور سرکاری نوکری میں پسماندہ ہیں بلکہ سماجی سطح پر بھی وہ ہریجنوں کی طرح برادری سے خارج ہیں۔ ان کی جانوں اور عزت کو نشانۂ ہدف بنانا بہت آسان ہوگیا ہے" انہوں نے ایک مادر وطن کی مانگ کی۔ اور وہ انھیں مل گیا اب وہ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے ہیں؟" ان کے بارے میں اکثریت کا یہ عام جذبہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہر طرح کی کشمکش کی زیادتی انھیں بہت زیادہ غیر محفوظ بنادیتی ہے۔ بہت ہی معمولی اشتعال انگیزی سے خوں ریز فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوسکتے ہیں جن میں جانی اور مالی نقصانات ان کے (مسلمانوں) کے مقسوم میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے قدیم عبادت خانے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ تاریخ کو اس طرح مسخ کیا جارہا ہے اور اس پر اس طرح نظرثانی کی جارہی ہے جو انکے لئے نقصان رساں ہو۔ ہم ہی لوگ جو ہندوستان میں اپنی سیکولر ایک جمہوریت پر فخر کرتے ہیں ایک ایسی حکومت بنارہے ہیں یا بنانے کی کوشش کررہے ہیں جو مذہبی حکومت کے لگ بھگ ہے۔

ہر ایک غیر مذہبی جماعت اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ اس بات کو ختم ہونا چاہیئے لیکن ان میں سے ہر ایک جماعت اس بات سے اقتصادی اور سیاسی فائدہ بھی اٹھاتی رہتی ہے۔ وہ شخص جسے انتخابات میں ووٹ مانگنے پڑتے ہیں اسے اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنی چاہیئے تاہم وہ بڑی اقلیتوں کی حمایت کو نظرانداز نہیں کرسکتا ہے۔ چاہے کوئی ہو وہ دوغلی رسن بازی کیسے کرسکتا ہے گروہ بازی اس کے مفاد میں ہو اور ساتھ ساتھ وہ فرقہ کی طاقتوں کے خلاف لڑ بھی سکتا ہو ہندوستانی سیاسی جماعتوں کی چالاکی اور خوش تدبیری ہی انہیں اس پیچیدگی سے باہر نکال سکتی ہے۔ بیشتر وہ دونوں حربے استعمال کرتے ہیں اور دونوں کو بے ترتیب اور

گنجلک بنا دیتے ہیں۔

کیا اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟ کیا دنیا کی کسی بڑی پسماندہ قوم کی طرح کیا کوئی اقلیت ہمیشہ غیر محفوظ اور بیگانہ رہنا چاہے گی ہمیں یقین ہے کہ ہندؤوں کی خصوصیات ایسی بات کو کبھی گوارا نہیں کرسکتیں۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں ان کے برخلاف معاملہ کا جائزہ لینا چاہیئے کیونکہ یہ بات وہ عوام کے سامنے بڑے اعتماد سے ہمیشہ پیش کرتے ہیں۔

یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو یا اس سے بھی زیادہ برسوں تک اس ملک پر حکمرانی کی تھی اور انہوں نے غیر مسلموں پر ناقابل بیان مظالم توڑے تھے اور مجموعی طور پر سب لوگوں کو مسلمان بنالیا تھا۔ ان کے مندروں کو منہدم کردیا تھا، ان کے گروؤں اور مذہبی پیشواؤں کو تہ تیغ کر ڈالا تھا۔ ہندؤوں کے ساتھ انہوں نے کبھی بھی انصاف نہیں کیا تھا۔ ان پر جزیہ لگایا گیا تھا اور چین اور عزت کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی انھیں کبھی بھی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کے سب کے سب مسلمان پہلے ہندو تھے اور وہ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے (ان میں بیشتر ہریجن تھے) اور نہ تو ان کے لئے ہندؤوں اور نہ ہی ہندوستان پر کبھی حکمرانی کرنے کا موقع تھا۔ افغانستان یا وسط ایشیا کے دوسرے مقامات سے آئے ہوئے پہلے افغان اور مابعد مغل ہمیں فتح کرنے کے لئے آئے اور ذات پات، مذہب اور ذاتی خواہشوں میں منقسم ہماری افواج کو شکست دینے کے بعد انہوں نے ہم پر حکمرانی کی۔ فاتح قوموں نے کبھی بھی ہندوستانی مسلمانوں کو حکمرانی میں شریک کار نہیں بنایا تھا۔ حالانکہ انہوں نے کئی ہندو راجپوتوں کو خاص مصاحب، سپہ سالار اور وزراء کے عہدے تفویض کئے تھے لیکن یہاں تک کہ اکبر کے عہد میں بھی ہمیں کوئی ایسا مسلمان نظر نہیں آتا جسے کوئی اہم عہدہ دیا گیا ہو۔ افغانوں اور مغلوں میں باہمی شادی بیاہ ممنوع تھے۔ نہ تو افغان اور نہ ہی مغل ایک دوسرے کو کسی اہم عہدے پر مقرر کرتے تھے۔ شمال کے سنّی حکمرانوں نے جنوب کی شیعی حکومتوں کو فتح کرنے کے لیے ان پر حملے کئے۔ افغانوں نے افغانوں، مغلوں نے مغلوں اور بیٹوں نے اپنے باپوں سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں میں شاذ و نادر ہندو

... کرتے ہوئے مساوات کے تصورات کی وجہ سے اور زیادہ تر ان صوفیوں کے اثرات کی بنا پر تبدیل مذہب عمل میں آیا جو فی الواقع دیانت کے پیرو ہو گئے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر کسی وسیع طریقے پر طاقت کا استعمال کیا گیا ہوتا تو اس ملک کی آزادی کے موقع پر مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کی آبادی کے ایک چوتھائی کے برابر نہ ہوتی۔ جہاں تک یہ بات کہی جاتی ہے کہ غیر مسلموں پر بلا تخفیف متواتر مظالم ہوتے رہے تو ۱۸۵۷ء میں تقریباً سارے ہندوستان نے بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے کے نیچے کیوں برطانیہ کے خلاف جنگ کی؟ ان میں پوربی، مرہٹہ، راجپوت اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ کیا وہ مغلوں کے مظالم کو دائمی رکھنا چاہتے تھے؟۔ بابر کے علاوہ ہر ایک افغانی اور مغل بادشاہوں کو یہیں ہندوستان میں دفن کیا گیا۔ انہوں نے اپنے تمام خزانے یہیں خرچ کئے اور اختیار کردہ اس ملک میں دائمی سکونت اختیار کر لی۔ وہ فاتحین کی حیثیت سے یہاں آئے تھے لیکن وہ ہمارے شہریوں کی طرح یہاں رہتے تھے۔ ہندو مذہب کی اچھی باتوں کو اپنا کر ہندوستان میں اسلام کی شکل بالکل بدل گئی۔

مرہٹوں اور سکھوں نے بالخصوص مابعد کے مغل حکمرانوں کے خلاف کئی مرتبہ بغاوتیں کیں لیکن بالآخر ایران کے شیعہ سلطان نادر شاہ اور افغانستان کے سنی سلطان احمد شاہ ابدالی نے مغلیہ سلطنت کو برباد کر دیا۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد ایک معاوضہ کے صلے میں مرہٹوں نے کم سے کم سو برسوں تک مغل تخت کی حمایت کی اور انہوں نے راجپوتانہ اور بنگال کے ہندوؤں پر بڑی بے رحمی سے حملے کئے۔ درحقیقت یہ الفاظ ہندو اور ہندوستانی مسلمانوں نے ہمیں دیئے ہیں۔

ہماری تہذیب اور تمدن کی ترقی میں مسلمانوں نے جو اضافے کئے ہیں وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ ہماری زندگی کے لاینفک جزو بن گئے ہیں بالخصوص یہ مغل حکمراں ہی تھے جنہوں نے ہمیں اکھنڈ بھارت کا تصور دیا۔ اور افغانستان کو اس ملک کا ایک حصہ بنا لیا۔ انہوں نے سارے ملک پر حکومت کے لئے ایک طرز حکومت رائج کیا (افغان حکمراں شیر شاہ سوری نے گرانڈ ٹرنک سڑک بنوائی) اور اس ملک میں سیاسی استحکام قائم کیا اور مرکزی حکومت کے اعلیٰ

اقتدار کو قائم کیا اور مالگذاری کا ایک ایسا نظام مروج کیا جو رعایا کی فلاح و بہبود پر مبنی تھا۔ جرائم کا خاتمہ کر دیا اور مکمل امن وامان کی یقین دہانی کی۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہندوؤں کو نہ دربار ہی قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ صرف مسلمان ہی وہاں پیش ہوتے تھے۔ دیگر تمام معاملات پنچایتوں اور رسمی قانون کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ آرٹ اور فن تعمیر، فن موسیقی وادب کھانے پکانے کے طریقوں، لباسوں اور فرنیچر وغیرہ میں ان کے اضافوں کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔

مغلوں نے فارسی کو درباری زبان تسلیم کرلیا اور انہوں نے اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ ترکی یا ان کی مذہبی کتابوں کی زبان عربی کو درباری زبان کی حیثیت دی جائے۔ انہوں نے ایک عام بولی کو جنم دیا جو ہندی قواعد پر مبنی تھی اور اسے اردو کے نام سے موسوم کیا جو ہندوستان میں آجکل تہذیب کے اظہار کے لئے بہترین زبان ہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے ایک مشترکہ مذہب دین الٰہی قائم کیا اور بڑی حد تک صوفی و یدانت کے پیرو ہو گئے۔ توحید کے تصور سے ہندو آشنا نہ تھے لیکن اس بات پر اسلام کے بھر پور زور نے ہمیں بنی نوع انسان اور دنیا کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ بابائے ہندوستانی قومیت گرونانک نے افغانوں کے آخری اور مغلوں کے ابتدائی زمانے میں عدم تفریق کے اپنے عقیدوں کی اشاعت کی لیکن نہ تو انہیں ستایا گیا اور نہ ہی انھیں چیلنج کیا گیا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مندروں کی بے حرمتی کی گئی انھیں مسمار کیا گیا لیکن شمال اور جنوب میں ہمارے قدیم ترین مندر آج بھی برقرار ہیں۔

یہاں تک کہ اورنگ زیب کے ایک فرمان میں جس کی نمائش بنارس ہندو یونیورسٹی کے میوزیم میں کی جاتی ہے، واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ: "جبکہ کسی نئے مندر کی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے، (لیکن) کسی قدیم مندر کو مسمار نہ کیا جائے۔" لہٰذا آج یہ بات کہنا کہ اجودھیا، بنارس اور متھرا کی ان تینوں مسجدوں کو فرقہ وارانہ یکجہتی کے لئے واپس کر دیا جائے۔ ہمارے سیکولر دستور اور قانون کی بیخ کنی کرنے کے مترادف ہے۔

ہاں، پاکستان ہے جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ اسے ہندوستانی مسلمانوں نے بنایا تھا جنہیں

شریک کئے گئے تھے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں ذات پات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے مساوات کے تصورات
وجہ سے اور زیادہ تر ان صوفیوں کے اثرات کی بنا پر تبدیل مذہب عمل میں آیا جو فی الواقع
زیدانت کے پیرو ہو گئے تھے ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر کسی وسیع طریقے پر طاقت
استعمال کیا گیا ہوتا تو اس ملک کی آزادی کے موقع پر مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کی آبا
کے ایک چوتھائی سے برابر نہ ہوتی ۔ جہاں تک یہ بات کہی جاتی ہے کہ غیر مسلموں پر بلا تخف
متواتر مظالم ہوتے رہے تو ۱۸۵۷ء میں تقریباً سارے ہندوستان نے بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے
نیچے کیوں برطانیہ کے خلاف جنگ کی؟ ان میں پوربی، مرہٹے، راجپوت اور دوسرے لوگ تھ
تھے ۔! کیا وہ مغلوں کے مظالم کو دائمی رکھنا چاہتے تھے؟ ۔ بابر کے علاوہ ہر ایک افغانی اور مغ
بادشاہوں کو یہیں ہندوستان میں دفن کیا گیا ۔ انہوں نے اپنے تمام خزانے یہیں خرچ کئے
اختیار کردہ اس ملک میں دائمی سکونت اختیار کرلی ۔ وہ فاتحین کی حیثیت سے یہاں آئ
لیکن وہ ہمارے شہریوں کی طرح یہاں رہتے تھے ۔ ہندو مذہب کی اچھی باتوں کو اپنا
ہندوستان میں اسلام کی شکل بالکل بدل گئی ۔

مرہٹوں اور سکھوں نے بالخصوص مابعد کے مغل حکمرانوں کے خلاف کئی مرتبہ بغاوتی
لیکن بالآخر ایران کے شیعہ مسلمان نادر شاہ اور افغانستان کے سنی مسلمان احمد شاہ اب
مغلیہ سلطنت کو برباد کر دیا ۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد ایک معاہدہ کے سلسلے میں مرہٹ
کم سے کم سو برسوں تک مغل تخت کی حمایت کی اور انہوں نے راجپوتانہ اور بنگال کے
پر بڑی بے رحمی سے حملے کئے ۔ درحقیقت یہ الفاظ ہندو اور ہندوستانی مسلمانوں نے ہمیں
ہماری تہذیب و تمدن کی ترقی میں مسلمانوں نے جو اضافے کئے ہیں وہ اس قدر ز
ہیں کہ ہماری زندگی کے لاینفک جزو بن گئے ہیں بالخصوص یہ مغل حکمران ہی تھے جنہوں
ہمیں اکھنڈ بھارت کا تصور دیا ۔ اور افغانستان کو اس ملک کا ایک حصہ بنالیا ۔ انہوں
ملک پر حکومت کے لئے ایک طرز حکومت رائج کیا (افغان حکمران شیر شاہ سوری نے
ٹرنک سڑک بنوائی) اور اس ملک میں سیاسی استحکام قائم کیا اور مرکزی حکومت کے

اقتدار کو قائم کیا اور مالگذاری کا ایک ایسا نظام مروّج کیا جو رعایا کی فلاح وبہبود پر مبنی تھا۔ جرم کا خاتمہ کر دیا اور مکمل امن وامان کی یقین دہانی کی۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہندوؤں کو شاذونادر ہی قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ صرف مسلمان ہی وہاں پیش ہوتے تھے۔ دوسرے تمام معاملات پنچایتوں اور رسمی قانون کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ آرٹ اور فن تعمیر، فن موسیقی وآداب، کھانے پکانے کے طریقوں، لباسوں اور فرنیچر وغیرہ میں ان کے اضافوں کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔

مغلوں نے فارسی کو درباری زبان تسلیم کر لیا اور انہوں نے اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ ترکی یا ان کی مذہبی کتابوں کی زبان عربی کو درباری زبان کی حیثیت دی جائے۔ انہوں نے ایک عام بولی کو جنم دیا جو ہندی قواعد پر مبنی تھی اور اسے اردو کے نام سے موسوم کیا جو ہندوستان میں ... تہذیب کے اظہار کے لئے بہترین زبان ہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے ایک مشترکہ مذہب دین الٰہی قائم کیا اور بڑی حد تک صوفی و بدانت کے پیرو ہو گئے۔ توحید کے تصور سے ہندو آشنا ... تھے لیکن اس بات پر اسلام کے بھرپور زور نے ہمیں بنی نوع انسان اور دنیا کے بارے میں ... نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ بابائے ہندوستانی قومیت گرونانک نے افغانوں کے ... ابتدائی زمانے میں عدم تفریق کے اپنے عقیدوں کی اشاعت کی لیکن نہ ... ہی انھیں چیلنج کیا گیا۔

... ہیں کہ ہمارے مندروں کی بے حرمتی کی گئی انھیں مسمار کیا گیا لیکن شمال اور جنوب میں ... مندر آج بھی برقرار ہیں۔

... اورنگ زیب کے ایک فرمان میں جس کی نمائش بنارس ہندو یونیورسٹی کے میوزیم میں ... جاتی ہے، واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ: "جبکہ کسی نئے مندر کی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے ... کسی قدیم مندر کو مسمار نہ کیا جائے۔" لہٰذا آج یہ بات کہنا کہ اجودھیا، بنارس ... مندروں کو فرقہ وارانہ یکجہتی کے لئے واپس کر دیا جائے۔ ہمارے سیکولر دستور ... کرنے کے مترادف ہے۔

... ہم سب دیکھتے ہیں۔ اسے ہندوستانی مسلمانوں نے بنایا تھا جنہیں

شریک کئے گئے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں ذات پات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے مساوات کے تصورات کی وجہ سے اور زیادہ تر ان صوفیوں کے اثرات کی بنا پر تبدیل مذہب عمل میں آیا جو فی الواقع ویدانت کے پیرو ہو گئے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر کسی وسیع طریقے پر طاقت کا استعمال کیا گیا ہوتا تو اس ملک کی آزادی کے موقع پر مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کی آبادی کے ایک چوتھائی کے برابر نہ ہوتی۔ جہاں تک یہ بات کہی جاتی ہے کہ غیر مسلموں پر بلا تخفیف متواتر مظالم ہوتے رہے تو ۱۸۵۷ء میں تقریباً سارے ہندوستان نے بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے کے نیچے کیوں برطانیہ کے خلاف جنگ کی؟ ان میں بلا ربلی امرہٹہ، راجپوت اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ کیا وہ مغلوں کے مظالم کو دائمی رکھنا چاہتے تھے؟۔ بابر کے علاوہ ہر ایک افغانی اور مغل بادشاہوں کو یہیں ہندوستان میں دفن کیا گیا۔ انہوں نے اپنے تمام خزانے یہیں خرچ کئے اور اختیار کردہ اس ملک میں دائمی سکونت اختیار کرلی۔ وہ فاتحین کی حیثیت سے یہاں آئے تھے لیکن وہ ہمارے شہریوں کی طرح یہاں رہتے تھے۔ ہندو مذہب کی اچھی باتوں کو اپنا کر ہندوستان میں اسلام کی شکل بالکل بدل گئی۔

مرہٹوں اور سکھوں نے بالخصوص مابعد کے مغل حکمرانوں کے خلاف کئی مرتبہ بغاوتیں کیں لیکن بالآخر ایران کے شیعہ مسلمان نادرشاہ اور افغانستان کے سنی مسلمان احمد شاہ ابدالی نے مغلیہ سلطنت کو برباد کر دیا۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد ایک معاوضہ کے صلے میں مرہٹوں نے کم سے کم سو برسوں تک مغل تخت کی حمایت کی اور انہوں نے راجپوتانہ اور بنگال کے ہندوؤں پر بڑی بے رحمی سے حملے کئے۔ درحقیقت یہ الفاظ ہندو اور ہندوستانی مسلمانوں نے ہمیں دیئے ہیں۔

ہماری تہذیب و تمدن کی ترقی میں مسلمانوں نے جو اضافے کئے ہیں وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ ہماری زندگی کے لاینفک جزو بن گئے ہیں بالخصوص یہ مغل حکمراں ہی تھے جنہوں نے ہمیں اکھنڈ بھارت کا تصور دیا۔ اور افغانستان کو اس ملک کا ایک حصہ بنالیا۔ انہوں نے سارے ملک پر حکومت کے لئے ایک طرز حکومت رائج کیا (افغان حکمراں شیرشاہ سوری نے گرانڈ ٹرنک سڑک بنوائی) اور اس ملک میں سیاسی استحکام قائم کیا اور مرکزی حکومت کے اعلیٰ

اقتدار کو قائم کیا اور مالگذاری کا ایک ایسا نظام مروج کیا جو رعایا کی فلاح و بہبود پر مبنی تھا۔ جرم کا خاتمہ کر دیا اور مکمل امن وامان کی یقین دہانی کی۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہندوؤں کو شاذ و نادر ہی قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ صرف مسلمان ہی وہاں پیش ہوتے تھے مذہبی تمام معاملات پنچایتوں اور رسمی قانون کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ آرٹ اور فن تعمیر، فن موسیقی و آداب کھانے پکانے کے طریقوں، لباسوں اور فرنیچر وغیرہ میں ان کے اضافوں کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔

مغلوں نے فارسی کو درباری زبان تسلیم کر لیا اور انہوں نے اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ ترکی یا ان کی مذہبی کتابوں کی زبان عربی کو درباری زبان کی حیثیت دی جائے۔ انہوں نے ایک عام بولی کو جنم دیا جو ہندی قواعد پر مبنی تھی اور اسے اردو کے نام سے موسوم کیا جو ہندوستان میں آجکل تہذیب کے اظہار کے لئے بہترین زبان ہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے ایک مشترکہ مذہب دین الہٰی قائم کیا اور بڑی حد تک صوفی و بدانتا کے پیرو ہوگئے۔ توحید کے تصور سے ہندو آشنا نہ تھے لیکن اس بات پر اسلام کے بھرپور زور نے ہمیں بنی نوع انسان اور دنیا کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ بابائے ہندوستانی قومیت گرونانک نے افغانوں کے آخری اور مغلوں کے ابتدائی زمانے میں عدم تفریق کے اپنے عقیدوں کی اشاعت کی لیکن نہ تو انہیں ستایا گیا اور نہ ہی انھیں چیلنج کیا گیا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مندروں کی بے حرمتی کی گئی انھیں مسمار کیا گیا لیکن شمال اور جنوب میں ہمارے قدیم ترین مندر آج بھی برقرار ہیں۔

یہاں تک کہ اورنگ زیب کے ایک فرمان میں جس کی نمائش بنارس ہندو یونیورسٹی کے میوزیم میں کی جاتی ہے، واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ: "جبکہ کسی نئے مندر کی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے، (لیکن) کسی قدیم مندر کو مسمار نہ کیا جائے۔" لہٰذا آج یہ بات کہنا کہ اجودھیا، بنارس اور متھرا کی ان تینوں مسجدوں کو فرقہ وارانہ یکجہتی کے لئے واپس کر دیا جائے۔ ہمارے سیکولر دستور اور قانون کی بیخ کنی کرنے کے مترادف ہے۔

ہاں۔ پاکستان ہے جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ اسے ہندوستانی مسلمانوں نے بنایا تھا جنہیں

شریک کئے گئے تھے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں ذات پات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے مساوات کے تصورات کی وجہ سے اور زیادہ تر ان صوفیوں کے اثرات کی بنا پر تبدیل مذہب عمل میں آیا جو فی الواقع ویدانت کے پیرو ہو گئے تھے ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر کسی وسیع طریقے پر طاقت کا استعمال کیا گیا ہوتا تو اس ملک کی آزادی کے موقع پر مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کی آبادی کے ایک چوتھائی کے برابر نہ ہوتی ۔ جہاں تک یہ بات کہی جاتی ہے کہ غیر مسلموں پر بلا تخفیف متواتر مظالم ہوتے رہے تو ۱۸۵۷ء میں تقریباً سارے ہندوستان نے بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے کے نیچے کیوں برطانیہ کے خلاف جنگ کی؟ ان میں بلوربی، مرہٹہ، راجپوت اور دوسرے لوگ شامل تھے ۔! کیا وہ مغلوں کے مظالم کو دائمی رکھنا چاہتے تھے؟ ۔ بابر کے علاوہ ہر ایک افغانی اور مغل بادشاہوں کو یہیں ہندوستان میں دفن کیا گیا ۔ انہوں نے اپنے تمام خزانے یہیں خرچ کئے اور اختیار کردہ اس ملک میں دائمی سکونت اختیار کرلی ۔ وہ فاتحین کی حیثیت سے یہاں آئے تھے لیکن وہ ہمارے شہریوں کی طرح یہاں رہتے تھے ۔ ہندو مذہب کی اچھی باتوں کو اپنا کر ہندوستان میں اسلام کی شکل بالکل بدل گئی ۔

مرہٹوں اور سکھوں نے بالخصوص مابعد کے مغل حکمرانوں کے خلاف کئی مرتبہ بغاوتیں کیں لیکن بالآخر ایران کے شیعہ مسلمان نادر شاہ اور افغانستان کے سنی مسلمان احمد شاہ ابدالی نے مغلیہ سلطنت کو برباد کر دیا ۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد ایک معاوضہ کے صلے میں مرہٹوں نے کم سے کم سو برسوں تک مغل تخت کی حمایت کی اور انہوں نے راجپوتانہ اور بنگال کے ہندوؤں پر بڑی بے رحمی سے حملے کئے ۔ درحقیقت یہ الفاظ ہندو اور ہندوستانی مسلمانوں نے ہمیں دیئے ہیں۔

ہماری تہذیب و تمدن کی ترقی میں مسلمانوں نے جو اضافے کئے ہیں وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ ہماری زندگی کے لاینفک جزو بن گئے ہیں بالخصوص یہ مغل حکمراں ہی تھے جنہوں نے ہمیں اکھنڈ بھارت کا تصور دیا ۔ اور افغانستان کو اس ملک کا ایک حصہ بنالیا ۔ انہوں نے سارے ملک پر حکومت کے لئے ایک طرز حکومت رائج کیا (افغان حکمراں شیر شاہ سوری نے گرانڈ ٹرنک سڑک بنوائی) اور اس ملک میں سیاسی استحکام قائم کیا اور مرکزی حکومت کے اعلیٰ

اقتدار کو قائم کیا اور مالگذاری کا ایک ایسا نظام مروّج کیا جو رعایا کی فلاح و بہبود پر مبنی تھا۔ جرم کا خاتمہ کر دیا اور مکمل امن و امان کی یقین دہانی کی۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہندوؤں کو شاذ و نادر ہی قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ صرف مسلمان ہی وہاں پیش ہوتے تھے۔ دوسرے تمام معاملات پنچایتوں اور رسمی قانون کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ آرٹ اور فنِ تعمیر، فنِ موسیقی و آداب، کھانے پکانے کے طریقوں، لباسوں اور فرنیچر وغیرہ میں ان کے اضافوں کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔

مغلوں نے فارسی کو درباری زبان تسلیم کر لیا اور انہوں نے اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ ترکی یا ان کی مذہبی کتابوں کی زبان عربی کو درباری زبان کی حیثیت دی جائے۔ انہوں نے ایک عام بولی کو جنم دیا جو ہندی قواعد پر مبنی تھی اور اسے اردو کے نام سے موسوم کیا جو ہندوستان میں آجکل تہذیب کے اظہار کے لئے بہترین زبان ہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے ایک مشترکہ مذہب دینِ الٰہی قائم کیا اور بڑی حد تک صوفی و بدانتا کے پیرو ہو گئے۔ توحید کے تصور سے ہندو آشنا نہ تھے لیکن اس بات پر اسلام کے بھرپور زور نے ہمیں بنی نوعِ انسان اور دنیا کے بارے میں اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ بابائے ہندوستانی قومیت گرونانک نے افغانوں کے آخری اور مغلوں کے ابتدائی زمانے میں عدم تفریق کے اپنے عقیدوں کی اشاعت کی لیکن نہ تو انہیں ستایا گیا اور نہ ہی انھیں چیلنج کیا گیا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مندروں کی بے حرمتی کی گئی انھیں مسمار کیا گیا لیکن شمال اور جنوب میں ہمارے قدیم ترین مندر آج بھی برقرار ہیں۔

یہاں تک کہ اورنگ زیب کے ایک فرمان میں جس کی نمائش بنارس ہندو یونیورسٹی کے میوزیم میں کی جاتی ہے، واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ: "جبکہ کسی نئے مندر کی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے، (لیکن) کسی قدیم مندر کو مسمار نہ کیا جائے۔" لہٰذا آج یہ بات کہنا کہ اجودھیا، بنارس اور متھرا کی ان تینوں مسجدوں کو فرقہ وارانہ یکجہتی کے لئے واپس کر دیا جائے۔ ہمارے سیکولر دستور اور قانون کی بیخ کنی کرنے کے مترادف ہے۔

ہاں۔ پاکستان ہے جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ اسے ہندوستانی مسلمانوں نے بنایا تھا جنہیں

اب اس بات پر جھنجھلاہٹ ہوتی ہے، کیونکہ پاکستان انہیں وہاں کا اصلی باشندہ تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اور اس ملک میں ہم انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاکستانی کہتے ہیں۔ ایک ایسے وقت میں جب وہ لوگ دوہرے مصائب میں گرفتار ہیں، ہمیں مذہبی یا سماجی عادات کا لحاظ کئے بنا انہیں اپنے اصلی شہری کی طرح اپنا لینا چاہیئے۔ ہمیں انہیں حصاروں اور محصور ذہنیت سے باہر نکال لینا چاہیئے۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے بخوشی علیٰحدہ انتخابات کو ترک کر دیا ہے۔ وہ مذہبی جماعت کے مقابلے میں غیر مذہبی جماعتوں کو اپنا ووٹ دیتے ہیں۔ بحران کے وقت وہ سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ملک کے لئے جنگ کرتے ہیں، یہاں تک کہ جب ہندوستان اور پاکستان کے مابین جنگ واقع ہوتی ہے۔ شادی اور ورثے کے قوانین کے علاوہ انہوں نے ہمارے ضابطۂ فوجداری اور دیوانی تسلیم کر لئے ہیں۔ یہی بات عیسائیوں، پارسیوں اور یہاں تک کہ ہندوؤں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ملکی مخصوص دھارے میں ان کے شریک ہونے کے لئے ہم ان سے اور کیا چاہتے ہیں۔ یہ کہنا کہ وہ اپنے پرسنل لا کے تحت چار شادیاں تک کر سکتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی آبادی ہندوؤں کی آبادی سے زیادہ بڑھ سکتی ہے تو یہ بات لغو ہے۔ ہر ایک مسلمان کے لئے چار عورتیں کہاں سے آئیں گی؟ پہلے ہی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے حساب سے مسلمان مردوں کے مقابلے میں ۲۵ لاکھ عورتوں کی کمی ہے۔

ہم سب نے بہت ضرر رساں غلطیاں کی ہیں۔ جس علاقے کو پاکستان بننا تھا وہاں کے ہندو سکھ اور پٹھان باشندوں کے احتجاج کے باوجود کانگریس نے ہندوستان کی تقسیم کو تسلیم کیا۔ ہم نے مرکزی حکومت کے محدود اختیارات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بلا شرکتِ غیرے سارے ہندوستان پر اپنے اختیارات کے حصول کے لئے تقسیم ملک کو پسند کیا۔ اس المیہ کے لئے اب صرف مسلمانوں ہی کو کیوں مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے؟ اگر وہ چاہتے تھے تو ہم نے مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کی اجازت دیدی تھی۔ اب وہ ہمارے پورے شہری ہیں اور اب ان کے ساتھ ایک باہری یا زبردستی گھس آنے والوں کے جیسا برتاؤ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے سماج کے دیگر پسماندہ فرقوں کی طرح ان کی معاشی، سماجی اور تعلیمی ترقی کے لئے ہمیں فوری طور پر

اقدام اٹھانے چاہیئے۔

پاکستان سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ مہاجرین کو ہمیں کشمیر میں آباد ہونے کی اجازت دیدینی چاہیئے تھی۔ جب حالات ہمارے حق میں تھے تو ہم ساری وادی کو پاکستانی جتھوں سے صاف کرسکتے تھے۔ ہم یو۔ این۔ او شکایت کرنے کیوں نہیں گئے کیونکہ ہم وہاں بین الاقوامی سازشوں کے جال میں پھنس جاتے؟ مزروعہ زمینوں کے علاوہ جائداد خریدنے کا حق غیر کشمیریوں کو بھی دیا جاسکتا تھا۔ لیکن آج ہندوستان دوسری اپنی ریاستوں کے اپنے شہریوں کے ساتھ کھلواڑ کررہا ہے۔

نوکریوں، تعلیمی اداروں اور نہ صرف زرعی بلکہ دوسری زمینوں کے خریدنے کے لئے مستقل سکونت (وطنیت) کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ شمال مشرقی قبائلی ریاستوں میں جانے کے لئے ہمارے پاس اجازت نامہ ہونا چاہیئے اور وہ بھی بہت تھوڑی مدت کے لئے۔ غیر آسامی باشندوں کے خلاف آسامیوں نے ہتھیار اٹھالئے ہیں۔ علاقہ اور ذاتوں کی نچلی شاخوں کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو ذات، مذہب اور ریاست کی بنیاد پر ہندوستان کی سیاست میں ہماری کامیابی کا دارومدار ہے۔ لہذا فرقہ پرستی اور عقائد پرستوں کی شورش کے لئے صرف پنجاب اور کشمیر کو ہی کیوں مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ ہندی بولنے والے علاقوں میں جان بوجھ کر اور شور شرابہ کے ساتھ اس بات کے بیج بوئے جارہے ہیں۔ لیکن ہمیں اس بات کا احساس بھی ہونا چاہیے کہ اس طرح ہم آگ سے کھیل رہے ہیں۔ سیاسی استحکام اور جمہوری نظام کی کامیابی ہماری غیر مذہبیت (سیکولرزم) پر موقوف ہے۔

خطۂ کشمیر میں دعوتِ اسلامی اور اس کا اسلوب

مولوی محمد عمر فاروق - میر واعظ کشمیر

——— دوسری اور آخری قسط ———

ان بزرگوں اور اکابر نے سخت مشکلات اور ناموافق حالات کے باوجود ایک طرف الحاد اور لادینیت کی طوفانی تحریکوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور دوسری طرف لوگوں کو اسلامی افکار سے روشناس کر کے انہیں دین اسلام کا والہ و شیدائی بنایا۔ انہیں جاہلیت اور بت پرستی کی اندھی تقلیدوں سے نکال کر ان کے سینوں کو نور ایمان سے منور کر دیا۔ خطۂ کشمیر میں علما اور واعظین اور عام مبلغین کے علاوہ دعوتِ فریضہ میں یہاں کے صوفیائے کرام کا بھی حصہ رہا ہے اور یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہاں کے صوفیاء کا حلقہ بالعموم متدین اور پابندِ شریعت رہا ہے۔ ملحدانہ اور مشرکانہ متصوفین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر رہی ہے۔ متدین صوفیاءٔ اپنے کاشانوں اور خانقاہوں میں اپنے مخصوص انداز اور اسلوب سے اتباعِ شریعت کی تلقین اور اخلاقی روحانی قدروں کو اجاگر کرتے رہے ہیں اور پشت ہا پشت تک ان سے مسلمانوں کو فیض پہونچ رہا ہے۔ غیر مسلموں کے خاندانوں کے خاندان حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے رہے ہیں۔ فرحمھم اللہ رحمۃً واسعۃً۔

حاضرین کرام : دعوتِ اسلام، حفاظتِ اسلام اور اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ عقائد و اعمال کی اصلاح میر واعظین کشمیر کا بنیادی مشن اور ان کی زندگیوں کا نصب العین رہا ہے۔ کشمیر میں اس خاندان سے دعوت و ارشاد کا سلسلہ گذشتہ تقریباً چار سو سال سے چلا آرہا ہے۔ میر واعظ خاندان کے چشمۂ فیض سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم تک فیض یاب ہوتے رہے۔ اس لئے اس خاندان کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کی عقیدت بھی ایک تاریخی حقیقت رہی۔

دعوت الی اللہ اعلائے کلمۃ الحق اور اسلامیانِ خطہ کی صلاح و فلاح کے لئے ان کے کارنامے اور ریاست کے تعلیمی، اصلاحی، ملی اور سیاسی میدانوں میں ان کی شاندار خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے لادینیت والحاد، غلط رسومات، بدعات، خرافات اور جہالت و لاعلمی سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے جو نمایاں رول ادا کیا ہے وہ تاریخِ کشمیر کا روشن باب ہے۔

میرواعظین کا اسلوبِ دعوت!

اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مواعظِ حسنہ کا اثرانگیز طریقِ تبلیغ ہر دور اور ہر زمانے میں نہ صرف مقبول رہا ہے بلکہ عوام و خواص تک دعوتِ حق پہنچانے کا مؤثر ترین ذریعہ اور دینِ اسلام کی آبیاری کرنے والوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کرنے، ان میں اسلامی فکر اور دینی مزاج پیدا کرنے میں انتہائی مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ جہاں تک میرواعظینِ کشمیر کے وعظ و تبلیغ کا طرز اور انداز ہے۔ یہ منفرد انداز درس و تدریس کی شکل ہوئی ہے۔ جس میں باقاعدہ طور پر قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور جو آیات و احادیث بیان کی جاتی ہیں۔ وہ سامعین سے دہرا کر ان کے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اکثر سامعین کو قرآن کریم کی آیات، احادیث مبارکہ کے الفاظ نعت و ابیات اور بزرگوں کے اقوال ازبر ہو جاتے ہیں۔

درحقیقت اس منفرد طرزِ وعظ کی بنیاد خانوادہ "میرواعظین کشمیر" کے مؤسس نے ریاست میں دعوت الی اللہ کی مہم شروع کرتے وقت ڈالی تھی۔ اس طریق وعظ اور تبلیغ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موقع و محل کی مناسبت، ادب، تہذیب، زبان کی سلاست اور الفاظ کی برجستگی نمایاں نظر آتی ہے اور اسکی ابتدا درود و دعا سے کی جاتی ہے۔ درمیان میں بھی درود و دعا ہوتی ہے اور اختتام بھی درود و دعا سے کی جاتی ہے۔

دینی اور اصلاحی خدمات:۔

میرواعظینِ کشمیر یکے بعد دیگرے صدیوں سے کشمیر میں مسلمانوں کی دینی، ملی اور اصلاحی خدمات انجام دیتے رہے۔ تاآنکہ تقسیمِ ہند سے قبل ریاست جموں و کشمیر میں ایسے حالات پیدا کئے

گئے۔ کہ ۱۹۴۶ء میں مفسر قرآن میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہؒ کو وطن عزیز سے ہجرت کرکے پاکستان جانا پڑا۔ اس دوران ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک جامع مسجد کا صد ہا سالہ منبر و محراب جو کشمیر میں وعظ و تبلیغ اور دعوت وارشاد کا سب سے بڑا مرکز تھا، خالی اور خاموش رہا۔ حضرت میرواعظ مولانا محمد عتیق اللہ صاحبؒ، میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحبؒ کے بعد اگرچہ اس منصب کو تھام سکتے تھے لیکن ضعیف العمری کے علاوہ گوشہ نشینی اور زاہدانہ زندگی گذارنے کی وجہ سے اس فریضہ کو سنبھالنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ وکان امر اللہ قدراً مقدوراً

یہی وہ پُرآشوب دور ہے اور اس تلخ حقیقت کا اظہار ضروری ہے۔ کہ سیاسی غیر یقینیت اتھل پتھل اور مضبوط ومؤثر دینی قیادت ورہنمائی کے فقدان کے سبب لادین مذہب بیزار اور اسلام دشمن قوتوں کو ریاست کے طول وعرض میں بال و پر نکالنے کا خوب خوب موقع ملا۔ وقت، ماحول اور اس وقت کی عام فضا کا ان عناصر نے بھرپور فائدہ اٹھا کر اسلامی قدروں، روایات اور ملی تشخص کے علاوہ کشمیر کے اکثریتی کردار کو پامال کرنے کی منظم کوششیں کیں۔ دینی، تعلیمی اور اصلاحی اداروں اور انجمنوں خاص طور کشمیر میں علومِ اسلامی کے سب سے بڑے اور قدیم مرکز انجمن نصرۃ الاسلام کو ہر طرح سے عتاب وعذاب کا نشانہ بنایا۔ اس دوران غیر اسلامی اور باطل افکار ونظریات کی بھی وسیع پیمانے پر تشہیر کرائی گئی۔ اور کشمیر کے سادہ لوح اور مذہب پسند عوام کی سیاست زدہ بنانے کی زبردست سعی کی گئی۔

شہید ملت میرواعظ مولوی محمد فاروقؒ:

یہاں تک کہ ۱۹۶۲ء میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کشمیری عوام کی انتہائی خواہش اور تمنا کے احترام میں صرف ۱۸ سال کی عمر میں میرواعظ کشمیر مولوی محمد فاروقؒ صاحب کی میرواعظ خاندان کے صدہا سالہ معمول کے مطابق ہزاروں مسلمانوں کی موجودگی میں جامع مسجد میں باقاعدہ دستار بندی ہوئی وادی بھر کے لوگوں میں مسرت وانبساط کی لہر دوڑ گئی۔ خصوصاً ان لوگوں کے پژمردہ دلوں میں شادمانی کی ایک نئی بہار آگئی جو اس خاندان کے ساتھ عقیدت وارادت میں ہمیشہ مخلصانہ طور پر منسلک رہے تھے۔

شہید ملت میرواعظ مولوی محمد فاروق صاحبؒ جو اپنے اکابر واسلاف کی طرح دعوت الی اللہ

کے جذبات سے سرشار اور فکرِ اسلامی کے حامل تھے۔ تقریباً تین دہائیوں تک برابر اس مشن کی آبیاری کرتے رہے۔ لاکھوں انسانوں تک دعوتِ حق پہونچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بے پناہ مشکلات اور ناموافق حالات کے باوجود تمام مسلمانوں کو عموماً اور اہلِ کشمیر کو خصوصاً اسلام کا والہ اور شیدائی بنانے، انہیں اسلامی تعلیمات، دینی اقدار اور ملّی تشخص سے روشناس کرانے کی بھرپور کوششیں کرتے رہے۔

آخر میں، میں آپ حضرات کا ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ آپ حضرات نے میرے بے ربط خیالات کو توجہ اور غور سے سنا۔ —— شکریہ۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ ط آمین۔

نوٹ:۔ اس مقالہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب راقم کے سامنے رہیں:۔

۱۔ قرآن مجید
۲۔ راج ترنگنی —— (کلہن)
۳۔ تحفۂ کشمیر —— علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ
۴۔ اسلام کشمیر میں —— شہیدِ ملّت میرواعظ مولوی فاروقؒ
۵۔ اسلام کا آفاقی پیغام " " " "
۶۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات " " " "
۷۔ اسلام کے احسانات " " " "

شمس نوید عثمانی

نقد و تبصرہ

قسط ۱

مولانا محمد حنیف علی شیخ الحدیث کا ارشاد ہے کہ پشاور کے ایک جلسہ میں کبھی مفتی صاحب کے حسب ذیل الفاظ نے اپنے اندر کے انسان کا تعارف کرایا تھا:۔

"ہم مسلمان ہیں۔ خوف و ہراس ہماری فطرت نہیں ہے۔ ہم خدا کی ذات پر اعتماد رکھتے ہیں اور یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ۔۔۔۔ حالات ۔۔۔۔ خدا کا اٹل فیصلہ اور مسلمانوں کے لئے امتحان ہیں۔ ہم۔۔۔ مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ ملک ان کا بھی ہے۔ اس کی سالمیت کے ذمہ دار یہ بھی ہیں۔۔۔ ملک کو ترقی دینے اور فرقہ پرستوں سے نظر ملانے کی صفت اپنے اندر پیدا کریں"

بقول مضمون نگار" ان میں صاف گوئی اور بیباکی کے ساتھ کس قدر بے تکلفی تھی"۔۔۔ "مفتی صاحب مرحوم کم گو مگر فعال سنجیدہ مگر سرگرم اور نبض شناس تھے۔ ان کی پیشانی کی شکنیں ہمہ وقت مفید نتائج کی متلاشی ہوتی تھیں۔۔۔ افسوس کہ مسلک دیو بند اور فکر ولی اللٰہی کا نقیب اٹھ گیا"

پروفیسر طاہر محمود صاحب نے آج اجتہادی فکر کے بند دروازے کے بارے میں مفتی صاحب کا یہ ارتقائی نقطۂ نظر یاد دلایا ہے:۔

"مرحوم قانون کے معاملہ میں نہ جمود پرست تھے اور نہ متقلد۔ نصوص قطعی کے دائرے سے باہر ان کے نزدیک غور و خوض اور نظر ثانی کی پوری گنجائش تھی"

قرآن جس کا نزول حالات کے ساتھ ایک گہرا تعلق رکھتا تھا آج وہی قرآن حالات و مسائل حاضرہ پر جو روشنی اجتہاد کے دریچہ سے ہی ڈال سکتا ہے ہمارے جمود کے جزدان میں بند پڑا ہوا ہے! دنیا اس کے نتیجہ میں علمی اور عقلی ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ مفتی صاحب کا یہ فکری رخ اب کون اپنائے اور دریچہ اجتہاد کھول کر نئے دور کی علمی رہنمائی قرآن کے روشن سائے میں کرے، شاید اس خصوصی عہد کا یہ سب سے بڑا اور عہد آفریں پیغام ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا کہنا ہے کہ:۔

"دیکھئے تو وہ سیدھے سادے مہذب و معقول انسان نظر آتے تھے اور سوچئے تو ان کی شخصیت ایک بڑی پُر جہت شخصیت تھی جس میں سادگی و پرکاری کا ایک عجیب امتزاج دیکھا جا سکتا تھا"۔۔۔ خود کو دوسروں سے دور رکھنے اور مصافحہ کی حد تک بھی تکلف اختیار

کرنے کی ادا شاذ ان کو کبھی پسند نہ آئی جو آج بھی بہت سے صاحب "سجہ وسجادہ" افراد کے مفتخرانہ رویئے میں شامل نظر آتی ہے۔ وہ دوسروں سے ایسے کھلے دل سے ملتے تھے جیسے وہ ان کے اپنے ہوں . . . . دوسروں کی بات اس طرح سنتے جیسے وہ ان سے کچھ سیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہوں۔ مگر بیشتر ان کا مقصد سمجھانا ہوتا تھا۔ اپنی بات کچھ ایسے سنجیدہ طریقہ اور ہمدردانہ خلوص کے ساتھ سمجھاتے تھے جسمیں "شرکت" کا احساس شامل رہتا تھا۔ میں نے کبھی ان کو دوسروں کی بات کاٹتے ہوئے اور بلا وجہ اپنی ہی بات پر زور دیتے ہوئے نہیں دیکھا . . . . اس نوع کی سلامت روی کے نمونے بہت کم ملتے ہیں . . . مفتی صاحب کی شخصیت کی بنیادی خصوصیات ہیں ذہن بیدار اور دلِ دردمند . . . دردمندی ان کی مذہبی فطرت کی ایک نمایاں خوبی ہے . . . تحریر میں قطعیت جامعیت اور وضاحت کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ارتکاز خیال کی خصوصیت ان تینوں کا احاطہ کرتی ہے۔ مفتی صاحب دبستان دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مابین ایک "قدر مشترک" کی حیثیت سے ابھرتے ہیں . . . . حالی اور بطور خاص ڈاکٹر اقبال ان کے مطالعہ میں رہے۔ اکثر اپنی تقریروں میں وہ اقبال کا حوالہ بھی دیتے ہیں"۔

ان کے اسی دل دردمند کی ندرت انگیزی کا نمونہ راقم الحروف کو اسی خصوصی نمبر کے صفحہ ۴۲۸-۴۲۹ پر مفتی صاحب کے ایک یادگار پیغام میں ملا۔ عام طور سے ہمارے عوام اور خواص دونوں کا شیوہ ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندو مسلم مذہبی جنگِ مسلسل کا ذکر جب کبھی کرتے ہیں تو اکثریت کے مظالم سامنے رکھ کر انہیں "ظالم" کے خانے میں رکھتے ہیں اور بے سروساماں اقلیت کی مظلومیت کے پہلو آگے رکھ کر انہیں "مظلوم" کا مقام اور نام دیتے ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مظلوم میں یا تو احساس کمتری و فرض ناشناسی ابھرتا ہے اور ظالم میں اور زیادہ ظلم و انتقام کا مغرورانہ جذبہ سر اٹھانے لگتا ہے۔ مگر سبحان اللہ! مفتی صاحب نے اس معاملے میں ظالم کی اصل حقیقت کو ذرہ بھر بدلے بغیر تعمیری حسن اور اخلاقی لوچ کے ساتھ "ظالم" کو بھی "مظلوم" کے خانے میں اس کے ساتھ، اس کے قریب لا بیٹھایا؛ اور مظلوم میں اس کی ایک عملی خود فراموشی کا علم دکھا کر اسے بھی ظالم کے دوش بدوش کھڑا کر کے قوت ارادی کا سویا ہوا جذبہ بیدار کر دیا! فرماتے ہیں؛

" ایک بستی میں ایسے سیکڑوں دل موجود ہیں جو اسلام کو چلتی پھرتی حالت میں اور مسلمانوں کو ان کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان تڑپتے ہوئے دلوں کو کس طرح جوڑا جائے۔

میں اس زوال اور افلاس کے عالم میں بھی پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مخلص اور بے لوث کارکنوں کا جو سرمایہ مسلمانانِ ہند کے پاس موجود ہے اس کی مثال اس ملک میں کسی گروہ یا جماعت کے پاس نہیں پائی جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے ملک کے غیر مسلموں کو ہم ایک طرح سے مظلوم سمجھتے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں سے کچھ مخصوص تاریخی پس منظر کی وجہ سے بدگمان ہیں اور اس بدگمانی کے باعث ان کی اکثر صلاحیتیں اور قوتیں ان مسائل پر صرف ہوتی رہتی ہیں جو صرف ایک پسماندہ اور آپس میں پھٹی ہوئی قوم کا خاصہ ہیں۔ ان کی اس سے بھی بڑی مظلومیت یہ ہے کہ ان کی رہنمائی کی باگ ڈور کسی اخلاقی قیادت کے بجائے سیاسی مفادات، زبان و ذات کی خود غرضی اور گروہی اغراض رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔ ایک عام غیر مسلم کے دل پر پھائے رکھنے والا کوئی نہیں۔ ہماری تمنا تھی کہ مسلمان اس طرح آگے آتے کہ ان غیر مسلموں کے دلوں میں ڈھارس پیدا ہوتی اور وہ سمجھتے کہ چشتی اور محبوب الٰہی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام کے واقعات بیان کرنے محض تاریخ انسانی کا کوئی باب نہیں بلکہ مشاہدہ کی آنکھ آج بھی اس سیرت و کردار کو دیکھ سکتی ہے ۔ ۔ ۔ تاہم یہ غلط فہمیاں غیر فطری بھی نہیں ہیں۔ جن لوگوں کی بدگمانی دور ہو گئی ہے، وہ اس فورم کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں اور جو ابھی اس سے دور ہیں ان کی غلط فہمیاں بھی انشاء اللہ دور ہو جائیں گی۔ البتہ جن کی نیتوں میں کھوٹ ہے ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔"

اس خاص نمبر میں اس شخصیت کے بارے میں ابھی بہت کچھ ہے جس کا احاطہ اس خوشہ چیں کے چند صفحات میں نہ ہو سکا، نہ ہو سکتا تھا۔ چند نمونے اس زاویئے سے ابھی قابل اقتباس بھی محسوس ہوتے ہیں کہ ان کے لکھنے والے مفتی صاحب کے گھر کے بھیدی اور قریبی عزیز ہیں۔ مثلاً مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی، مولانا کفیل الرحمٰن نشاط اور شمس الرحمٰن نوید (شمس نوید) عثمانی۔ مثلاً مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی کی

اندرونی شہادت کہ "آباجان کی باہر کی اور گھر کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔۔۔ پوری زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھلی ڈھلائی تھی"۔ یا مولانا تاکیتیل الرحمٰن نشاط عثمانی نے اپنے اشعار میں مفتی صاحب کے خلاء کو "امانت سلف گیا، متاع خاندان گیا" کے خراج آمیز الفاظ میں بیان کیا ہے ــ آہ! وہ ایک فرد جسے ایک خاندان اپنا "سرمایۂ نشاط جاں" کہے! ــ یا شمس نوید عثمانی سے جن سے ملاقات خود مرحوم کے دولت کدے میں کرتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ یہ خصوصی نمبر بھی ملا اور اس کے پیش کرنے والے مفتی صاحب کے صاحبزادے عبدالرحمٰن عثمانی اور ان کا خلوص و تعلق خاص بھی اور ان سطور کے لئے انتہائی محبت بھرا بار بار بھی! اسی شمس نوید عثمانی کے توصرف تین شعر ان کے حسب ذیل تاثرات کے ساتھ نقل کرنے کو دل چاہتا ہے اور ایک خاص رخ سے چاہتا ہے جس کا اظہار اس کے بعد مجھے آخری سطور میں کرنا ہے۔

خدا کی "دولتِ جاوید" تری ذات میں ہے
دلِ حیات کی دھڑکن تری وفات میں ہے

تری نظر سے جو چھلکی شرابِ خُلقِ عظیم
بنامِ حبِّ نبوتؐ تجلّیات میں ہے

خدا کرے نئی ملّت کی قوم نو سے ہو پُر
ترا عجیب خلاء بزمِ کائنات میں ہے

ان اشعار خصوصی طور سے آخری شعر کو دیکھتا ہوں تو دل گواہی دیتا ہے کہ مفتی صاحب جیسے فرد کا خلاء ایک فرد سے نہیں ایک نئی قوم، نو مسلم قوم سے پُر ہونا چاہیے۔ وہی قوم جسے ہم "ظالم" کہکر اسے اور زیادہ دور کر بیٹھے اور خود کو مظلوم کہہ کر ظلم کو کرم سے اور نہ رحمت و دہشت کو رحمت و رافت سے مٹانے کا ۱۴ سو سالہ تاریخی سلیقہ بھی گم کر بیٹھے ــ وہی قوم جس کے ظلم میں بھی مفتی صاحب نے ہمارے ظلم و کم نگاہی کا اور خود اس کی صلاحیتوں کے ضیاع و مظلومیت کا ایک پہلو کیسی ندرت بیان اور کیسے درد بھرے رخ کے ساتھ نمایاں کیا تھا۔ (جاری)

بیان ملکیت وتفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقامِ اشاعت	اردو بازار جامع مسجد دہلی
۲۔ وقفۂ اشاعت	ماہانہ
۳۔ طابع کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
۴۔ ناشر کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
سکونت	۴۱۳۶، اردو بازار جامع مسجد دہلی
۵۔ ایڈیٹر کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
سکونت	۴۱۳۶، اردو بازار جامع مسجد دہلی
۶۔ ملکیت	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی

میں عمیدالرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع وناشر

عمیدالرحمٰن عثمانی

برہان

جلد ۱۱۱ — اپریل ۱۹۹۳ء مطابق شوال ۱۴۱۳ھ — شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی مسماری کی وجہ سے بھارت کے خلاف غیر ممالک میں شدید قسم کے غم و غصے کے پیش نظر ساتویں سربراہ کانفرنس کے ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں انعقاد کو دو بار ملتوی کر دیا گیا تھا اس کے بعد ایک خیال و اندیشہ بار بار سامنے آتا رہا کہ بنگلہ دیش جس کا قیام کسی قدر ہندوستانی کوششوں اور قربانیوں ہی کا مرہون منت ہے، میں بعض انتہا پسند تنظیموں نے بابری مسجد کی تعمیر نو کے سلسلے میں بھارتی وزیر اعظم کی طرف سے یقین دہانی اور آب گنگا کی تقسیم کے مسئلے میں منصفانہ رویہ کے اظہار کا مطالبہ کیا تھا —— لیکن بنگلہ دیش کی حکومت کے سخت ترین رویّہ اور اچھے و قابل ستائش انتظامات کی بدولت سارک کانفرنس آخر کار ۱۰ اپریل ۱۹۹۳ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہو کر رہی اور اس میں بھارت کے وزیر اعظم جناب نرسمہا راؤ، پاکستانی وزیر اعظم جناب نواز شریف، مالدیپ کے صدر جناب مامون عبد القیوم، نیپال کے وزیر اعظم گرجا پرشاد کوئرالہ، بھوٹان کے راجہ جگمے سنگمے وانگچوک سری لنکا کے صدر رنسنگھ پریم داس اور بنگلہ وزیر اعظم اور سارک کانفرنس کی صدر بیگم خالدہ ضیاء نے شریک ہو کر جنوب ایشیا میں اقتصادی تعاون کے لئے نئی شروعات کرنے کا عزم مصمم کیا۔ سارک ممالک کے سربراہوں کی یہ کانفرنس یوروپی ممالک امریکہ میکسکو اور کناڈا کی طرح کا ایک مشترکہ بیوپار بازار کھڑا کرنے کے سلسلے میں ایک ٹھوس قدم اٹھانے کی بھی کوشش میں مشغول ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جنوب ایشیا کے یہ چھوٹے ملک آپس میں تجارتی تعلقات قائم کر کے اپنے ملک کے عوام کی معاشی حالت کو کافی حد تک سدھار سکتے ہیں۔ آج امریکہ اور روس ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہوئے بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ انہیں اس حقیقت کا احساس ہے کہ بغیر آپسی تعاون کے کسی ایک کی بھی

بھی ترقی اس دور میں ناممکن ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک امریکہ و روس دونوں ایک دوسرے کے شدید ترین دشمن تھے۔ مگر اب انہیں اپنی اپنی ترقی کے لئے دشمنی کی نہیں دوستی کی ضرورت ہے اور وہ اس ضرورت کے لئے اپنی انا رتک کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لئے کمربستہ ہیں۔ اسی طرح کیا ایشیائی ممالک آپسمیں اپنے فروعی اختلافات کو ختم یا نظرانداز کرکے ایک دوسرے کے ساتھ آپسی اقتصادی محاذ پر ہی تعاون کرکے اپنے اپنے عوام کو خوشحالی اور امن وسکون کی زندگی نہیں دے سکتے ہیں۔ ہمیں اس کی خوشی ہے کہ بھارت اور پاکستان کے سربراہوں جناب پی وی نرسمہا راؤ اور نواز شریف نے الگ سے ملاقات کرکے آپسی اختلافات کو ایک طرف کرکے خیرسگالی جذبہ کے ساتھ سارک ممالک کے تجارتی بازار کے قیام کی اہمیت و افادیت کو محسوس کیا ہے۔ اور یہ ایک اچھی بات ہے جس سے ایشیائی ممالک کے عوام کو راحت کا سانس لینا نصیب ہوا ہے۔

ہندوستان کی فرقہ پرست و فسطائی طاقتیں بھی کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں کہ وہ اقلیتوں کو خوف وہراس اور دہشت میں مبتلا کرنے کے نئے نئے منصوبے و بہانے تلاش کرلیتی ہیں ابھی بابری مسجد ہی کی مسماری کے صدمہ وغم سے ملک کو نجات نہیں ملی ہے کہ اب بنگلہ دیشی گھس پیٹھیوں کو باہر نکالنے کی مہم چلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے ان فرقہ پرست و فسطائی طاقتوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنی کلکتہ کی میٹنگ میں کشمیر پر سخت رُخ اور بنگلہ دیشی شرنارتھیوں کے سلسلے میں ہندوستانی عوام میں بیداری پیدا کرنے کی بات کہی ہے یہاں ایک ہندی روزنامہ کے الفاظ میں "یہ سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ بنگلہ دیش سے جو ہندو آرہے ہیں وہ تو شرنارتھی ہیں اور جو مسلمان آرہے ہیں وہ گھس پیٹھیے۔ آخر بھاجپا ایسی باتیں کرکے اپنے کو ہندوستانی عوام کے سلسلے میں ایک ہندو پارٹی کے روپ میں پیش کرنا چاہتی ہے یا عوام الناس کے مسائل کو حل کرنے والی مختلف الخیال لوگوں کی جماعت۔ وہ ایک طرف تو خواب دیکھتی ہے دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کی مگر اس کی چال ڈھال سے لگتا ہے کہ وہ ملک میں اپنی کرتوتوں سے صرف انارکی ہی پھیلانا چاہتی ہے عوام اپنی اقتصادی حالت سے بےخبر رہ کر صرف اور صرف آپس میں

مذہبی مسائل میں الجھ کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہی رہیں۔ یہ بات ملک کے ان سینکڑوں ہزاروں مجاہدین آزادی کے لئے بڑی ہی تکلیف دہ ہے کیونکہ انہوں نے انگریز سامراج سے اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے خون پسینہ ایک کیا ہے جس وقت یہ کا غذی گھوڑے انگریز سامراج کی چاپلوسی میں لگے ہوئے تھے یہ مجاہدین آزادی اپنے ملک کی آزادی کے لئے انگریز سامراج کی گولیاں اپنے سینوں پر کھا رہے تھے۔ آج ان مجاہدین آزادی کی ان تمام قربانیوں کو یہ فسطائی ذہنیت کے کچھ افراد ملیا میٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جسے ہندوستانی محب وطن کبھی بھی برداشت نہیں کریں گے۔ اس لئے ایسی فرقہ پرست طاقتیں اگر یہ سوچتی ہیں کہ وہ اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لاکر دہلی کے تخت پر قابض ہو جائیں گی تو یہ ان کی خام خیالی ہی ہے۔

پچھلے دنوں بمبئی اور کلکتہ میں زبردست بم دھماکوں کی گونج ہوئی جس سے کتنے ہی بے گناہ لوگوں کی جانیں گئیں معصوم بچے عورتیں آناً فاناً ان بموں کے پھٹنے سے موت کی آغوش میں پہونچ گئے۔ سرکاری ذرائع نے اسے اسمگلروں، جرائم پیشہ اور غیر ملک کی سازش کہا ہے۔ جس نے بھی یہ انسانیت سوز بہیمانہ حرکت کی ہے اسے انسانی تاریخ کبھی بھی معاف نہیں کرے گی۔ جس طرح بابری مسجد کی مسماری سے دنیا کے تمام امن پسند انسان صبر اور برداشت تو کرلیں گے لیکن اسے بھولیں گے نہیں اسی طرح یہ بم دھماکے بھی جو انسانیت ہی کی تباہی و بربادی کا باعث ہیں بھلائے نہیں جا سکتے ہیں۔ اور اس کی مذمت میں جتنے بھی الفاظ استعمال کیے جائیں کم ہی ہیں۔

۵ر اپریل ۱۹۹۳ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک وفد نے ممتاز عالم دین حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی قیادت و رہنمائی میں وزیراعظم جناب نرسمہا راؤ سے ۴۵ منٹ کی ملاقات میں یہ بات واضح کردی کہ اجودھیا میں کسی دوسرے مقام پر متبادل مسجد کی تعمیر مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ شریعت کی رو سے ڈھانچہ کے انہدام، مورتیوں کی تنصیب اور پوجا ہونے کے بعد بھی یہ جگہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ جس

کے بانیوں میں اہم نام مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ امیر شریعت کے ہیں، نے آج ہندوستانی مسلمانوں کے اس سب سے اہم مسئلہ پر اپنی توجہ مبذول کر کے قابل ستائش کام کیا ہے۔ ورنہ تو کچھ لوگوں نے اس موضوع پر اسلام کی آڑ میں اظہار خیال کرتے ہوئے عجیب و غریب قسم کی تجویزیں اور باتیں پیش کر دیں۔ جس سے ملت اسلامیہ میں انتشار کی سوچی سمجھی اسکیم کامیاب ہو سکے۔ ان میں ایک نام معلوم و معروف مولانا کا ہے جو اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلم عوام میں ایک مسئلہ کو ایک بیکار مسئلہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور ان کے بعض لمبے چوڑے مضمون انگریزی اخباروں کے علاوہ روزنامہ قومی آواز میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری تک مسلمانوں پر ڈال دی ہے بابری مسجد کے تعلق سے انہوں نے تین نکاتی تجویز ہندوستان ٹائمز کے ذریعہ سے پیش کی ہے۔ جس میں مسلمانوں کی طرف سے بابری مسجد سے دستبرداری تک کی پیش کش کی گئی ہے۔ اور باقی اس کے جواب میں مسلمانوں کے لئے جس چیز کی خواہش کی گئی ہے اس سے ملت اسلامیہ کی خودداری وقار اور مذہبی تقدس ہی کی پامالی میں بو آتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم ان "مولانا" کے مطالعہ کے لئے بھارت کے سب سے بڑے ہندی روزنامہ "نو بھارت ٹائمس" مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۹۳ء میں مظفر نگر کی کسی پشپ لتا کے ایک مطبوعہ خط کے اقتباس کو بلا تبصرہ نقل کر رہے ہیں۔

"مولانا۔۔۔ کے اس قابل استقبال تجویز کو، کہ مسلمان جنم بھومی سے دعویٰ واپس لیں اور ہندو جنم بھومی لیکر پوری لگام لگا دیں دونوں طرف کے وعدے قانون میں درج کئے جائیں"۔ اگر مسلم فرقہ بابری مسجد کمیٹی کے خلاف جاکر بھی منظور کر لیں تو کیا بھاجپا اور اسکی معاون تنظیمیں قبول کریں گی کیا تجویز سے یہ ہی ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کو بابر یا بابری مسجد سے انسیت نہیں خوف و دہشت سنگھل کے ہاتھ کی تین ہزار مقبروں و مسجدوں کی ہٹ لسٹ سے ہے اس ڈھانچہ کو توان کی خودداری عزت و وقار اور بقاء کا مسئلہ بنا کر گرا یا گیا۔ مسلم فرقہ سے اگر جناح جیسا ملک دشمن پیدا ہوا تو کیا ہندو فرقہ سے بھنڈراں والا اور جے چند نہیں پیدا ہوئے کشمیر میں جو ہوا وہ پنجاب میں بھی تو ہوا۔ جناح مردہ باد کے نعرے لگانے والوں اور اپنی مرضی

سے ہندوستان میں رہنے والوں سے سوتیلے پن کا سلوک کر کے ہم کیسے امید کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے اندر کی دہشت اور عدم تحفظ کا احساس ختم کر کے ہندوستان کی راشٹریتا اور ہندوتو کی بھاونا سے سرس ہو جائیں جتنا دکھ ہمیں انکے الگ قانون و تشٹی کرن سے ہوتی ہے اتنی تکلیف ہمیں ان کے سیاسی، اقتصادی ومعاشرتی اور تعلیمی پچھڑے پن سے بھی تو ہونی چاہیئے۔ ایک مسلمان ملیانہ کانڈ سے متاثر ہو اے سی پرنم پھینکتا ہے تو اس نوجوان کو سزا دینے بھر سے مسئلہ کا حل ہو جائے گا ان وجوہات پر غور کرنا ضروری نہیں جنکی وجہ سے اس نے ایسا غیر قانونی غلط اور خودکشی جیسا قدم اٹھایا مسلمانوں نے اگر . . . کرڈ پنتھیوں سے جڑنے میں اپنا بھلا سمجھا تو ہندوؤں نے ہی انہیں کون اپنے پن کی نظر سے دیکھا . . . تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی . آج مسلمانوں کو اپنی سیکولر سنسکرتی میں معاونت کو آنکنے کی ضرورت نہیں ہندو فرقوں کو بھی اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی ضرورت ہے . متشدد تنظیموں اور مجرموں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا وہ تو بس اسے ہتھیار کے روپ میں استعمال کیا کرتے ہیں —— آج دونوں فرقوں کی فرقہ واریت سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے ایڈمنسٹریشن کی باگ ڈور تھامنے والے سیاستدانوں نے پورے سماج میں فرقہ واریت کا زہر پھیلایا ضرورت اسکو پاک کرنے کی ہے۔"

بھرشٹاچار و بدعنوانیوں کی وبا اب مشرقی ملکوں ہی تک محدود نہیں رہ گئی ہے یوروپی ممالک میں بھی یہ عام ہوتی جا رہی ہے۔ جاپان کے وزیر اعظم اسی جرم میں بدلے گئے۔ فرانس میں سوشلسٹ حکومت کا زوال اسی لیئے ہوا کہ حکمراں سوشلزم کی دہائی دیتے ہوئے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ امریکہ میں بھرشٹاچار کسی سے کم نہیں اب معلوم ہوا ہے کہ اٹلی بھی بدعنوانیوں میں بہت آگے پہونچ چکا ہے۔ وہاں کی حکومت اسی بدعنوانی کے الزام میں معطل ہونے والی ہے۔ اٹلی میں ڈی پائیٹرو جو ایک سرکاری وکیل تھے اٹلی کے بدعنوان حکمرانوں کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے چنانچہ اٹلی کے بڑے بڑے لیڈر بھی مسٹر ڈی پائیٹرو سے خوف کھانے لگے لیکن اٹلی کے عوام اسے شیر مرد کے خطاب سے نواز رہے ہیں۔ ایک اخبار نے انہیں ایک پادری کے روپ میں پیش کیا جسکے سامنے لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے نجات حاصل کرتے ہیں اب مشرق ومغرب میں بدعنوانیوں کے لحاظ سے بھی کوئی فرق نہیں رہا ایک حمام میں سب ننگے ہیں۔

وفیات

گزشتہ ماہ ہندوستان کی مشہور دینی شخصیت حضرت مولانا غلام محمد نورگت کی وفات سے علمی و دینی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ ان کی اچانک وفات کی خبر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں رنج و غم کے ساتھ سنی گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ادارہ ندوۃ المصنفین سے مرحوم مولانا غلام محمد نورگت کا تعلق و رابطہ اس کے قیام اول ہی سے تھا۔ وہ اس کے نہ صرف نائف ممبر و رکن تھے بلکہ اس کے بانی اور عالم اسلام کی زبردست ہستی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی رفقاء میں تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے مشوروں و ہدایات کے تحت انہوں نے اپنے آبائی وطن گجرات سورت اور اس کے مضافات میں اسلامیات کے فروغ اور مذہبی و دینی تعلیمات کیلئے دینی مدرسوں کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کتنے ہی مدارس انہوں نے قائم کئے اور ان کا سنگ بنیاد حضرت قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے دست مبارک سے رکھوایا۔ علمی و دینی کاموں کو انجام دینے اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ سے برابر صلاح و مشورہ لیتے رہتے قدم قدم پر مفتی صاحبؒ کی رہنمائی سے استفادہ حاصل کرتے رہتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ سے حضرت مولانا غلام محمد نورگتؒ کے اس قدر تعلق خصوصی اور ان کے بے لوث دینی خدمات سے متاثر ہو کر مشہور علمی و دینی شخصیت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی دامت برکاتہم نے اپنی تصنیف حیات عبدالحیؒ میں خاص طور پر اسے بیان فرمایا ہے۔ مفتی صاحبؒ کو وہ اپنا مشفق و مہربان اور بڑے بھائی کی طرح سمجھتے تھے ان کی ہر بات ماننا وہ باعث سعادت سمجھتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کی خبر سن کر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ اس کے بعد جب بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا کہیں ذکر ہوتا تو ان کی یاد کرتے کرتے انکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔ ادارہ ندوۃ المصنفین سے انہوں نے آخری دم تک تعلق و رابطہ برقرار رکھا۔ مفتی صاحبؒ کی اولاد کو اپنی ہی اولاد کی طرح گردانتے اور سمجھتے تھے۔ ہم نے بھی ان میں قبلہ ابا جان مفکر ملت

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی محبت وشفقت اور انسیت ہی پائی جسے آج ان کی وفات سے ہمیں محروم ہونا پڑ رہا ہے — کیا بتایئں کہ وہ کس قدر مشفق تھے مہربان تھے کرم فرماتے۔ نیک تھے متقی و پرہیزگار تھے۔ پوری ملت اسلامیہ کے لئے ان کے دل میں اتھاہ ہمدردی وچاہت اور درد تھا۔ ملی مسائل کے حل کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے ان کی وفات سے ادارہ ندوۃ المصنفین خاندان مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور پوری ملت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہم سب کو ان کے صاحبزادگان و عزیز واقارب متعلقین اور ملت اسلامیہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ تعزیت خود اپنے آپ سے خاندان مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے ملت اسلامیہ سے اور ان کے تمام لائق و ہونہار صاجزادگان سے ہے۔ حق مغفرت فرمائے۔

برہان کے لئے نظرات اور حضرت مولانا غلام محمد نورگت کی وفات پر تعزیتی نوٹ لکھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ ابھی ابھی ٹیلی فون پر یہ منحوس اطلاع ملی کہ بعد نماز مغرب بروز جمعرات ۱۵ اپریل ۹۳ء مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے مدتوں کے ساتھی و رفیق، راقم کے چھوٹے بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی کے خسر، عظیم ادیب و صحافی مغلیہ دور حکومت کے تاریخ داں اور دلّی کی تہذیب و شرافت، نیکی وانسانیت کے آئینہ، وضعداری و اخلاق کریمانہ کے پیکر مجسم رسالہ دین و دنیا کے بانی و مدیر حضرت مفتی شوکت علی فہمی اس دار فانی سے رحلت فرماگئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

یہ خبر وفات ہم سب کے لئے زبردست دکھ وغم اور صدمہ کا باعث ہے کیونکہ قبلہ آباجان حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے انھیں قلبی تعلق تھا اور جب ادارہ ندوۃ المصنفین ۱۹۳۸ء میں قرولباغ میں قائم ہوا تھا تو اس وقت بھی مفتی شوکت علی فہمی سے ان کے روابط تھے جو آخر وقت تک قائم رہے۔ حضرت آباجان مفتی صاحب کی وفات کے بعد وہ ہمارے خاندان کے قابل احترام بزرگ کی حیثیت سے ہم سب کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے — حضرت آباجانؒ جب ۱۹۴۷ء کے بعد علاقہ جامع مسجد دہلی میں آکر آباد ہوگئے تو تقریباً روزانہ ہی ملاقات فرماتے تھے۔ دونوں بزرگ آپس میں ایک دوسرے کی رائے ومشورہ کا نہ صرف ادب واحترام کرتے تھے بلکہ ان پر عمل پیرا بھی رہتے تھے۔ مفتی شوکت علی فہمی صاحب بلا کے ذہین تھے دین و دنیا میں ان کے

حالات حاضرہ پر اداریئے علمی حلقوں میں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ انکی قلم میں بڑی جان تھی۔ کئی کتابیں انھوں نے رقم فرمائیں جو علمی و ادبی حلقوں میں مقبولیت کی سند حاصل کئے ہوئے ہیں۔ بڑے ہی نستعلیق بزرگ تھے۔ نفاست پسند تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی بڑے نفیس تھے۔ گفتگو میں بڑی ہی بردباری تھی عوام و خواص میں عزت واحترام اور توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملی مسائل میں ان کے مشورے قابل قدر ہوتے تھے سیاسیات و اخلاقیات اور تاریخ پر انہیں کمال دسترس حاصل تھا۔ اتنی خوبیوں اور اعلیٰ اوصاف کی حامل ہستی آج ہمارے درمیان میں نہ رہی یہ ہی سوچ و تصور کرکے دل ودماغ میں عجیب قسم کی بے چینی سی محسوس ہو رہی ہے۔ اب کیا ہوگا۔ ہر اچھی شخصیت ہمارے بیچ میں اٹھتی چلی جا رہی ہے جو پھر کبھی دیکھنی ہمیں نصیب نہ ہوگی۔ حضرت مفتی شوکت علی فہمی تاریخ ملتِ اسلامیہ ہند کا اب ایک زریں باب بن کر رہ گئے ہیں۔ مورخ اسلام کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں خاص مقام و مرتبہ عطا فرمائے۔ اور ہم سب کو ان کے صاحبزدگان و صاحبزادیوں و متعلقین و عزیز و اقارب اور تمام متعارف لوگوں کو اس حادثۂ وفات پر صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مہر کا فلسفہ اور اس کے احکام

تیسری اور آخری قسط

مولانا محمد شہاب الدین ندوی فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

مہر میں جائداد دینے کا ثبوت:

مہر میں نقد روپیہ یا سونا چاندی یا کوئی جائیداد وغیرہ بھی دی جا سکتی ہے۔ بلکہ موجودہ دور کے ناگفتہ بہ حالات کے لحاظ سے عورت کے تحفظ کے لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ منکوحہ کے مہر میں کوئی غیر منقولہ جائیداد دے دی جائے یا مہر کے رقم سے کوئی چیز خرید کر اس کے نام کر دی جائے۔ بعض حدیثوں کے مطابق مہر میں غیر منقولہ جائیداد دینے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۹ میں جس طلاق اور خلع کا تذکرہ موجود ہے اس کی تفسیر میں مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ایک صحابی (ثابت بن قیسؓ) نے اپنی بیوی حبیبہ بنت سہلؓ کو مہر میں ایک باغ دیا تھا۔ [1]

اسی طرح ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا کہ کیا تم اس بات سے راضی ہو کہ میں تمہارا نکاح فلاں عورت سے کر دوں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ پھر آپ نے مطلوبہ عورت سے پوچھا کہ کیا تم اس بات سے راضی ہو کہ میں تمہارا نکاح فلاں شخص سے کر دوں؟ خاتونِ مذکورہ نے بھی اثبات میں جواب دیا۔ تو آپ نے ان دونوں کا نکاح کر دیا۔ صحابی مذکور نے عورت سے صحبت کر لی مگر انہوں نے مہر مقرر نہیں کیا تھا اور نہ ہی پیشگی کوئی چیز دی تھی۔ صحابئ مذکور حدیبیہ میں شریک تھے اور خیبر میں بھی ان کا حصہ تھا۔ جب ان کی موت قریب آگئی تو انہوں نے (لوگوں سے) کہا کہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نکاح فلاں عورت سے کیا تھا اور میں نے اس کا مہر مقرر نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی چیز دی تھی۔ لہٰذا اب میں تمہیں

گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے اس کے مہر میں اپنا وہ حصہ دے دیا جو مجھے خیبر میں ملا تھا۔ تو اس عورت نے وہ حصہ لیا اور اسے ایک لاکھ درہم کے عوض میں فروخت کر دیا۔[۱]

اس حدیث سے ضمناً یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مرد اور عورت دونوں کی طرف سے وکیل ہو تو وہ دونوں کا نکاح ایک لفظ کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ یعنی "میں نے تم دونوں کا نکاح کر دیا"۔ اس طرح ایجاب و قبول دونوں ایک لفظ کے ذریعہ ادا ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔

پورا مہر کب واجب ہوگا؟ :

اگر کسی نے مہر مقرر کرنے کے عورت سے صحبت کرنے سے پہلے ہی خدانخواستہ کسی وجہ سے طلاق دے دی ہو تو اسے نصف مہر دینا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ صحبت کرلے یا منکوحہ سے تنہائی (خلوت) میں ملاقات کرلے تو پھر پورا مہر واجب ہو جائے گا، خواہ اس نے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو۔

عن سعید بن المسیب ان عمر بن الخطاب قضی فی المرأۃ اذا تزوجہا الرجل انہ اذا ارخیت الستور فقد وجب الصداق :

سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورت کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ جب اس سے کوئی شخص نکاح کرتا ہے اور پھر پردے گرا دئے جاتے ہیں تو پورا مہر واجب ہو جاتا ہے۔[۳]

زرقانیؒ نے تحریر کیا ہے کہ پردے گرا دینے سے مراد میاں بیوی کا تخلیہ میں ملنا ہے، اگرچہ اس موقع پر نہ تو پردے موجود ہوں اور نہ دروازہ بند کرنا۔[۴]

قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ : اذا ارخیت الستور فقد وجب الصداق والعدۃ :

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب پردے گرا دئیے جائیں تو پھر مہر اور عدت لازم ہو جاتے ہیں۔[۵]

ان عمر و علیاً رضی اللہ عنہما قالا : اذا اغلق باباً وارخی ستراً فلها الصداق کاملۃ وعلیہا العدۃ :

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب (میاں بیوی پر) دروازہ بند کرلیا جائے اور پردہ چھوڑ دیا جائے تو پھر عورت کے لئے پورا مہر اور اس پر عدت ضروری ہے۔ ۷

قضاء الخلفاء الراشدین المھدیین انہ من اغلق بابًا وارخیٰ ستراً فقد وجب الصّداق والعدّۃ ؛

خلفائے راشدین کا فیصلہ تھا کہ جس نے دروازہ بند کرلیا اور پردہ لٹکا لیا تو مہر اور عدت دونوں واجب ہوگئے۔ ۸

عن زید بن ثابتؓ فی الرّجل یخلو بالمرأۃ فیقول لم امسّھا، وتقول قد مسّنی، فالقول قولھا ؛

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جو منکوحہ عورت سے تنہائی میں ملتا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا (صحبت نہیں کی) مگر عورت کہتی ہے کہ اس نے مجھے ہاتھ لگایا ہے تو ایسی صورت میں عورت کا قول معتبر ہوگا۔ ۸

عن الزھریؒ قال: اذا اغلقت الابواب وجب الصّداق والعدّۃ والمیراث،

امام زہریؒ نے فرمایا کہ جب دروازے بند کردیئے جائیں تو مہر، عدت اور میراث واجب ہوجاتے ہیں۔ (یعنی عورت شوہر کی میراث میں حصہ دار بن جاتی ہے)۔ ۹

من کشف امرأۃً فنظر الی عورتھا فقد وجب الصّداق: جس نے عورت کا کپڑا کھولا اور اس کی شرمگاہ کی طرف نظر ڈالی تو مہر واجب ہوگیا۔ ۱۰

من کشف خمار امرأۃٍ ونظر الیھا فقد وجب الصّداق، دخل بھا اولم یدخل ؛

جس نے عورت کی اوڑھنی اتاری اور اس کی طرف دیکھا تو مہر واجب ہوگیا خواہ مجامعت کرے یا نہ کرے۔ ۱۱

مہر ادا نہ کرنے کی نیت کرنے والا زانی ؛

جیسا کہ تفصیل گزر چکی مہر عورت کا ایک شرعی حق ہے جو اس سے حصولِ لذّت اور لطف اندوزی کے بدلے میں عائد ہوتا ہے۔ عورت چونکہ فطری وطبیعی اور جسمانی اعتبار سے ایک کمزور مخلوق ہے، جبکہ اس کے برعکس مرد کو قوی ہیکل اور طاقتور بنایا

گیا ہے۔ اس لئے فطری و طبیعی اعتبار سے مرد اور عورت کے اس فرق و تفاوت کا لحاظ رکھتے ہوئے شریعت نے عورت کے تحفظ کی خاطر مرد پر ایک قابل لحاظ مال فرض کیا ہے کہ وہ نکاح کے موقع پر عورت کو ادا کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مردوں کو تاکید ہے کہ وہ نکاح مال کے ذریعہ حاصل کریں۔

ان تبتغوا باموالکم: تم اپنے مالوں کے بدلے میں طلب کرو۔ (نساء: ۲۴)
اور حدیثوں میں تاکید ہے کہ عورتوں سے لطفِ صحبت اپنے بہترین مالوں کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔

استحلوا فروج النساء باطیب اموالکم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کی شرمگاہوں کو اپنے بہترین مالوں کے ذریعہ حلال کرو۔[۱]

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عورت مرد کے لئے خداوند کریم کی جانب سے دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی تحفہ ہے۔ اس لئے اس قیمتی تحفے کے حصول کے لئے اس راہ میں بہتر سے بہتر "قیمت" بھی صرف کرنی چاہیئے۔ ورنہ یہ بات خداوند کریم کی ناشکری ہوگی۔ کیونکہ اس نے خدائے خلاّق کے ایک "حسین تحفے" کی ناقدری کی ہے بلکہ اس کے احکام کی بھی خلاف ورزی کی ہے۔ لہذا وہ دوہری سزا کا مستحق ہوگا۔

بہرحال جو شخص قرآن اور حدیث کی ان تاکیدوں سے صرف نظر کرتے ہوئے مہر کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے یا سرے سے دینے کی نیت ہی نہیں رکھتا تو ایسا شخص شریعت کی نظر میں خدا کا نافرمان اور سخت گنہ گار ہی نہیں بلکہ وہ زانی کے حکم میں ہوگا۔ جسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلیل و رسوا کرے گا۔ جیسا کہ مختلف حدیثوں میں ایسے شخص کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔

ایّما رجل اصدق امرأۃ صداقاً واللہ یعلم انہ لا یرید اداءہ الیھا فغرّھا باللہ واستحلّ فرجھا بالباطل، لقی اللہ یوم القیامۃ وھو زانٍ۔ وایّما رجلٍ ادّان من رجلٍ دیناً واللہ یعلم منہ انہ لا یرید اداءہ الیہ، فغرّہ باللہ واستحلّ مالہ لقی اللہ عزّ وجلّ یوم یلقاہ وھو سارقٌ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت کا مہر مقرر کیا، اس حال میں کہ اللہ اسے بخوبی جانتا ہے کہ اس کی نیت ادا کرنے کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اللہ کو دھوکا

دیتا ہے۔ اور اس عورت کی شرمگاہ کو ناحق حلال کرتا ہے تو وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے ایک زانی کے روپ میں حاضر ہوگا۔ اسی طرح جس نے کسی دوسرے شخص سے کچھ ادھار لیا اس حال میں کہ اللہ بخوبی جانتا ہے کہ اس کا ارادہ اس قرض کی ادائیگی کا نہیں ہے تو وہ اللہ کے ساتھ دھوکا کرتا ہے اور اس شخص کے مال کو ناجائز طریقے سے حلال قرار دیتا ہے۔ تو ایسا شخص قیامت کے دن اللہ سے ایک چور کے روپ میں ملے گا۔ [۳]

ما من رجل ينكح امرأة بصداق، وليس في نفسه ان يؤديه اليها، الا كان عند الله زانياً. وما من رجل يشتري من رجل بيعاً، وليس في نفسه ان يؤديه الا كان عند الله خائناً۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے کچھ مہر کے عوض نکاح کرتا ہے لیکن اس کی نیت اسے ادا کرنے کی نہیں ہوتی تو وہ اللہ کے نزدیک زانی شمار کیا جائے گا۔ اور جو شخص کسی دوسرے شخص سے کوئی چیز (ادھار) خریدتا ہے مگر اس کی نیت (رقم) ادا کرنے کی نہیں ہوتی تو وہ اللہ کے نزدیک خیانت کرنے والا ہوگا۔ [۴]

ايما رجل تزوج امرأة على صداق، وهو يريد ان لا يعطيها فهو زان۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے کچھ مہر کے بدلے نکاح کرتا ہے مگر وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو وہ زانی ہے۔ [۵]

ايما رجل تزوج امرأة على ما قل من المهر او كثر ليس في نفسه ان يؤدي اليها حقها خدعها، فمات ولم يؤد اليها حقها لقي الله يوم القيامة وهو زان۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا۔ چاہے کم مہر پر ہو یا زیادہ پر اور اس کے دل میں اس کی ادائیگی کا خیال نہ ہو تو اس نے اس عورت کو دھوکا دیا۔ اور اگر وہ اسے ادا کئے بغیر مر گیا تو وہ اللہ کے سامنے زانی بن کر حاضر ہوگا۔ [۶]

اس سلسلے میں مردوں کا ایک بہت بڑا معاشرتی و سماجی جرم عام ہے کہ بعض لوگ کسی عورت سے بیاہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ چند دن تک گلچھرے اڑا کر اسے ایک مسلی ہوئی کلی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ یا اسے طلاق دے کر اس کا مہر تک ہضم کر جاتے ہیں۔ تو ایسے عیاش اور بدکار لوگوں کے بارے میں بھی سخت وعید آئی ہے اور اس قسم کی نفی

کو بہت بڑا سماجی گناہ بتایا گیا ہے۔

ان اعظم الذنوب عند الله رجل تزوج امرأة، فلما قضی حاجته منها طلقها و ذهب بمهرها!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک عظیم ترین گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے کہ جب اپنی ضرورت پوری کرلے تو اسے طلاق دیکر اس کا مہر چٹ کر جائے۔

مہر کے موجودہ طریقوں میں اصلاح ضروری!

خلاصۂ بحث یہ کہ معاہدۂ نکاح کے ذریعہ ایک عورت اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے مرد کے سپرد کر دیتی ہے اور اس کے ماتحت اور زیر دست رہ کر اپنے آپ کو شوہر اور بچوں کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ اگرچہ ایک حیثیت سے وہ اپنے گھر کی "ملکہ" ضرور ہے، کیونکہ مرد کے حقوق کی طرح اس کے بھی حقوق ہیں، مگر وہ مرد کی ماتحت ہونے کی وجہ سے بہت بڑی حد تک اس کی "خادمہ" ہے۔ لہٰذا اس کے حقوق کے تحفظ کے لئے اسلام نے ایک قابلِ لحاظ رقم اس کی خدمات کے صلے کے طور پر مرد پر واجب قرار دی ہے، جسے ادا کرنا اس کے ذمہ ہر حال میں ضروری ہے۔ اگر وہ عورت کے اس حق کو دنیا میں ادا نہیں کرتا تو اسے آخرت میں ادا کرنا پڑے گا، جو اس کے لیے بہت مہنگا ثابت ہوگا۔ اس لیے مردوں کے لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے مہر دنیا ہی میں ادا کر دیں۔

موجودہ دور کی کوتاہیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مرد عمر بھر مہر ادا کرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ مگر مرنے کے بعد عورت کا مہر اس کے ترکے میں سے دلایا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ کچھ چھوڑ کر مرا ہو اور اس کے وارثین بیوہ کا مہر خوش دلی اور انصاف کے ساتھ دیدیں۔ ورنہ اگر وہ مفلس اور قلاش ہو کر دنیا سے رخصت ہوا ہے تو وہ ایک قرضدار کی حیثیت سے ایک بہت بڑا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے مرتا ہے، جو قیامت کے دن واجب الادا ہوگا۔

چنانچہ ایک حدیث صحیح میں مذکور ہے :

لتؤدن الحقوق الیٰ اھلھا یوم القیامۃ۔ حتیٰ یقاد للشاۃ الجلحاء من الشاۃ القرناء ؛

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم قیامت کے دن حقداروں کو ان کے حقوق ضرور ادا کروگے ۔ یہاں تک کہ ایک بے سینگ بکری کے لئے سینگ دار بکری کو لایا جائے گا (اور اس سے بے سینگ والی بکری کا حق دلایا جائے گا)۔ [18]

علامہ ابن تیمیہؒ نے تحریر کیا ہے کہ بعض اہل جفا اور ریاکار لوگ محض فخر و ریاکاری اور دکھاوے کی خاطر لمبے چوڑے مہر باندھ لیتے ہیں ۔ مگر وہ شوہر سے مہر لینے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے اور نہ شوہر ہی انہیں کچھ دینے کی نیت رکھتا ہے ۔ تو یہ بات سخت قبیح اور منکر درجے کی ہے جو سنت کے مخالف اور شریعت سے خارج ہے ۔ [19]

چنانچہ آجکل اس کا رواج عام ہوگیا ہے کہ زیادہ تر لوگ اپنی لڑکیوں کے مہر شوہر کی مالی و اقتصادی حیثیت سے بے انتہا زیادہ باندھتے ہیں ۔ اور اس سے انکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلاق کی کبھی نوبت ہی نہ آنے پائے ۔ مگر اس کی وجہ سے ایک دوسری خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ اگر میاں بیوی میں کسی وجہ سے ناچاقی پیدا ہو جائے اور دونوں میں نباہ نہ ہو سکے تو ایسا شخص بیوی کے حقوق معطّل کر کے اسے لٹکا کر رکھ دیتا ہے ۔ اس طرح نہ تو طلاق واقع ہوتی ہے اور نہ وہ بیوی ہی بن کر رہتی ہے ۔ لہٰذا ایسی صورت میں اگر بیوی اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتی ہو تو اسے مجبوراً خود ہی خلع کا مطالبہ کرتے ہوئے اپنے گراں قدر مہر سے دستبردار ہونا پڑے گا ۔ یا پھر اسی حالت میں اسے گھٹ گھٹ کر مرنا پڑے گا ۔

غرض اس طرح مہر میں بے انتہا زیادتی بسا اوقات خود عورت کے گلے کا پھندا ثابت ہو سکتی ہے ۔ اور ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں ، جن کے ملاحظہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں اس "گراں قدری" کے باعث مصائب میں مبتلا ہیں ۔ اس وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برکت کے لحاظ سے وہ عورتیں عظیم تر ہیں جو "بوجھ" کے لحاظ سے ہلکی ہوں ۔

اس معنی کی متعدد حدیثیں پچھلے صفحات میں گذر چکی ہیں۔

ان تمام اعتبارات سے بہتر یہ ہے کہ عورتوں کے مہر میں مبالغہ نہ کیا جائے۔ اور جہاں تک ہو سکے مہر یا تو نکاح کے وقت پیشگی ادا کر دیا جائے یا کچھ مدت مقرر کر کے اس کے اندر اندر دے دیا جائے۔ مگر پھر بھی مہر کا کچھ حصہ نکاح کے وقت یا شب زفاف سے پہلے دے دینا اچھا اور مسنون ہے۔

حواشی

۱۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر ۲/ ۲۸۰، تفسیر قرطبی ۳/ ۱۴۱۔

۲۔ ابوداؤد کتاب النکاح: ۲/ ۵۹۰، مستدرک حاکم: ۲/ ۱۸۲۔

۳۔ مؤطا امام مالک: ۲/ ۵۲۸، مطبوعہ مصر۔

۴۔ شرح الزرقانی علی مؤطا امام مالک: ۲/ ۱۳۴، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔

۵۔ سنن سعید بن منصور: ۱/ ۱۹۱۔ ۶۔ سنن کبریٰ: ۷/ ۲۵۵۔

۷۔ سنن سعید بن منصور ۱/ ۱۹۲، سنن کبریٰ ۷/ ۲۵۵، مصنف عبدالرزاق ۶/ ۲۸۸۔

۸۔ سنن سعید بن منصور: ۱/ ۱۹۲۔ ۹۔ مصنف عبدالرزاق کتاب النکاح: ۶/ ۲۸۵۔

۱۰۔ بیہقی، منقول از کنز العمال: ۱۶/ ۳۲۳۔ ۱۱۔ سنن دارقطنی کتاب النکاح: ۳/ ۳۰۷۔

۱۲۔ رواہ ابوداؤد فی مراسیلہ: کنز العمال ۱۶/ ۳۲۰۔

۱۳۔ مسند احمد ۴/ ۳۳۲، سنن کبریٰ ۶/ ۲۴۲، رواہ احمد والطبرانی: مجمع الزوائد ۴/ ۲۸۴، ورواہ البیہقی فی شعب الایمان: کنز العمال ۱۶/ ۳۲۳۔

۱۴۔ مصنف عبدالرزاق کتاب النکاح: ۶/ ۱۸۵۔ ۱۵۔ سنن کبریٰ: ۷/ ۲۳۱، ورواہ البزار: مجمع الزوائد: ۴/ ۲۸۴۔

۱۶۔ رواہ الطبرانی فی الصغیر والاوسط ورجالہ ثقات: مجمع الزوائد ۴/ ۲۸۴۔

۱۷۔ مستدرک حاکم کتاب النکاح ۲/ ۱۸۲، سنن کبریٰ: ۷/ ۲۴۱۔

۱۸۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ ۴/ ۱۹۹۷، ترمذی کتاب صفۃ القیامۃ ۴/ ۶۱۲، سنن کبریٰ کتاب الغصب ۶/ ۹۳، مسند احمد ۲/ ۲۳۵۔ ۱۹۔ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۲/ ۱۹۳، مطبوعہ ریاض۔

دعوتِ دین کیلئے قرآن کا بتایا ہوا طریقہ

اشفاق احمد، ایم، ٹی، ایچ، علیگ، شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

اسلام اللہ کا صرف پسندیدہ دین ہی نہیں بلکہ دین کی حیثیت سے وہی ابتدائے آفرینش سے آج تک تمام بندگان خدا کا دین رہا ہے، اور قیامت تک اسکو یہ اعجاز حاصل رہے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسی اسلام کو آخری اور مکمّل شکل میں پیش کیا گیا ہے، آپ نے اپنی تیئس ۲۳ سالہ زندگی میں اللہ کی ہدایات کے مطابق بغیر کسی کمی بیشی کے اس کو انسانوں تک پہونچا دیا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور اس دین کی تبلیغ اور اس کی دعوت ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اسے قبول کر کے اس کے مطابق زندگی گذارنے کا عہد کر چکے ہوں۔ امت مسلمہ کی یہ صرف ذمہ داری ہی نہیں بلکہ اس کا فریضۂ منصبی اور مقصد وجود بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تومنون باللہ (سورہ آل عمران آیت: ۱۱۰)

یعنی تم بہترین امت ہو تمہیں عام لوگوں کی بھلائی کے لئے برپا کیا گیا ہے تم بھلائیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے —— روکتے ہو اور خود اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ معروف ومنکر قرآن کی اصطلاح میں پورے اسلام کو محیط ہیں۔ اس کا کوئی جزیہ اس سے باہر نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لئے کون سا طریقہ اپنایا جائے۔ اللہ نے اپنی کتاب میں اس کے سلسلے میں کیا ہدایات دی ہیں؟ ذیل کی سطور میں اسی پہلو کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

قرآن مجید صرف عقائد، عبادات اور احکام ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ دعوت دین اور اس کے طریقۂ کار کو بھی مفصّل طریقے سے بیان کرتا ہے۔ اس نے داعی کی صفات پر بھی روشنی

ڈالی ہے، دعوت کے اسلوب کو بھی موضوع بنایا ہے اور مخاطبین کی رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے۔ داعی، مدعو اور نفس دعوت ان تینوں کے سلسلے میں قرآنی ہدایات کو ملحوظ رکھنے سے ہی اس ذمہ داری سے ہم سبکدوش ہو سکتے ہیں اور اس کے صحیح اور مثبت نتائج ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔

قرآن حکیم اولاً اس بات پر زور دیتا ہے کہ داعی علم و عمل کے اعتبار سے بلند مرتبہ پر فائز ہو، چنانچہ " اقرأ باسم ربك الذى خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربك الاكرم الذى علم بالقلم، علم الانسان مالم يعلم" اور " يا ايها المدثر، قم فانذر وربك فكبر" سے يا ايها الذين آمنوا لم تقولون مالا تفعلون"، (سورہ الصف) تک کا طویل سفر طے کئے بغیر داعی اپنی دعوت کو پر اثر اور نتیجہ خیز نہیں بنا سکتا ہے۔ زمانے کی شعوری سطح کا ادراک علم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے علم کا حصول ضروری ہے تاکہ جس زمانے میں دعوت کا فرض انجام دیا جا رہا ہے اس کے نشیب و فراز کا مکمل احساس رہے اور انابت الی اللہ، تقویٰ، طہارت، تزکیۂ نفس اور خشیت الٰہی وغیرہ صفات داعی کے اندر موجود ہوں۔ اس کی زندگی میں دعوت کے اثرات نمایاں ہوں جس چیز کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے اس پر خود عمل پیرا ہو اگر ایسا نہیں ہے تو قول و فعل کا یہ تضاد جہاں اخروی زندگی کے لئے باعث ہلاکت بن سکتا ہے، دعوت کی زندگی کے لئے بھی وہ کم مضر نہیں ہے۔ داعی کا فرض ہے کہ وہ ان صفات کو سب سے پہلے اپنے اندر پیدا کرے۔ داعی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز اپنے قریبی متعلقین سے کرے کیونکہ قریبی لوگ جب اس کے ہم نوا اور ہم خیال ہوں گے تو وہ اپنی دعوت کو مستحکم کر سکتا ہے اور دوسروں کو یہ کہنے کا موقعہ نہیں ملے گا کہ گرد و پیش میں تاریکی ہی تاریکی ہے اور چلے ہیں پوری دنیا کو روشنی دکھانے۔

دعوت کا اسلوب اور طریقہ کار کیا ہو؟ اس سلسلہ میں قرآن مبین کی سب سے پہلی ہدایت یہ ہے " ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة" (سورہ النحل آیت ۱۲۵) یعنی اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور بھلی باتوں کے ذریعہ بلاؤ۔ حکمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کا کوئی متعین مفہوم بیان کرنا مشکل ہے۔ زمانہ، ضرورت اور مخاطب

ہر لحاظ سے اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔ دعوت بالکل واضح ہو کہ اس میں کسی طرح کی کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ہو۔ علم و بصیرت کی روشنی میں دعوت کو پیش کیا جا رہا ہو۔ طریقہ کار کے لئے ہمیں ان تمام مثبت طریقوں کو اپنانا ضروری ہے جن کو اپنا کر ہر زمانہ میں کسی بھی دعوت اور فکر کو لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہو۔ اسلام غیر اخلاقی اور غیر سنجیدہ ذرائع کو چھوڑ کر تمام مہذب اور شائستہ ذرائع استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ دعوت کے موضوعات جہاں اسلام کے بنیادی تصورات، توحید، رسالت اور آخرت ہوں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ کی ابھری ہوئی برائیاں بھی اس کا موضوع بنیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جن پریشانیوں سے لوگ دوچار ہوتے ہیں ان کو زیر بحث اگر نہ لایا جائے تو وہ کوئی صحیح بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ قرآن مجید نے انبیاء کرام کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں فرعونیوں کو اللہ واحد کی طرف بلایا وہاں اس بات پر بھی زور دیا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کرو۔ حضرت لوط علیہ السلام نے معاشرہ کی اہم برائی غیر فطری طریقوں سے یعنی ہم جنسی کے ذریعہ خواہشات کی تکمیل پر زبردست تنقید کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے توحید کی دعوت کے ساتھ ساتھ ناپ تول میں کمی بیشی کو موضوع بحث بنا کر قوم کو اس غلط حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ان انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل درست ہے کہ معاشرہ کی ابھری ہوئی برائیوں کو ضرور موضوع بحث بنانا چاہیئے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان سے پریشان ہوتے ہیں ان کی ہمدردیاں دعوت کو حاصل ہو جاتی ہیں اور تھوڑی سی محنت کے بعد وہ داعی کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔

دعوت کی زبان نرم ہونی چاہیئے۔ فرعون جیسے جابر اور اپنے کو خدا کہلانے والے کے پاس جب حضرت موسیٰ و ہارون تشریف لے لاتے جاتے ہیں تو اس سے نرم انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اذھبا الی فرعون انہ طغیٰ۔ فقولا لہ قولاً لیناً لعلہ یتذکر او یخشیٰ۔ (سورہ طٰہٰ آیت ۴۳)

خطابات کے الفاظ اپنے پہلو میں پیار کا عنصر لئے ہوئے ہوں۔ جیسے کہ اکثر انبیاء

کرام کا دستور رہا ہے کہ انہوں نے خطاب کرتے وقت مخاطبین کے لئے اے لوگو! اے میری قوم! اے وہ لوگو! جو یہودی ہوئے! جو نصرانی ہوگئے! اور اے وہ لوگو جو ایمان لائے! جیسے الفاظ سے پکارا ہے ایسا نہیں کہا کہ اے کافرو! اے مشرکو! اے دین حق کے دشمنو! جیسے الفاظ سے پکارا اور مخاطب کیا ہو جس سے الفت و محبت کی راہ ہموار ہونے کے بجائے عداوت و نفرت کی خلیج قائم ہو جائے۔ اسی طرح مخاطب کے طبعی رجحان اور اسکی نفسیات کا خیال رکھنا بھی داعی کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ غور و فکر کی طاقت و قوت فہم و ادراک کے مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ داعی کے طریق کار کا ایک اہم حصہ سحر بیانی ہے جسے علم معانی کے اصولوں پر مشتمل ہونا چاہیئے کہ ایک چیز کو مختلف انداز سے بیان کیا جا سکے خواہ وہ تحریری دعوت ہو یا تقریری۔ قرآن حکیم کی تلاوت و مطالعہ سے مذکورہ چیزوں کا واضح طور پر ثبوت ملتا ہے جس کا بڑا فائدہ یہ ہیکہ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاسکے گا۔ دعوت کا مقصد چونکہ باطل اعتقادات و رسم و رواج کو ختم کرنا اور اس کی جگہ پر ہدایت کے منارے قائم کرنا ہے اس لئے مدعوبین کے ذہن و قلب میں باطل معتقدات اور رسم و رواج کے حسن و جمال اور محبت کو یکسر ختم کرنا آسان نہیں ہوتا ایسی صورت میں ان عقائد و رسوم کو براہ راست باطل نہ ٹھہرایا جائے بلکہ ان غلط وابستگی کے فکری اسباب کی اصلاح کی جائے ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ اصلاح کے بجائے مخالفت و ہٹ دھرمی کا میدان گرم ہو جائے گا۔ ارشاد ہے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم کذالک زینا لکل امۃ عملھم" (سورہ انعام آیت: ۱۰۹)

یعنی" اور تم ان لوگوں کو گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔ کہ وہ حد سے گذر کر بے جانے بوجھے اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔ ایسے ہی ہم نے ہر امت کی نظر میں ان کے اعمال کو خوبصورت بنا دئے ہیں" مخاطب کے طبعی میلان کا جائزہ لینا اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا چاہیئے لہٰذا اگر مخاطب کا طبعی میلان کسی اور چیز میں لگا ہوا ہے اور وہ بجائے نصیحت حاصل کرنے کے اعتراض کی بوچھار

کرنے کے حق میں ہو تو ایسے موقع پر دعوت دین کا قرآنی دستور یہ ہیکہ داعی دعوت سے اس وقت باز رہے اور اس کیفیت کے فرد ہو جانے کے بعد اصلی مقصد کی طرف متوجہ ہو۔ قول باری ہے :"اذا رایت الذین یخوضون فی آیاتنا فاعرض منھم حتیٰ یخوضوا فی حدیث غیرہ۔" یعنی" جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان سے منہ موڑ لو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں" دعوت کا فریضہ انجام دیتے وقت داعی کو اپنے ماحول و گردوپیش کا پوری مستعدی و ہوشیاری سے جائزہ لینا چاہیئے۔ اور جب بھی کوئی موقع میسر آئے تو بغیر کسی تاخیر کے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدخانہ میں اپنے قیدی ساتھیوں سے دعوت کا کام اس انداز پر شروع کیا تھا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

"یٰصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار، ماتعبدون من دونہ الا اسمآء سمیتموھا انتم وآباءکم ما انزل اللہ بھا من سلطان"
(سورہ یوسف آیت: ۳۹-۳۸)

یعنی اے میرے قیدخانہ کے دونوں ساتھیو! کیا بہت سے رب بنانا بہتر ہے یا ایک اللہ واحد قہار کو؟ تم اور تمہارے آباء و اجداد چند ناموں کے سوا اور کچھ نہیں پوجتے جن کو تم اور تمہارے آباء و اجداد نے گھڑ لئے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ؎

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

احمد امین اور انکی خود نوشت سوانح حیات

صفدر سلطان، شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

احمد امین کا شمار جدید مصر کے ممتاز اور منفرد ادیبوں میں ہوتا ہے وہ مصر کے ایک گاؤں سمخراط میں یکم اکتوبر ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے [1] ان کے والد انتہائی متقی، دیندار اور علم دوست فرد تھے۔ انہیں اپنے اولاد کی بہترین تربیت اور اعلیٰ تعلیم کا بیحد خیال تھا [2] چنانچہ پانچ سال کی عمر میں انھوں نے احمد امین کو ایک مکتب میں داخل کر دیا جہاں کا ماحول خالص مذہبی ماحول تھا لیکن عام مکاتب کی طرح یہاں بھی صفائی ستھرائی وغیرہ کا معقول نظم نہیں تھا۔ دس سال کی عمر میں انہیں ایک جدید طرز کے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں تمام جدید سہولیات فراہم تھیں اور جدید مضامین مثلاً جغرافیہ، تاریخ اور حساب وغیرہ داخل نصاب تھے۔ چودہ برس کی عمر میں ان کے والد نے انھیں ازہر میں داخل کر دیا۔ وہ یہاں کے جامد علمی ماحول اور کٹر دینی فضا سے مطمئن نہیں تھے لیکن والد کے دباؤ کی وجہ سے انہیں مجبور ہونا پڑا۔ [3]

ازہر میں کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں طنطا کے ایک مدرسے میں عربی پڑھانے کا موقع مل گیا۔ لیکن رہائش وغیرہ کے معقول نظم نہ ہونے کی وجہ سے یہ قاہرہ واپس لوٹ آئے [4] اسی دوران انہوں نے مصری یونیورسٹی کے ایک کالج میں داخلہ کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ خوش قسمتی سے انھیں اسکندریہ کے مدرسہ راتب پاشا میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لئے تقرر مل گیا جہاں کے پرسکون اور علمی ماحول میں مطالعہ اور غور و فکر کے لئے کافی فرصت

---

[1] حیاتی، احمد امین ص: ۱۲۔ مکتبۃ الآداب قاہرہ ۱۹۵۲ء

[2] ایضاً ص ۱۷۔

[3] ایضاً ص ۵۳ - ۵۵۔

[4] ایضاً ص ۶۶ - ۶۷۔

ملی۔ یہاں انھیں شیخ عبدالحکیم بن محمد کی ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا جو گوناگوں علمی و دینی صلاحیتوں کے مالک تھے۔[1]

احمد امین اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے بیحد متفکر مند تھے۔ اس لئے تدریس میں یہ پوری دلچسپی کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے چنانچہ ۱۹۰۷ء میں جب مشہور مصری زعیم سعد زغلول نے مدرسۃ القضاء الشرعی کے قیام کا اعلان کیا تو انہوں نے فوراً اس میں داخلہ لے لیا۔ اس اسکول میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مصر کے معروف عالم اور منتظم عاطف برکات اس اسکول کے پرنسپل تھے۔ احمد امین نے مدرسہ کی تعلیم، اس کے علمی ماحول اور پرنسپل کی شخصیت سے مکمل استفادہ کیا۔[2]

مدرسے سے فراغت کے بعد انھیں اس میں تدریس کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ یہ اخلاق، تاریخ فقہ اور منطق پر لکچر دیا کرتے تھے۔ انگریزی سیکھنے کا موقعہ بھی انہیں اسی دوران حاصل ہوا۔ مدرسے کے اساتذہ مختلف یونیورسٹیز اور کالجز کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی علمی صلاحیتیں بھی مختلف نوعیتوں کی تھیں۔ ان کے ساتھ رہ کر احمد امین کو اپنے فکری و علمی نشو نما میں کافی مدد ملی۔ ان احباب ہی کے تعاون سے انھوں نے ۱۹۱۳ء میں "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا۔ جس کے وہ تاحیات ڈائرکٹر رہے۔ اس ادارے سے نکلنے والے رسالہ "الثقافہ" کی ایڈیٹرشپ بھی ان ہی کے حصہ میں رہی۔[3]

۱۹۲۶ء میں جب کہ وہ بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے مدرسۃ القضاء سے الگ ہو کر ازبکیہ میں قضاء کے فرائض انجام دے رہے تھے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے انہیں فواد یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دینے کی دعوت دی جسے انھوں نے معمولی پس و پیش کے بعد قبول کر لیا۔ یہاں انہیں فقہ کے ساتھ ادب، لغت اور گرامر پڑھانے کا موقعہ ملا۔ یونیورسٹی میں موجود یورپی اساتذہ سے

۱۔ حیاتی، احمد امین ص ۸۰۔

۲۔ ایضاً ص ۸۹ - ۱۰۸۔

۳۔ حیاتی، احمد امین ص، ۱۵۵

بھی انھیں کافی فائدہ پہونچا۔ مستشرقین کے طریقۂ بحث و تحقیق سے براہ راست واقفیت کے بعد
ان کی فکری زندگی میں واضح تبدیلیاں آئیں اور بحث و نظر کی نئی راہیں کھلیں جس کا اندازہ ان کی
تصنیفات مثلاً فجرالاسلام، ضحی الاسلام، ظہرالاسلام اور یوم الاسلام وغیرہ سے بآسانی کیا جاسکتا
ہے۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد مختلف علمی ضروریات کے تحت انھیں عرب اور بیرون عرب کا سفر
کرنے کا موقعہ ملا جہاں مختلف کانفرنسوں میں اپنے تحقیقی مقالات پیش کئے۔[۱] یونیورسٹی میں
ان کی علمی سرگرمیوں کی قدر کی گئی۔ چنانچہ یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو انہیں ڈین فیکلٹی آف آرٹس بنا دیا
گیا۔ یہ ان کے لئے بہت بڑا اعلیٰ اعزاز تھا۔[۲]

یونیورسٹی میں تدریس کے دوران انہیں مختلف اکیڈمیوں اور انجمنوں نے اپنی ممبرشپ
عطا کی جن میں "المجمع العلمی بدمشق" اور "مجمع اللغۃ العربیہ بالقاہرہ" قابلِ ذکر ہیں۔[۳] اپنی علمی جد
وجہد اور لگن کی وجہ سے انہوں نے ان سب کا حق ادا کیا۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں مجلس کلیۃ الآداب اور مجلس
جامعہ فواد اول نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ مصری حکومت نے ان کی خدمات کا اعتراف
کرتے ہوئے جائزہ فواد اول عطا کیا۔[۴]

الغرض احمد امین کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری۔ تصنیف و تالیف ان کا
محبوب مشغلہ تھا۔ محنت، جانفشانی، صبر، استقلال، آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل ان کی زندگی
کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مسلسل جد وجہد کی وجہ سے ان کے قویٰ مضمحل اور اعضاء جواب دے
چکے تھے۔ آخر کار ۳۰ جون ۱۹۵۴ء کو علم و ادب کا یہ تابناک ستارہ ہمیشہ کے لئے قاہرہ کے
افق پر غروب ہوگیا۔[۵]

۱۔ ایضاً ص ۲۰۷ – ۲۴۶۔
۲۔ ایضاً ص ۲۵۵ – ۲۵۹۔
۳۔ مجلۃ المجمع العلمی بدمشق ج ۲۹ ص ۴۴۰۔
۴۔ ایضاً ص ۴۴۰۔
۵۔ المحافظۃ والتجدید، انور الجندی ص ۲۸۲۔

گرچہ احمد امین کو ادب، تاریخ، تنقید، تفسا ورفقہ میں درک حاصل تھا۔ لیکن ادب اور تاریخ مین ان کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ فکری تنقید میں ان کی کتاب "النقدالادبی" کا نام ضرور لیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر اخذ و استفادہ پر مشتمل ہے۔ ان کی تصنیفات میں ضحی الاسلام فجرالاسلام، یوم الاسلام اور ظہورالاسلام کو جدید دور کا علمی و ادبی شاہکار مانا جاتا ہے ان تصنیفات میں انہوں نے اسلام کی فکری، علمی اور ثقافتی تاریخ کو انتہائی اچھوتے، دلنشیں اور سلیس انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ادب کے پہلو سے ان کی کتاب "حیاتی" سرفہرست ہے۔ یہ ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ یہ مقالہ اسی کے تعارف پر مشتمل ہے۔

احمد امین کی کتاب "حیاتی" دراصل ان کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ ان کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے۔ بعد میں ان ہی یادداشتوں کو انہوں نے کتابی شکل دیدی احمد امین اس کتاب کے مقدمہ میں خود اسکی وضاحت کرتے ہیں۔

"اپنی زندگی کی تاریخ لکھنے کا خیال مجھ کو بچپن سے دامن گیر رہا ہے۔ چنانچہ میں اپنے سفر کی روداد، خاندان میں اپنے نجی احوال اور ہر سال کے اہم اچھے برے واقعات کی تفصیلات برابر لکھتا رہا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میرا یہ عمل کسی نظم کا باقاعدہ پابند نہیں تھا۔ ان میں کچھ وقفے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ پھر میرے ذہن میں ان واقعات کی باقاعدہ ترتیب کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کے واقعات کو یاد کرنے کے لئے میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ جب مجھے کوئی نیا واقعہ یاد آجاتا تو میں اسے انتہائی اختصار کے ساتھ بلا کسی ترتیب کے نقل کر دیتا جب میں اس سے فارغ ہوگیا تو اپنی پہلے کی لکھی ہوئی یادداشتوں کو نکالا اور ان دونوں کو سامنے رکھ کر اس نئے انداز میں ترتیب دیدیا جیسا کہ آج قارئین دیکھ رہے ہیں۔" [1]

اس کتاب میں احمد امین نے بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کے اہم واقعات کو مرتب کرنے کی

---

[1] مقدمہ، حیاتی، احمد امین ص ۶-۷۔

کوشش کی ہے۔ اسطرح یہ کتاب ان کی علمی زندگی کی تاریخ بن جاتی ہے۔ ان کی زندگی یقیناً مرتب کئے جانے کے لائق تھی۔ عصر حاضر میں جو تجربات مختلف سطحوں پر انہیں حاصل ہوئے وہ اس دور کے بہت سے ادباء اور انشاپردازوں کو حاصل نہیں ہوسکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ احمد امین نے اس کتاب میں بچپن، گھر، خاندان، والدین، اعزا و اقرباء، ابتدائی مدارس، جامعہ ازہر، دوست واحباب، اساتذہ، سفرنامے، علمی ارتقاء، تجربات، ملازمت، مرض الغرض تمام چیزوں کی تفصیلات انتہائی سلیس اور دلنشیں انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس کتاب کا ہر اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ طوالت سے گریز کرتے ہوئے یہاں صرف اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔ وہ اسکندریہ اپنے عربی شیخ عبدالحکیم سے ملاقات اور ان سے اخذ و استفادہ کے بعد اپنے تأثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :۔

"ان کی ملاقات نے میری خامیوں کو دور کر دیا۔ میرے نفس میں وسعت پیدا کر دی اور میرے افق کو روشن کر دیا۔ میں کتاب کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے مجھ کو بتایا کہ دنیا کتاب میں نہیں ہے" [1]

"مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ انہوں نے مجھ کو بیدار کر دیا۔ میں اندھا تھا انہوں نے مجھ کو بصیرت بخشی اور میں تقلید کا عادی تھا انہوں نے مجھے آزادی سے روشناس کرایا" [2]

پوری کتاب اسی انداز میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیک وقت عقل کی چمک دمک، جذبات کا اضطراب اور فن کی رنگ آمیزیاں شامل ہیں۔ انیس المقدسی اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"احمد امین کی یہ کتاب ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جنہیں وہ وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے۔ پھر جب وہ اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہوئے تو انہیں یکجا کر دیا

لہ حیاتی، احمد امین ص ۔ ۷۶۔

لہ ایضاً ص ۔ ۷۸۔

اب یہ ایک کتاب کی شکل میں انتہائی شاندار اسلوب، نادر ندرت اور سچے لہجہ میں منظر عام پر آئی ہے۔ مطالعہ کرنے والا جب ان کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ مؤلف کی پرورش، پرداخت، نشو و نما اور مختلف مراحل ارتقا کا عمل کیسے مکمل ہوا اور کیسے اس نے دنیائے علم و ادب میں ایک شاندار مقام بنا لیا۔" [1]

"حیاتی" کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اسکی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے دونوں کی سیرت میں کافی مشابہت ہے۔ دونوں کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس پر جدید تہذیب و تمدن کی روشنی نہیں پڑتی تھی۔ دونوں نے پہلے ازہر میں تعلیم حاصل کی اور جبہ و عمامہ پہنا لیکن پھر اسے اتار پھینکا اور عصری زندگی میں داخل ہوگئے۔ اس طرح دونوں نے عصری بود و باش کو چھوڑ کر جامعی بود و باش اختیار کر لیا اور دونوں نے اپنی زبان اور اپنی قوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔" [2]

لیکن طٰہٰ حسین اور احمد امین میں سیرت کے اس اشتراک کے باوجود طرز تالیف اور بعض دیگر امور میں کافی تفاوت ہے۔ احمد امین نے علمی اسلوب میں بات پیش کی ہے اور طٰہٰ حسین نے شعری اسلوب میں۔ دراصل دونوں کی ثقافت اور طبیعت میں کافی فرق تھا۔ طٰہٰ حسین زندگی اور اسکے ہنگاموں سے ربط و تعلق قائم کرکے رہنا پسند کرتے تھے۔ اور احمد امین زندگی سے بھاگتے تھے اور گوشۂ عافیت تلاش کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل انور الجندی کی زبانی ملاحظہ کیجئے:۔

"احمد امین اپنی زندگی کے واقعات کو ایک سچے مورخ کی طرح پیش کرتے ہیں انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ عبارت کی خوبصورتی اور حسن باقی ہے کہ نہیں؟ جب کہ طٰہٰ حسین پہلے زندگی کے کچھ واقعات کو لیتے ہیں پھر ان کی ملمع کاری کرتے ہیں اور انھیں آراستہ کرکے پیش کرتے ہیں۔" [3]

---

[1] الفنون الادبیہ، انیس المقدسی ص ۶۰ - ۶۱

[2] ایضاً

[3] اضواء علی الادب العربی المعاصر، انور الجندی ص ۴۷

"خلاصۂ کلام یہ ہے کہ" الأیام" ذات کے گرد گردش کرنے والی ایک طویل گفتگو ہے اور" حیاتی" میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اس لیے کہ اس کے مؤلف کے یہاں نفس سے متعلق گفتگو سخت مشکل کام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الأیام میں اسلوب اور شکل وصورت ہے اور" حیاتی" میں قصے اور واقعات ہیں۔" [1]

استاذ احمد حسن زیات نے" حیاتی" کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان میں" الایام" پر بھی گفتگو آگئی ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک اقتباس پیش کر دیا جائے کیونکہ احمد حسن زیات کا تعلق طٰہٰ حسین اور احمد امین دونوں سے بہت گہرا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

" میں" حیاتی" کو پڑھ کر وہی لذت اور کیف محسوس کر رہا ہوں جو مجھے" الایام" کو پڑھ کر محسوس ہوئی تھی۔ یہ عجیب وغریب قسم کی لذت ہے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی میں ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے پہلے ایسی لذت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی طرز پر لکھی گئی ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں اسلوب اور فن کے علاوہ کسی دوسری چیز کے ذریعہ ہمارے دلوں اور احساسات کو موہ لیتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ چیز نفسانی جمال، صراحت اور تفصیل ہے۔" [2]

احمد امین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انشاپرداز نہیں تھے بلکہ وہ ایک عالم، مؤرخ اور ادیب تھے۔ احمد امین کی کتاب" حیاتی" پر بھی مذکورہ قول کا اطلاق ہوتا ہے۔ انہوں نے اس میں اپنی سنجیدگی، وقار، علمیت اور تاریخ نویسی کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس سلسلے میں عباس محمود عقاد کا یہ تبصرہ بیحد موزوں معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

" اکثر سوانح نگار علمی اور فکری مباحث، مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنے سے احتراز کرتے ہیں لیکن وہ انشاپرداز جو مسائل حیات اور مسائل علم پر غور کرنے

---

[1] اضواء علی الادب العربی المعاصر، انور الجندی ص ۷۳۔

[2] وحی الرسالہ، احمد حسن زیات ۳/۲۱۱-۲۱۲۔

"احمد امین کی یہ کتاب (حیات
مصر کی تاریخ ہے۔ یہ صحیح
تین تذکرے
مجمع الانتخاب
تلخیص نگار نثار احمد فاروقی صاحب
قیمت مجلد ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

کا عادی ہو چکا ہو وہ اپنی تحریروں میں غور و فکر اور علم و ہنر کے دروازے وا کرے گا خواہ اس نے ایسا قصداً کیا ہو یا سہواً۔ چنانچہ احمد امین نے اس کتاب میں تربیت، ادب اور معاشرت کے بہت سے امور پر گفتگو کی ہے اور یہ گفت گو باقاعدہ ابواب کی شکل میں نہیں بلکہ قصوں، واقعات اور سفرناموں کی تفصیلات کے ضمن میں آگئی ہے" ؎۱

احمد امین کی علمی طبیعت اور عقلی مزاج پر انور الجندی اس طرح لکھتے ہیں :۔

"احمد امین اپنی کتاب" حیاتی" میں ادیب کے بالمقابل عالم سے زیادہ قریب ہیں ان کی تمام تحریریں عقلی ہیں وجدانی نہیں۔ انہوں نے اپنے دوست طٰہٰ حسین کی طرح ازہر کو خیرباد کہا اور جبہ و عمامہ اتار پھینکا لیکن یہ مغربی تہذیب کو اختیار کرنے میں طٰہٰ حسین کی طرح جرأت سے کام نہیں لے سکے۔ مغربی معاشرت انہیں پسند تھی لیکن انہوں نے ہمیشہ مشرقی امانت اور اسلامی فکر کا تحفظ کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے مغربی تہذیب کو اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنے مطالعہ سے سمجھا تھا"۔ ؎۲

احمد امین نے اپنی کتاب میں عقل اور علم کے تقاضوں کیساتھ ساتھ تاریخ کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی اس کتاب میں مصر کے ایک پورے دور کی تاریخ سمٹ گئی ہے۔ اسی طرح مقامات پر تبصروں کے ذریعہ مصر کی معاشرتی زندگی کا ایک بہترین نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حق بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے مصنف نے فیصلوں اور احکام کے حدود میں حق و انصاف کے تقاضوں کا پاس رکھا ہے جتنا کہ ممکن تھا۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں صداقت اور سچائی کا عنصر نمایاں ہے۔ تاریخی پہلو سے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے استاذ احمد حسن ... ہیں :۔

؎۱ بین الکتب والناس، عباس محمود عقاد ص ۴۴۔

؎۲ أضواء علی الادب العربی المعاصر، انور الجندی ص ۷۲۔

"احمد امین کی یہ کتاب (حیاتی) ان کی زندگی کی تاریخ کے ساتھ ساتھ پورے مصر کی تاریخ ہے۔ یہ صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی بھی تاریخ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں معاشرتی، معاشی، تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی تمام امور زیر بحث آگئے ہیں۔" [1]

---

[1] وحی الرسالہ، احمد حسن زیات ۲۱۴/۳ مکتبہ النہضۃ المصریہ قاہرہ ۱۹۵۵ء

مکمل لغات القرآن

یہ ہماری زبان میں لغتِ قرآن کے موضوع پر جامع، مکمل اور معتبر و مستند کتاب ہے جو قرآن مجید کے معنی اور مطالب کے سمجھنے اور حل کرنے میں ہر حیثیت سے مدد دے سکے۔

اردو میں کوئی ایسی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس جلیل القدر اور عظیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ اہل علم و تحقیق، اساتذۂ درس کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے آیاتِ قرآنی میں بڑی سہولت سے نکالے جا سکتے ہیں۔

جلد	ابواب	صفحات	غیر مجلد	مجلد
جلد اول	باب الالف	صفحات ۳۳۴	غیر مجلد ۶۰/-	مجلد ۸۰/-
" دوم	باب الباء تا باب الخاء	" ۳۳۰	" ۶۰/-	" ۸۰/-
" سوم	باب الدال المہملہ تا باب الشین المعجمہ	" ۳۰۸	" ۶۰/-	" ۸۰/-
" چہارم	باب الصاد المہملہ تا باب العین المہملہ	" ۳۸۶	" ۶۰/-	" ۸۰/-
" پنجم	باب الغین المعجمہ تا باب المیم	" ۵۰۰	" ۱۰۰/-	" ۱۲۰/-
" ششم	باب النون تا باب الیاء التحتانیہ	" ۳۲۶	" ۶۰/-	" ۸۰/-

پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۱۸۴ متوسط تقطیع ۲۰×۲۶/۸

مجموعی قیمت غیر مجلد ۴۰۰/- مجلد ۵۲۰/- روپئے۔

سرپرست

برہان

جلد ۱۱۱ | مئی ۱۹۹۳ء مطابق ذی قعدہ ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۵

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد اردو بازار دہلی سے شائع کیا

... [illegible] صدی کے تمام دورِ حاضر کا سرسری سا
[illegible] واضح ہوتی ہے کہ تمام عالم میں مسلمانوں کے حالات بتدریج
[illegible] مسلمانوں کو اپنے خراب حالات درست کرنے
کیطرف دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ اپنے خراب حالات سے غفلت
ولاپرواہی میں مبتلا ہوتے ہوئے مزید انتشار وافراتفری [illegible] ہوئے ہیں۔ انگریز
سامراج نے اپنی عیاری ومکاری اور چا[illegible] ساتھ مسلمانوں ہی میں سے [illegible]
کے ذریعے سے منصب خلافت [illegible] اس وقت [illegible]
رہنما علی برادران اور فرنگی محل علماء [illegible] مستقبل کی مسلم [illegible]
ذہن اس خطرہ کو پوری طرح سمجھ نہ سکا، مگر رہنمایان ملت [illegible]
کے خلاف زبردست سازش ہی گردانا — احتجاج کیا، قوم مسلم کو اس کے خلاف [illegible]
کیا، مگر کچھ ہی عرصہ میں راہنمایان ملت کے غلط اندازوں کی بدولت یہ خالص اسلامی
مسئلہ ہندوستان کی سیاسی دہلیز پر لے آگیا۔ اور اس سراسر اسلامی تحریک میں ہندوستانی
سیاست کے اہم ستون موہن چند کرم چند گاندھی کی زور وشور کے ساتھ اس میں شمولیت
نے تحریک خلافت کے رُخ ہی کو موڑ دیا۔ یہ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بجائے اسی طرح
ناکامی سے ہمکنار ہو کر رہی جس طرح ہندوستان کی آزادی کے لئے علماء کرام کے نقطۂ نظر
سے قیام پاکستان سے برصغیر کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصانات کی بُو اور خدشہ واندیشہ
نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا جس نے انھیں قیام پاکستان کے خلاف زبردست تحریک چلانے پر
مجبور کیا جو بالآخر گاندھی ونہرو اور پٹیل کے گھٹنے ٹیکنے کے باعث پاکستان کے وجود میں
آنے کے بعد ناکامی سے دوچار ہوئی پاکستان کے وجود میں آنیکے بعد ہندوستان میں

[illegible]

کی لاشوں پر یہودی قوم کی ایک ناجائز سلطنت اسرائیل نام سے قائم کر لے میں کامیاب ہو کر رہی ۔ اس کے بعد مسلمانانِ عالم کو اپنے دشمنوں کو پہچان کر سنبھلنا چاہیئے تھا ۔ لیکن اس کے برعکس [illegible] کے پیدا کردہ عیش و عشرت کے اسباب کے حصول میں مستغرق رہے [illegible] واسطہ [illegible] نام [illegible] کر رہ گیا ـــــــ یہ کس قدر شرم [illegible] بات [illegible] اسلام دشمن [illegible] عروج حاصل کرتی رہیں [illegible] رہے [illegible] اپنے اعمال و کردار [illegible] سے اور [illegible] عدم [illegible] اسباب [illegible] چالاکی و ریشہ دوانیوں کے طفیل ـــــــ یہاں حیرت و [illegible] بات ہے کہ یہ معلوم ہونے ہوئے بھی کہ دشمن ملت اسلامیہ کے خلاف کامیاب سازشیں کر رہا ہے اس کے باوجود بھی غفلت و لاپرواہی و بے فکری کے ساتھ ان ہی باتوں اور کاموں میں مشغول و منہمک ہیں جو دشمنانِ اسلام کے ناپاک منصوبوں و مقاصد کی برآوری اور بربادئ مسلم میں ان کی طمانیت و مسرت کا باعث ہیں ۔

ایران و عراق جنگ میں دونوں طرف کے لاکھوں مسلمان شہید ہوئے ۹ سالہ جنگ میں اربوں کھربوں کا نقصان الگ سے رہا ۔ شہید ہوئے لاکھوں مسلمان ملت اسلامیہ کے کسی تعمیری کام میں جٹے ہوتے مگر وہ دونوں مسلم حکومتوں کی آپسی جنگ ہی میں کام آ گئے ۔ اسی طرح مال و اسباب جو ملت اسلامیہ کے رفاہی کاموں میں خرچ ہوتے آپس کی لڑائی میں ہی بے جا صرف ہو گئے ۔ اس کے بعد عراق نے اپنی طاقت کے زعم میں کویت پر قبضہ کیا جسکو بہانہ بناتے ہوئے

نظرات

انیسویں صدی کے آخری دنوں اور بیسویں صدی کے تمام دورِ حاضر کا سرسری سا ہی جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام عالم میں مسلمانوں کے حالات بتدریج خراب سے خراب ہوتے گئے اور اس حالت میں بھی مسلمانوں کو اپنے خراب حالات درست کرنے کیطرف دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ اپنے خراب حالات سے غفلت و لاپرواہی میں مبتلا ہوتے ہوئے مزید انتشار و افراتفری ہی کے شکار ہوئے ہیں۔ انگریز سامراج نے اپنی عیّاری و مکّاری اور چالاکی کے ساتھ مسلمانوں ہی میں سے کچھ زرخرید لوگوں کے ذریعے سے منصب خلافت کو تار تار کیا تو اس وقت علمار کرام خصوصاً ہندوستان کے مسلم رہنما علی برادران اور فرنگی محلی علمار دین نے اسے مستقبل کی مسلم بربادی سے تعبیر کیا، عام ذہن اس خطرہ کو پوری طرح سمجھ نہ سکا، مگر رہنمایانِ مِلّت نے اسے مسلمانوں کے خلاف، اسلام کے خلاف زبردست سازش ہی گردانا ــــ احتجاج کیا، قومِ مسلم کو اس کے خلاف بیدار کیا، مگر کچھ ہی عرصہ میں راہنمایان ملت کے غلط اندازوں کی بدولت یہ خالص اسلامی مسئلہ ہندوستان کی سیاسی دہلیز پر لے آگیا۔ اور اس سراسر اسلامی تحریک میں ہندوستانی سیاست کے اہم ستون موہن چند، کرم چند گاندھی کی زور و شور کے ساتھ اس میں شمولیت نے تحریک خلافت کے رُخ ہی کو موڑ دیا۔ یہ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بجائے اسی طرح ناکامی سے ہمکنار ہو کر رہی جس طرح ہندوستان کی آزادی کے لئے علمار کرام کے نقطۂ نظر سے قیام پاکستان سے برصغیر کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصانات کی بُو، اور خدشہ و اندیشہ نے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا جس نے انھیں قیام پاکستان کے خلاف زبردست تحریک چلانے پر مجبور کیا جو بالآخر گاندھی و نہرو اور پٹیل کے گھٹنے ٹیکنے کے باعث پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ناکامی سے دوچار ہوئی پاکستان کے وجود میں آنیکے بعد ہندوستان میں

رہ گئے مسلمانوں اور ان کی عبادت گاہوں کو تباہی و بربادی کے منہ دیکھنے پڑے اسے تاریخ کے ہزاروں صفحات میں بھی درج کیا جائے تو تب بھی اس کے لئے صفحات ہی کم پڑیں گے واقعات و حالات کے ڈھیر پہ ڈھیر کبھی ختم نہ ہونیکو آئیں گے۔

انیسویں صدی میں ہندوستان سے مغلیہ سلطنت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو کر رہا اور بیسویں صدی میں جہاں علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی جیسے دانشوران ملت نے جنم لیا وہاں مصطفیٰ کمال پاشا کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر انگریزی سازشی منصب خلافت کو ختم کرنے اور فلسطینی آبادی کی لاشوں پر یہودی قوم کی ایک ناجائز سلطنت اسرائیل نام سے قائم کرلنے میں کامیاب ہوکر رہی۔ اس کے بعد مسلمانان عالم کو اپنے دشمنوں کو پہچان کر سبھلنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس انگریزی سامراج کے پیدا کردہ عیش و عشرت کے اسباب کے حصول میں مستغرق رہے مذہب و ملت سے ان کا واسطہ صرف برائے نام ہی ہو کر رہ گیا ——— یہ کس قدر شرم افسوس، فکر و غم اور دکھ و صدمہ کی بات ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں عروج حاصل کرتی رہیں اور مسلمان انحطاط پذیر ہوتے رہے کچھ اپنے اعمال و کردار کیوجہ سے اور کچھ کم فہمی، عدم تدبر و دوراندیشی کے فقدان، عیش و عشرت کے بے پناہ اسباب کی فراہمی اور دشمنان اسلام کی عیاری اور چالاکی و ریشہ دوانیوں کے طفیل ——— یہاں حیرت و استعجاب کی بات یہ ہے کہ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ دشمن ملت اسلامیہ کے خلاف کامیاب سازشیں کر رہا ہے اس کے باوجود بھی غفلت و لاپرواہی و بے فکری کے ساتھ ان ہی باتوں اور کاموں میں مشغول و منہمک ہیں جو دشمنان اسلام کے ناپاک منصوبوں و مقاصد کی برآوری اور بربادی مسلم میں ان کی طمانیت و مسرت کا باعث ہیں۔

ایران و عراق جنگ میں دونوں طرف کے لاکھوں مسلمان شہید ہوئے ۹ سالہ جنگ میں اربوں کھربوں کا نقصان الگ سے رہا۔ شہید ہوئے لاکھوں مسلمان ملت اسلامیہ کے کسی تعمیری کام میں جٹے ہوتے مگر وہ دونوں مسلم حکومتوں کی آپسی جنگ ہی میں کام آگئے۔ اسی طرح مال و اسباب جو ملت اسلامیہ کے رفاہی کاموں میں خرچ ہوتے آپس کی لڑائی میں ہی بے جا صرف ہو گئے۔ اس کے بعد عراق نے اپنی طاقت کے زعم میں کویت پر قبضہ کیا جسکو بہانہ بناتے ہوئے

عراق کے خلاف تمام مسلم ممالک کو عیاری ومکاری اور چالبازی کے ساتھ متحد کرکے امریکہ اور اس کے حلیف ممالک برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس وغیرہ نے اتحادی سبھا کو حرکت میں لاکر اور اس کے ریزولیوشنوں کی آڑ میں عراق پر ایسی خطرناک جنگ تھوپی کہ عراق تو برباد ہوا ہی ساتھ ہی مسلم ممالک پر بھی اس جنگ کے اخراجات کا وہ بوجھ پڑا کہ کم از کم سو سال بھی اسکی تلافی کی کوئی صورت ممکن نظر آتی نہیں دیکھتی۔

عرب مالی فنڈ کے ذریعہ جاری کی گئی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ میں عرب ملکوں کو ۶۷۶ ارب (ایک ڈالر ۳۱ ہندوستانی روپیوں کے برابر ہے) کا نقصان ہوا۔ صرف عراق کا ہی اقتصادی ۲۳۷ ارب ڈالر کا ہے جبکہ کویت کا نقصان ۲۴۰ ارب ڈالر کا ہے اور اس جنگ کیوجہ سے اقتصادی پیداوار کی شرح میں کمی کیوجہ سے دیگر عرب ملکوں کو اکیانوے ارب ڈالر کا نقصان الگ سے ہوا۔ جو دولت وطاقت عالم اسلام کی فلاح وبہبود کے کاموں میں صرف ہوتی وہ آپس میں سر پھٹول پر ہوگئی اس سے زیادہ بدقسمتی کی اور بات کیا ہوگی۔ ملت اسلامیہ کے لئے۔

خداوندتعالیٰ نے مسلم ممالک کو اپنے حبیب پاک صلعم کے طفیل وصدقہ میں جو بے بہا خزانہ مرحمت فرمایا اسے عیسائی ممالک والی طاقتوں نے کس ہوشیاری وچالاکی سے بے کار کے کاموں میں لگوا دیا جس سے نقصان ہی نقصان ہو۔ تعمیر وترقی کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔

اسرائیل کے ناجائز قیام کے خلاف عرصہ سے فلسطین کے جانباز مجاہدین جو جدوجہد کر رہے ہیں اس میں بھی اب انتشار دیکھنے کو مل رہا ہے۔ فلسطینی محاذ آزادی کے عظیم رہنما ومجاہد یاسر عرفات کے رقیبوں نے اس وقت ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جبکہ ان کی عظیم قربانیوں کی بدولت ریاست فلسطین کے قیام کی امید روشن نظر آرہی تھی۔ ابو ندال گروپ جو یاسر عرفات کے خلاف شائد کسی اجنبی اشارہ کیوجہ سے ایک عرصہ سے محاذ آرائی میں جٹا ہوا تھا اب اس نے یاسر عرفات کے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اپریل مہینہ میں اس نے یاسر عرفات کے ساتھی کرنل یونس کو گولی مار کر ہلاک

کر دیا اور اس کے بعد یاسر عرفات کے افسران مسافر ابراہیم ترکیو اور پیرس میں ایک ہوٹل کے سامنے فلسطینی محاذ آزادی کے خفیہ پولیس کے چیف آف بیورو کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ تقریباً ۲۶ اعلیٰ دماغ فلسطینی رہنما جو مختلف عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے فلسطین ہی کے دوسرے گروپ کے ہاتھوں جاں بحق ہو گئے۔ یہ موجودہ عالم اسلام کے بدترین حالات ہی ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے سامنے بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی کی تعمیر کا چیلنج ہوا۔ مگر وہ اس چیلنج کو سنجیدگی و دوراندیشی کے آئینہ میں نہ دیکھ کر بالکل سرکس کے جوکروں کی طرح کھیل سمجھتے رہے۔ بابری مسجد کی بازیابی کی تحریک چلا رہے ہیں ان کے سامنے فسطائی طاقتیں ہیں جو ہر طرح لیس ہیں ان کی طاقت اور عیاری و چالاکی کو نہ بھانپتے ہوئے خود ہی آپس میں لڑ جھگڑنے کی سمت چل پڑے۔ جنم بھومی والے پوری سنجیدگی و دوراندیشی اور مکارانہ چالاکیوں "غیبی اسباب" کے ساتھ مستعد عمل رہے جس کے نتیجہ میں بابری مسجد کو مسمار کرنے میں وہ کامیاب ہو کر رہے۔ اور بابری مسجد کی تحریک چلانے والے کئی کئی گروپ سب منہ تکتے رہ گئے، وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو کوستے ڈانتے پھٹکارتے رہے۔ لیکن اس سے ہوتا کیا ہے۔ مسلم دشمن طاقتوں کا جو کام ہونا تھا وہ ہو گیا، اب لکیر پیٹنے سے ہوتا کیا ہے۔

ہماری سوچ و سمجھ کے دیوالیہ پن کی اس سے بڑی نظیر اور کیا ہو گی کہ اس کے بعد بھی ہم تعمیری کاموں کی طرف راغب نہ ہوئے، بابری مسجد کی شہادت سے ہم نے سبق نہیں سیکھا۔ اور ایک دوسرے کے خلاف آپس میں محاذ آرائی پھر شروع ہے۔

خدا بھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جس کو خود اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ ہو ملت اسلامیہ کی شرمناک حالت کب بدلے گی۔ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن آنے والے حالات تمام عالم اسلام کے لئے فکر و تشویش سے بھرے ہوئے ہیں روس کے زوال کے بعد آزاد ہوئی ریاستوں آرمینیا و آذربائیجان اور یوگوسلاویہ کی ریاست بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے دشمنوں کی گہری سازشوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ عصر حاضر اور مستقبل ملت اسلامیہ کے لئے بحرانوں، مشکلاتوں، پریشانیوں اور

ناموافق حالات سے بھرے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اگر ملّتِ اسلامیہ میں صحیح سوجھ بوجھ ہو تو وہ ان ہی مشکلاتوں، بحرانوں، پریشانیوں کو ملّتِ اسلامیہ کی صحیح راہنمائی سے موافق حالات خوشی ومسرت اور روشن مستقبل میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

کاش! عالم اسلام کا ہر فرد قرآن پاک کے عظیم فرمان وارشاد واسوۂ حسنہ صلعم پر عمل پیرا ہوکر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات وزاویۂ نگاہ کے تحت عمل میں لائے یہ ہی تعمیر وترقی اور فلاح وبہبود کا ان کے لئے واحد راستہ ہے۔

ڈاکٹر طیبہ نسرین، سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، اے ایم یو، علی گڑھ۔

ابن اسحاق کی کتاب المغازی سے متعلق حالیہ تحقیقات: تجزیاتی رپورٹ

ابن اسحاق کی کتاب المغازی کو اولین دور کی کتب سیر میں جو امتیاز حاصل ہے اس کی اہم توجیہ تو یہ ہے کہ کتاب المغازی اپنے دور کی پہلی مکمل سیرت تھی، دوسرے اس میں کسی حد تک تاریخی نظریہ کو اپنایا گیا تھا۔ جبکہ اس سے پہلے حضور اکرمؐ پر ایسے مواد جمع کئے جاتے تھے جو فقہی نقطے سے مفید ہوں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مغازی پر بیشتر حاصل معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ موجودہ دور میں اس کی مقبولیت کا ذریعہ سیرت ابن ہشام کو قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ابن ہشام نے جب ترمیم و اضافہ کے بعد ابن اسحٰق کی کتاب ابتدا والمبعث والمغازی کو سیرت النبی کے عنوان سے متعارف کرایا تو ابن اسحاق کی المغازی کے تئیں یہ دلچسپی اور کھوج بھی پیدا ہو گئی کہ ابن اسحاق کا اصل متن کیا تھا؟

ابن اسحٰق ۸۵ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے[1] ان کی ابتدائی زندگی و تعلیم کے بارے میں تفصیلی معلومات مفقود ہیں۔ محمد بن مسلم بن شہاب الزہری کے حلقۂ درس میں آنے کے بعد سے ان کی زندگی کے واقعات جستہ جستہ ملتے ہیں۔[2] انہوں نے مدینہ میں انس بن مالک اور سعد بن مسیب کو دیکھا تھا اس وجہ سے انھیں تابعین میں شامل کیا جاتا ہے۔[3]

خلفائے راشدین کے دور میں علمی حلقوں میں ان احادیث کو زیادہ اہمیت حاصل تھی جو فقہی و دینی مسائل سے استدلال کرتیں، یہ رواج عہد اُمیہ کی ابتدائی دہائیوں میں بھی عام رہا البتہ عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے زمانہ میں پہلی بار مغازی سے متعلق احادیث کی جمع و ترتیب کی ابتدا ہوئی۔[4]

محمد بن شہاب زہری نے اسی دور میں کتاب المغازی کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا ان کے دو شاگرد تھے موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق۔ زہری کے ان دونوں شاگردوں نے بھی فن مغازی میں ہی شہرت حاصل کی لیکن ابن اسحٰق کو موسیٰ بن عقبہ سے زیادہ شہرت ملی۔

ان کی یادداشت بہت اچھی تھی وہ واقعات کو مع چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ بیان کرسکتے تھے۔ ۵ اس سلسلہ میں انہوں نے ان نومسلموں سے بھی معلومات حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا جنکے اجداد یہودی تھے اور خود انہوں نے اپنے بچپن میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معرکے دیکھے تھے۔ ۶

ابن اسحاق کی ایسی ہی معلومات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اسرائیلیات شخص تھا دوسرے وہ احادیث کے بیان میں اکثر و بیشتر تدلیس سے کام لیتے۔ یعنی حدیث بیان کرتے وقت اسناد کے سلسلہ میں اس آخری راوی کا ذکر نہیں کرتے جنکے ذریعہ روایت ان تک پہونچی تھی۔ ان میں سے بعض باتیں جہاں بعد کے زمانہ میں تاریخی فکر سے قریب تر قرار دی گئیں وہیں وہ ابن اسحاق کے زمانۂ حیات میں ان پر سخت ترین اعتراضات کا سبب بنیں، چنانچہ انھیں مدینہ چھوڑنا پڑا پہلے وہ مصر گئے پھر مختلف مقامات مثلاً کوفہ، جزیرہ اور رے سے ہوتے ہوئے بغداد پہونچے۔ یہ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کا زمانہ تھا (۱۳۶۔۱۵۸ھ) وہیں انھوں نے الکتاب الکبیر تصنیف کی جس میں آدم (علیہ) سے لیکر محمد رسول اللہؐ تک تمام انبیاء کے حالات قلم بند کئے گئے تھے۔ یہ کتاب مصر کی کاغذی چادروں پر لکھی گئی تھی۔ اسی کتاب میں سے خلیفہ مہدی کی ایما پر سیرت کا مواد انہوں نے بعد میں الگ کرلیا ۸ جو کتاب المبتدا والمبعث والمغازی کہیں کتاب السیرۃ والمبتدا والمغازی کے عنوان سے روایت کی جاتی رہی۔ ۹ اصل کتاب جامع شکل میں تو اب کہیں نہیں ملتی، اس کی مقبول عام شکل سیرۃ النبی کے عنوان سے کتب سیر کے ماخذ میں شامل ہے اس کے علاوہ بعد کے اہل سیر کے یہاں اس کتاب سے اقتباسات روایت کئے گئے ہیں، یا متفرق واقعات کے تحت چند قلمی نسخے نوادرات میں شامل ہیں۔ یہ نسخے عموماً فارسی و عربی زبان میں ملتے ہیں۔ انہیں میں سے دو فارسی نسخے حال میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے دریافت کئے ہیں۔ ۱۰ جامعہ رباط کے فاضل استاد ابراہیم کتانی نے قرویین کے کتب خانہ سے دو قلمی نسخوں کی فلم انہیں بھیجی تھی۔ یہ یہ نسخے اس درجہ خستہ حالت میں ہیں کہ بعض جگہ تو پڑھے بھی نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

"جامعہ رباط کے فاضل استاد ابراہیم کتانی نے قرویین کے دو قطعوں کی فلم ازراہ کرم مجھے ارسال فرمائی، پھر یہ بھی مہربانی فرمائی کہ میرے مبیضہ کو اور بالخصوص ان مقامات کو جہاں شمسی عکوس کی وجہ سے متن واضح نہ تھا اصل نسخہ کے ساتھ مقابلہ کیا"۔ [۱۱]

پہلا مخطوطہ رسول اللہؐ کے نسب کے بیان سے شروع ہوتا ہے اور واقعہ معراج تک حیاۃ نبی کا تفصیلی احاطہ کرتا ہے رسول اللہؐ کے خاندانی حالات خصوصیت سے ان کے والد اور دادا کا ذکر واقعہ فیل کا بیان رسول اللہؐ کی پیدائش اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات، بعثت کی ابتداء مکی سماج میں اس تحریک (اشاعت اسلام) کے تئیں آنے والی تبدیلیاں ۔ اس کے علاوہ رسول اللہؐ کی بیویوں اور بیٹیوں، ان کے شوہروں کا ذکر اور سب سے آخر میں واقعہ معراج کے بیان کے ساتھ مخطوطہ اول پورا ہو جاتا ہے۔ دوسرا مخطوطہ جو پہلے مخطوطہ کے مقابلہ میں بہتر حالت میں ہے ۔ یہ مخطوطہ غزوۂ بدر کی تفصیلات سے شروع ہوتا ہے، یہ محمد بن مسلم کا روایت کیا ہوا ہے ۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں :

"دمشقی قطعہ کی ابتداء غزوہ بدر کے واقعات سے ہوتی ہے ۔ اور یہ قطعہ غزوۂ احد کے واقعات پر مبنی ہوتا ہے ۔ مخطوطہ کے عنوان پر یہ عبارت بھی ہے : اس کے ساتھ غزوۂ سویق اور غزوہ ذی امر بجانب نجد (۳ھ) کے حالات بھی شامل ہیں، اس قطعہ کے آخر میں یہ عبارت ہے : اسے طاہر بن برکات خشوعی نے ماہ رمضان ۴۵۴ھ میں قلم بند کیا ۔ [۱۲]

یہ دمشقی قطعہ مخطوطہ اول سے مختصر ہے اس کے فہرست مضامین میں جیسا کہ خود ڈاکٹر حمید اللہ کے تحریر کردہ اقتباس سے ظاہر ہے محض دو خاص غزوہ بدر و احد کا ذکر کیا گیا ہے، دوسری تفصیلات تو ضمناً آگئی ہیں ۔ جیسے غزوۂ سویق، غزوۂ ذی امر، سریہ زید بن حارثہ اور کعب بن اشرف کا قتل ۔ یہ ضمنی تفصیلات اس وجہ سے ہوئیں کہ یہ واقعات ان دو اہم غزوات کے درمیان گزرے تھے ۔ لیکن اس مخطوطہ کی علمی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہم مغازی کے بیان میں ابن اسحٰق کے طریقہ کار اور

انکی روایات سے واقف ہوتے ہیں، اور بلاشبہ جب تک کوئی اس سے بھی قدیم نسخہ نہ دستیاب ہو جائے یہ سیرت و مغازی کے اولین ماخذ میں شامل کیا جائے گا جو دوسری ہجری کے اوائل میں مرتب کیا گیا تھا۔

ان تراجم کے آخر میں ڈاکٹر حمیداللہ کا تحقیقی مقالہ" محاکمہ سیرت ابن اسحٰق" کے زیرعنوان شائع ہوا ہے۔ یہ محاکمہ دراصل ابن اسحٰق اور ان کے طریقہ کار کا ایک تفصیلی تعارف ہے۔ اس کے علاوہ اس ترجمہ کا ایک اہم حصہ محمد الفاسی کی تقدیم بھی ہے۔ اس میں انھوں نے مغازی ابن اسحٰق کے ذکر میں مغربی محققین کی تحقیقات کا ذکر کیا ہے اور بعض جرمن و انگریزی کتب کی نشاندہی بھی کی ہے۔ محمد الفاسی کی فہرست میں مغازی ابن اسحٰق کے مشہور انگلش ترجمہ جو پروفیسر گلیوم نے کیا ہے کا ذکر نہیں ہے، البتہ ڈاکٹر حمیداللہ اپنے محاکمہ میں اس کتاب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں؛

"پروفیسر گلیوم نے قرویین کے قلمی نسخہ کی تلخیص کی اور کچھ سال قبل اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔"

ڈاکٹر حمیداللہ نے اس کے علاوہ سیرت ابن اسحٰق کے ایک فارسی ترجمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو ساتویں ہجری میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے کیا گیا تھا۔ [۱۴] اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر حمیداللہ نے پیرس کی لائبریری میں دیکھا تھا۔ لیکن اس نسخہ کی علمی حلقہ میں پذیرائی نہ ہونے کی وجہ غالباً ڈاکٹر حمیداللہ کا یہ خیال ہے کہ یہ ترجمہ سیرت ابن اسحٰق کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی بھی قدیم مخطوطہ کی اہمیت اس کی متن کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ اگر اس کی تحقیق یا ترجمہ کے سلسلہ میں اختصار سے کام لیا جائے تو اس کی علمی حیثیت کسی قدر کم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ابن ہشام کی سیرت النبی کی اہمیت کا سوال ہے وہ اہل سیر کے نزدیک اولین واہم ترین ماخذ میں اسی وجہ سے شامل کی گئی کہ ابن ہشام نے محمد بن اسحٰق کی کتاب کو زیادہ منقح شکل میں مرتب کیا ہے۔ [۱۵]

اسی سلسلہ کی ایک اور حالیہ تحقیق انگریزی زبان میں کولمبیا یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر گورڈن نیوبی کی یہ تحقیق کتاب المبتدا (ابن اسحٰق) کے اسی مخطوطہ پر

مشتمل ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ نے کیا ہے۔ البتہ اغلب یہ ہے کہ ڈاکٹر نیوبی نے ابوبکر سعد زندگی کے حکم سے کئے گئے ساتویں صدی ہجری کے فارسی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا ہے کیونکہ ڈاکٹر نیوبی کی تحقیق کردہ تصنیف رسول اللہؐ سے قبل گزرے انبیاء (علیہ) کے تذکرے سے شروع ہوتی ہے جبکہ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ "موصولہ قطعہ کا ابتدائی حصہ ناقص تھا" اور جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہؐ کے نسب کے بیان سے اپنا ترجمہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر نیوبی کے ترجمہ کی اہم خصوصیت ان کا وہ تحقیقاتی دیباچہ ہے جو انہوں نے ابن اسحاق کے تعارف، ان کی بیان کردہ روایات کی علمی و تاریخی اہمیت خصوصیت سے ان روایات کی تفصیل و تحقیق جنہیں اسرائیلیاتی روایات کہا جاتا ہے یا وہ روایات جو انہوں نے دوسرے ذرائع سے حاصل کی تھیں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ ان روایات کے بیان و تحقیق کے تئیں عام طور سے محققین نے گریز کا رویہ روا رکھا ہے یا اگر ان کا ذکر کیا گیا تو اکثر و بیشتر یہ پہلو پس پردہ رہا کہ ان روایات نے ابن اسحاق کی بیان کردہ روایات کی علمی حیثیت کو مشکوک و کم درجہ کر دیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے مقالہ ابن اسحاق میں اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں لگائے گئے الزامات کو محض ذاتی نوعیت کے ابغاض یا اعتراضات قرار دیں جو اکثر ہم عصروں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ [۵] مگر ان اسرائیلی روایات پر کوئی بحث یا اس کی تاریخی حیثیت سے استدلال کی گنجائش غالباً ان کے اس مختصر مضمون میں نہیں تھی۔

ڈاکٹر نیوبی کی تصنیف کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ابن اسحٰق کی تاریخ کے اس حصہ کو مجتمع کرنے کی کوشش کی ہے جس میں انہوں نے ابتدائے کائنات سے رسول اللہؐ کی بعثت کے زمانہ تک مبعوث ہوئے انبیاء کی تاریخ لکھی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نیوبی نے طبری کی تاریخ الملوک الرسل اور جامع البیان عن تاویل آیۃ القرآن، ثعالبی کی قصص الانبیاء اور مقدیسی کی کتاب البدء والتاریخ [۶] سے بھی مدد لی ہے۔

حوالہ و حواشی

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لیڈن، ۱۹۷۱ء، ج ۳، ص ۱۱-۸۱۰

۲۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱، ج ۱، ص ۲۳-۲۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۱، سیرۃ ابن ہشام، قاہرہ، ۱۹۳۷ء، ج ۱، ص ۱۶-۵ (تقدیم محمد محی الدین عبدالحمید)

۵۔ ڈاکٹر حمید اللہ محاکمہ سیرت ابن اسحٰق، نقوش رسول نمبر، لاہور، ۱۹۸۵ء، ج ۱۱، ص ۳۵۷-۳۵۶

۶۔ ایضاً، ص ۳۷۶ اور ص ۸۷-۳۸۵ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے شبلی، سیرت النبی، ج ۱، ص ۲۴۔

۷۔ نقوش رسول نمبر، ج ۱۱ ص ۸۷-۳۸۵۔

۸۔ ایضاً ص ۳۷۸، ابن اسحٰق کی الکتاب الکبیر امام سہیلی کے پاس موجود تھی، وہ گاہے گاہے اس کتاب سے اقتباسات و حوالے پیش کرتے ہیں دیکھئے الروض الانف، ج ۱، ڈاکٹر حمید اللہ نے خلیفہ مہدی سے متعلق روایت کے سلسلہ میں اس تشکیک کے پہلو بھی ظاہر کئے ہیں دیکھئے ص ۷۹-۳۷۸۔

۹۔ ایضاً، ۳۸۷۔

۱۰۔ ڈاکٹر حمید اللہ ان دونوں مخطوطوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: ابن ہشام اپنی کتاب میں زیاد بن عبداللہ بکائی کی وساطت سے ابن اسحٰق کی کتاب روایت کرتا ہے۔ لیکن مکتبہ قرویین میں ابن اسحٰق کی کتاب کے دو قطع یونس بن بکیر سے مروی ہیں اور دمشقی قطعات کا مقابلہ سیرت ابن ہشام کے ساتھ کرے تو وہ تفاصیل یا کلمات یا تقدیم یا تاخیر کے اختلافات پائے گا، ان اختلافات کا اصل متن سے محض اس درجہ تعلق ہے جیسا کہ ہم کسی کتاب کے دو مختلف ایڈیشن کے سلسلہ میں کہہ سکتے ہیں۔

دیکھئے نقوش رسول نمبر، ج ۱۱، ص ۳۸۹۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی اس کتاب کا اصل متن زیر طباعت ہے مصنف کی ایما پر اس کا اردو ترجمہ نور الٰہی ایڈووکیٹ نے نقوش رسول نمبر کے لئے کیا ہے۔ دیکھئے ص ۳۹۲

۱۱؎ ایضاً، ص ۳۸۷

۱۲؎ ایضاً، ص ۳۹۰

۱۳؎ اے گلیوم، لائف آف محمد، اے ٹرانسلیشن آف ابن اسحٰق س سیرت رسول اللہ، لندن، ۱۹۵۵، پروفیسر گلیوم کی کتاب کے سلسلہ میں اپنے اسی مضمون میں ڈاکٹر [illegible] یہ بھی لکھتے ہیں: ابن ہشام کی کتاب کو پروفیسر گلیوم نے حذف و اضافہ [illegible] کیا اور دیگر مصادر مثلاً طبری وغیرہ سے بھی استفادہ کیا۔ لیکن [illegible] سے اسے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ نقوش [illegible] ج ۱۱، ص ۳۹۱۔

[illegible] ابو بکر سعد زندگی کا نام شیراز اور عظیم شاعر شیخ سعدی کا ہم عصر تھا [illegible] ترجمہ کے متعدد قلمی نسخے پیرس و لندن کی بعض لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔ دیکھئے نقوش رسول نمبر ج ۱۱، ص ۳۹۰۔

[illegible] ایضاً، ص ۳۹۱

۱۶؎ ڈاکٹر گورڈن ڈارنل نیوبی، دی میکنگ آف دی لاسٹ پروفٹ: اے ری کنسٹرکشن آف دی ارلیسٹ بایوگرافی آف محمد، کولمبیا، ۱۹۸۹ء

(The Making of The Last Prophet: A Reconstruction of The Earliest Biography of Muhammad.)

۱۷؎ نقوش رسول نمبر ج ۱۱، ص ۸۵-۳۷۶

۱۸؎ طبری تاریخ الملوک الرسل، قاہرہ، ۱۹۶۰ اور جامع البیان عن تاویل آیۃ قرآن، قاہرہ، ۱۹۵۸، ثعالبی، قصص الانبیاء، قاہرہ، بات، مقدسی، کتاب البدء والتاریخ پیرس، ۱۸۹۹۔

... دین دور سے گزر رہے ہیں ...
... میں رکھنے والا ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ اس ملک میں دین و
ایمان ... مسلمانوں کے لئے خود اپنی جان و مال کی حفاظت کرنا بھی ایک مشکل
ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ کیونکہ مسلمان اس سرزمین میں اپنی قدر و قیمت اور اپنی اہمیت
و افادیت کھو بیٹھے ہیں۔ اور یہ اندوہناک صورتِ حال اس لئے پیدا ہوئی کہ ...
نے نہ صرف اپنے دین و شریعت کو بلکہ خود اپنے آپ کو بھی فراموش ...
خدا کا آخری پیغام لے کر آئے تھے اور وہ ... ایسے دین اور اس کے
علمبردار تھے جو پوری نسل انسانی کے لئے پیام رحمت کی حیثیت رکھتا ...
کو روشناس کرانا ان کا فرض منصبی تھا مگر جب انھوں نے اپنے اس فرض ...
کر دیا اور خود فراموش بن گئے تو ان پر ذلت و مسکنت طاری ہو گئی جس طرح ...
بنی اسرائیل کا حال ہوا تھا۔ اور جن کی زبوں حالی کے واقعات اللہ تعالیٰ نے ہماری عبرت
و بصیرت کی غرض سے قرآن مجید میں بیان کئے ہیں۔

دین الٰہی کا بنیادی مزاج

غرض اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت اور ہر ملت کو اس دنیا میں ذمہ دار اور جوابدہ بنا کر بھیجا
ہے اور ان پر دین الٰہی کی سربلندی کا فریضہ عائد کیا ہے لہٰذا جو ملت اس خدائی فریضہ

ہندستان میں ایک
شریعت ہاؤس کی ضرورت و اہمیت

مولانا محمد شہاب الدین ندوی ۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ ۔ بنگلور ۲۷

ایک نازک ترین دور

آج ہندستانی مسلمان اپنی تاریخ کے جس نازک اور مشکل ترین دور سے گزر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے بلکہ آنکھیں رکھنے والا ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ اس ملک میں دین و ایمان کا تحفظ تو درکنار مسلمانوں کے لئے خود اپنی جان و مال کی حفاظت کرنا بھی ایک مشکل ترین مسئلہ بن گیا ہے ۔ کیونکہ مسلمان اس سرزمین میں اپنی قدر و قیمت اور اپنی اہمیت و افادیت کھو بیٹھے ہیں ۔ اور یہ اندوہناک صورتِ حال اس لئے پیدا ہوئی کیونکہ مسلمانوں نے نہ صرف اپنے دین و شریعت کو بلکہ خود اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیا ۔ وہ اس دنیا میں خدا کا آخری پیغام لے کر آئے تھے اور وہ ایک ایسے دین اور ایسی شریعت کے داعی و علمبردار تھے جو پوری نسل انسانی کے لئے پیام رحمت کی حیثیت رکھتی ہے اور جس سے اولاد آدم کو روشناس کرانا ان کا فرض منصبی تھا مگر جب انھوں نے اپنے اس فرض منصبی کو فراموش کر دیا اور خود فراموش بن گئے تو ان پر ذلت و مسکنت طاری ہو گئی جس طرح کسی زمانے میں بنی اسرائیل کا حال ہوا تھا ۔ اور جن کی زبوں حالی کے واقعات اللہ تعالیٰ نے ہماری عبرت و بصیرت کی غرض سے قرآن مجید میں بیان کئے ہیں ۔

دین الٰہی کا بنیادی مزاج

غرض اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت اور ہر ملت کو اس دنیا میں ذمہ دار اور جوابدہ بنا کر بھیجا ہے اور ان پر دین الٰہی کی سربلندی کا فریضہ عائد کیا ہے لہٰذا جو ملت اس خدائی فریضہ

کی ادائیگی میں ناکام ہو جائے اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں سربلند رہنا ہے اور بحیثیت ایک زندہ اور خود دار ملت زندگی گذارنی ہے تو پھر انھیں سب سے پہلے اپنے دین وشریعت کی مضبوطی اور اس کے استحکام کا بندوبست کرنا پڑے گا ورنہ وہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے جائیں گے۔ دین وشریعت کی مضبوطی اور استحکام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان شاندار مسجدیں اور شاندار قسم کے مدرسے قائم کرکے یہ تصور کرلیں کہ چلو ہم اپنے منصب سے عہدہ برآ ہوگئے۔ کیونکہ لوگ ان عالیشان مسجدوں اور مدرسوں کو دیکھ کر بس اسلام اور مسلمانوں کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیں گے۔ اگرچہ مدرسے اور مسجدیں بھی ہمارے لئے بہت ضروری ہیں۔ مگر اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم دین وشریعت کے بنیادی اصولوں کی قدر وقیمت سے خاص کر غیر مسلموں کو روشناس کرائیں اور علمی وعقلی بنیادوں پر اسلام قانون اور اسلامی ضابطۂ حیات کی معقولیت وبرتری ثابت کریں اور اس طرح اسلامی شریعت پر وارد ہونے والے شبہات واعتراضات کا معقول ومدلل انداز میں جواب دے کر برادران وطن کو اسلامی سرچشمۂ حیات سے قریب کریں۔ یہی خدا کے دین کا تقاضہ ہے۔ یہی تمام انبیائے کرام کی دعوت کا خلاصہ اور ان کا طریقۂ کار رہا ہے کہ جس دور میں بھی منکرین خدا کو دین وشریعت کے بارے میں شکوک وشبہات پیش آتے رہے ہیں ان سب کا عقلی وعلمی انداز میں ازالہ کرکے دین الٰہی کی برتری ثابت کی جائے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔

"بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ میزان اتار دی ہے تاکہ لوگ عدل وراستی پر کاربند ہو جائیں" (حدید۔ ۲۵)

"ہم نے (اے محمد) آپ کے پاس کھلے کھلے دلائل بھیج دیئے ہیں جن کا انکار فاسق بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں" (بقرہ ۹۹)

کہہ دو کہ اللہ ہی کی حجت (ہمیشہ) غالب رہے گی" انعام۔ (۱۴۹)

دین الٰہی کا غلبہ مطلوب ہے

یعنی دین الٰہی کی رُوپ ریکھا ایسے عناصر سے متشکّل ہوتی ہے جو ابدی اور لازوال ہوتے ہیں اور وہ گردشِ لیل ونہار کے باعث ماند یا پھیکے نہیں پڑتے بلکہ ان کی چمک دمک میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ خدائے علیم وخبیر کی جانب سے ہونے کے باعث محکم علمی بنیادوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ کسی بھی دور میں زوال وادبار سے دوچار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنے ابدی منصوبے کے تحت اپنے دین برتر کو دیگر تمام ادیان ومذاہب پر غالب کرنا چاہتا ہے۔ جیساکہ ارشاد باری ہے:۔

"وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔" (توبہ: ۳۳)

یعنی علمی وعقلی اعتبار سے ہر ایک پر حجت پوری ہو جائے تاکہ کسی کے لئے عُذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے کہ خدا کا پیغام ہم تک پہنچ نہیں سکا تھا۔ جیساکہ ارشاد باری ہے

"تاکہ جسکو ہلاک ہونا ہو وہ دلیل دیکھ لینے کے بعد ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہو وہ دلیل دیکھ کر زندہ رہے۔" (انفال: ۴۲)

ایک فطری اور برتر نظام حیات

قرآن مجید سراپا دلیل وبُرہان ہے اور وہ اپنے مخاطبین کو ہمیشہ علمی وعقلی انداز میں مخاطب کرتا ہے اور انھیں علم وعقل کی دہائی دیتے ہوئے باپ دادا کی روایات کی اندھی تقلید کرنے کی سختی کے ساتھ مذمت کرتا ہے۔ نیز وہ زمین وآسمان کی تخلیق میں غور کرنے نظامِ فطرت کی نشانیوں سے سبق حاصل کرنے اور موجودات عالم کے نظاموں میں غور وفکر کر کے دین فطرت کے اصولوں کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس موضوع پر قرآن حکیم میں سیکڑوں آیتیں موجود ہیں۔ اس اعتبار سے اسلام کی پوری دعوت بجائے جذباتیت اور بازاری سیاست کے عقل ودانش اور علم وعرفان پر مبنی ہے۔ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کائناتِ مادی کے حقائق سمجھنے اور نظام

فطرت و نظامِ شریعت میں تطبیق و ہمنوائی پیدا کر کے ان دونوں میں ودیعت شدہ
ابدی سچائیاں تلاش کرنے کی پُرزور وکالت کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ ربانی ہے،
"اللہ نے زمین اور اجرام سماوی کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس
میں اہل ایمان کے لیئے ایک (بہت بڑی) نشانی موجود ہے۔" (عنکبوت ۴۴)

اسلامی شریعت کی معقولیت

غرض خدائی شریعت کوئی فرسودہ یا دقیانوسی قوانین کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ہر دور
کے علم و عقل کی میزان میں تلنے اور عصری معیاروں پر پورا اترنے والا ایک معقول اور
برتر نظامِ حیات ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں جس طرح نظام کائنات میں غور و فکر کر
کے خلاقِ ازل کی وحدانیت اور یکتائی کا سراغ لگانے کی دعوت دی گئی ہے بالکل اسی
طرح خود خدائی احکام اور اس کی شریعت میں بھی غور و خوض کر کے اس کی حکمت معقولیت
اور دقت نظر کا پتہ چلانے کی بھی ترغیب دی گئی ہے مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں کچھ شرعی احکام
کے بیان کے بعد فرمایا گیا ہے:
"اسی طرح اللہ تمہارے لیئے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو"
(بقرہ : ۲۴۲)

یعنی خدائی احکام کی عقلی علتیں، حکمتیں اور مصلحتیں تلاش کرو جن کے دو بنیادی
مقاصد ہیں: پہلا مقصد یہ ہے کہ ان عقلی علتوں اور مصلحتوں کی تلاش سے نئے نئے احکام
و مسائل کا حل تلاش کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ "اصول فقہ" کے مطابق قیاس و اجتہاد
کی بنیاد ایسی ہی "علتوں اور مصلحتوں" پر ہوتی ہے جن کے پیش نظر نئے احکام و مسائل کا
شرعی حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان علتوں اور مصلحتوں کو غیر
مسلموں کے سامنے عقلی دلائل کے طور پر پیش کر کے اسلامی قانون و شریعت کی معقولیت
و برتری ثابت کی جا سکتی ہے۔ تاکہ وہ خدائی قانون کی عظمت سے واقف ہو کر اسے اپنا
سکیں۔ یا پھر اس قانون کو ہمدردی اور تحسین کی نگاہ سے دیکھ سکیں۔ اس اعتبار سے

ے حسب یا دشمنی کا اظہار بھی وہ کرسکیں

... اعتبار سے غور و خوض کے ...

مسلمانوں کی کوتاہی

اگر مسلمانوں نے اس ملک میں گزشتہ ایک ہزار سال میں نہ سہی کم از کم پچھلے سو دو سو سالوں ہی کے دوران یہ کام کیا ہوتا تو اب تک اس کے مثبت نتائج برآمد ہو چکے ہوتے اور مسلمانوں کی کس مپرسی اور بے چارگی کا وہ عالم نہ ہوتا جس سے آج وہ دوچار ہیں۔ اگر ہم کو ہندوستان میں بحیثیت ایک ملت کے رہنا ہے اور اس ملک کی تقدیر بدلنی ہے۔ اور اس کے گیسو سنوارنے ہیں تو پھر ہمیں بنیادی طور پر اور سب سے پہلے اپنے دین و شریعت کی بقا کا سامان کرنا پڑے گا۔ یعنی اپنے دین و شریعت کی معقولیت اور اس کی برتری کا غیر مسلموں کو قائل کرانا۔ تاکہ وہ یا تو اسلام کی آغوش میں آجائیں یا پھر کم از کم غیر متعصب بن کر اسلام اور مسلمانوں کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ تصور کریں۔ اس ملک میں ہمارے وجود کے لئے یہ ایک بنیادی اور اساسی عمل ہے جو ایک جڑ اور تنے کے مانند ہے۔ اور بقیہ تمام مسائل ڈالیوں اور شاخوں کی طرح ضمنی اہمیت کے حامل ہیں۔

ایک طویل اور منظم عمل ضروری

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں برادران وطن کے ساتھ مخاصمت اور صف آرائی کا رویہ ترک کر کے حکمت و دانائی کے ساتھ ایک طویل اور منصوبہ بند طریقہ سے کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تمام مقاصد فوری طور پر اور راتوں رات حاصل نہیں ہو سکتے۔ اہل اسلام کو اپنے سوچنے سمجھنے کے انداز اور اپنے فکری سانچوں کو بدلنا اور خالص علمی و عقلی رویہ اپنانا ہوگا۔ اور یہ ایک مشقت طلب و صبر آزما کام ہے۔ اگر مسلمانان ہند نے اس عظیم کام

[illegible] بھاری قیمت ہمیں ادا کرنی پڑے گی اور آنے والا
وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ ایک ایسا اہم اور تجدیدی عمل ہے جس کی کامیابی پر
انشاءاللہ اس ملک میں ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ عمل میں آئے گی ہمیں سیاسی ہنگامہ
آرائیوں کے بجائے اگلے پچیس پچاس سال تک یہ کام نہایت درجہ منظم طور پر اور پوری خاموشی
کے ساتھ انجام دینا ہے۔ قوموں کی تقدیریں بدلنے کے لئے بجائے جذباتیت اور وقتی سیاست
کے منصوبہ بند عمل کو اہمیت دینی چاہیئے۔ تب کہیں کوئی ٹھوس اور پائیدار نتیجہ برآمد ہو
سکتا ہے۔ اس کام کے نتائج منصوبہ بند طریقے سے اگر نصف صدی میں بھی برآمد ہوجائیں
تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ ہماری تمام توانائیاں اسی وجہ سے ضائع ہو رہی
ہیں کیونکہ ہمارے پاس کام کرنے کا کوئی صحیح منصوبہ اور صحیح پلاننگ نہیں ہے۔ مسلمان
چاہتے ہیں کہ بغیر کسی منصوبے کے تمام مقاصد راتوں رات حاصل ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات
قانونِ فطرت اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ قوموں کے کردار اور ان کی نفسیات کو
بدلنے کے لئے سخت محنت اور شدید جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ہمیں کل کی کامیابی کے
کے لئے آج بنیاد ڈالنی ہوگی۔

وقت کی اہم ضرورت

حاصل یہ کہ اسلامی قانون و شریعت عقلی خوبیوں اور حکمتوں سے بھرپور ہونے کی بنا
پر ایک خدائی معجزہ نظر آتا ہے۔ مگر غیر مسلم تو در کنار آج خود مسلمان تک اسلامی قانون
و شریعت اور ان کی خوبیوں سے ناواقف دکھائی دیتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اہل علم
کی ایک جماعت اس موضوع پر علمی و تحقیقی اعتبار سے غور و خوص اور ریسرچ کر کے جدید علوم
کی روشنی میں اسلامی شریعت کی خوبیوں کو منظر عام پر لائے۔ یہ عصر جدید کی ایک اہم ترین
ضرورت ہے۔ جو تجدیدی نوعیت کی ہے۔ اور اس راہ میں سخت محنت و جانفشانی کی
ضرورت ہے کیونکہ اس راہ میں دنیا بھر کے مختلف قوانین اور مختلف تہذیبوں کے مطالعہ
کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون اور جدید معلومات سے بھی مدد لینے کی ضرورت ہے

حاصل ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی کوتاہی

اگر مسلمانوں نے اس ملک میں گزشتہ ایک ہزار سال میں نہ سہی کم از کم پچھلے سو دو سو سالوں ہی کے دوران یہ کام کیا ہوتا تو اب تک اس کے مثبت نتائج برآمد ہو چکے ہوتے اور مسلمانوں کی کس مپرسی اور بے چارگی کا وہ عالم نہ ہوتا جس سے آج وہ دوچار ہیں۔ اگر ہم کو ہندوستان میں بحیثیت ایک ملت کے رہنا ہے اور اس ملک کی تقدیر بدلنی ہے۔ اور اس کے گیسو سنوارنے ہیں تو پھر ہمیں بنیادی طور پر اور سب سے پہلے اپنے دین و شریعت کی بقا کا سامان کرنا پڑے گا۔ یعنی اپنے دین و شریعت کی معقولیت اور اس کی برتری کا غیر مسلموں کو قائل کرانا۔ تاکہ وہ یا تو اسلام کی آغوش میں آجائیں یا پھر کم از کم غیر متعصب بن کر اسلام اور مسلمانوں کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ تصور کریں اس ملک میں ہمارے وجود کے لئے یہ ایک بنیادی اور اساسی عمل ہے جو ایک جڑ اور تنے کے مانند ہے۔ اور بقیہ تمام مسائل ڈالیوں اور شاخوں کی طرح ضمنی اہمیت کے حامل ہیں۔

ایک طویل اور منظم عمل ضروری

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں برادران وطن کے ساتھ مخاصمت اور صف آرائی کا رویہ ترک کر کے حکمت و دانائی کے ساتھ ایک طویل اور منصوبہ بند طریقے سے کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تمام مقاصد فوری طور پر اور راتوں رات حاصل نہیں ہو سکتے۔ اہل اسلام کو اپنے سوچنے سمجھنے کے انداز اور اپنے فکری سانچوں کو بدلنا اور خالص علمی و عقلی رویہ اپنانا ہوگا۔ اور یہ ایک مشقت طلب و صبر آزما کام ہے۔ اگر مسلمانان ہند نے اس اہم کام

وقت میں کمی ... ۔ یہ ایک ایسا اہم اور جدید کام ہے۔ جس کی کامیابی پر انشاء اللہ اس ملک میں ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ عمل میں آئے گی ہمیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے بجائے اگلے پچیس پچاس سال تک یہ کام نہایت درجہ منظم طور پر اور پوری خاموشی کے ساتھ انجام دینا ہے۔ قوموں کی تقدیریں بدلنے کے لئے بجائے جذباتیت اور وقتی سیاست کے منصوبہ بند عمل کو اہمیت دینی چاہیئے۔ تب کہیں کوئی ٹھوس اور پائیدار نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اس کام کے نتائج منصوبہ بند طریقے سے اگر نصف صدی میں بھی برآمد ہو جائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ ہماری تمام توانائیاں اسی وجہ سے ضائع ہو رہی ہیں کیونکہ ہمارے پاس کام کرنے کا کوئی صحیح منصوبہ اور صحیح پلاننگ نہیں ہے۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ بغیر کسی منصوبے کے تمام مقاصد راتوں رات حاصل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ... تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ قوموں کے کردار اور ان کی نفسیات کو ... محنت اور شدید جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ہمیں کل کی کامیابی کے ... بنیاد ڈالنی ہوگی۔

وقت کی اہم ضرورت

حاصل یہ کہ اسلامی قانون و شریعت عقلی خوبیوں اور حکمتوں سے بھرپور ہونے کی بنا پر ایک خدائی معجزہ نظر آتا ہے۔ مگر غیر مسلم تو درکنار آج خود مسلمان تک اسلامی قانون و شریعت اور ان کی خوبیوں سے ناواقف دکھائی دیتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اس موضوع پر علمی و تحقیقی اعتبار سے غور و خوض اور ریسرچ کر کے جدید علوم کی روشنی میں اسلامی شریعت کی خوبیوں کو منظر عام پر لائے۔ یہ عصر جدید کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ جو تجدیدی نوعیت کی ہے۔ اور اس راہ میں سخت محنت و جانفشانی کی ضرورت ہے کیونکہ اس راہ میں دنیا بھر کے مختلف قوانین اور مختلف تہذیبوں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون اور جدید معلومات سے بھی مدد لینے کی ضرورت ہے

اگر وہ کسی وجہ سے اس کو اپنا نہ سکیں تو کم از کم اس سے تعصب یا دشمنی کا اظہار نہ کریں گے۔

غرض اس طرح خدائی احکام میں عقلی اعتبار سے غور و خوض کے بدولت دوہرے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی کوتاہی

اگر مسلمانوں نے اس ملک میں گزشتہ ایک ہزار سال میں نہ سہی کم از کم پچھلے سو دو سو سالوں ہی کے دوران یہ کام کیا ہوتا تو اب تک اس کے مثبت نتائج برآمد ہو چکے ہوتے اور مسلمانوں کی کس مپرسی اور بے چارگی کا وہ عالم نہ ہوتا جس سے آج وہ دوچار ہیں۔ اگر ہم کو ہندوستان میں بحیثیت ایک ملت کے رہنا ہے اور اس ملک کی تقدیر بدلنی ہے۔ اور اس کے گیسو سنوارنے ہیں تو پھر ہمیں بنیادی طور پر اور سب سے پہلے اپنے دین و شریعت کی بقا کا سامان کرنا پڑے گا۔ یعنی اپنے دین و شریعت کی معقولیت اور اس کی برتری کا غیر مسلموں کو قائل کرانا۔ تاکہ وہ یا تو اسلام کی آغوش میں آجائیں یا پھر کم از کم غیر متعصب بن کر اسلام اور مسلمانوں کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ تصور کریں۔

اس ملک میں ہمارے وجود کے لئے یہ ایک بنیادی اور اساسی عمل ہے جو ایک جڑ اور تنے کے مانند ہے۔ اور بقیہ تمام مسائل ڈالیوں اور شاخوں کی طرح ضمنی اہمیت کے حامل ہیں۔

ایک طویل اور منظم عمل ضروری

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں برادران وطن کے ساتھ مخاصمت اور صف آرائی کا رویہ ترک کر کے حکمت و دانائی کے ساتھ ایک طویل اور منصوبہ بند طریقہ سے کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تمام مقاصد فوری طور پر اور راتوں رات حاصل نہیں ہو سکتے۔ اہل اسلام کو اپنے سوچنے سمجھنے کے انداز اور اپنے فکری سانچوں کو بدلنا اور خالص علمی و عقلی رویہ اپنانا ہوگا۔ اور یہ ایک مشقت طلب و صبر آزما کام ہے۔ اگر مسلمانان ہند نے اس عظیم کام

سے تغافل برتا تو اس کی بہت بڑی اور بھاری قیمت ہمیں ادا کرنی پڑے گی اور آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ ایک ایسا اہم اور تجدیدی عمل ہے جس کی کامیابی پر انشاءاللہ اس ملک میں ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ عمل میں آئے گی ہمیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے بجائے اگلے پچیس پچاس سال تک یہ کام نہایت درجہ منظم طور پر اور پوری خاموشی کے ساتھ انجام دینا ہے۔ قوموں کی تقدیریں بدلنے کے لئے بجائے جذباتیت اور وقتی سیاست کے منصوبہ بند عمل کو اہمیت دینی چاہئے۔ تب کہیں کوئی ٹھوس اور پائیدار نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اس کام کے نتائج منصوبہ بند طریقے سے اگر نصف صدی میں بھی برآمد ہو جائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ ہماری تمام توانائیاں اسی وجہ سے ضائع ہو رہی ہیں کیونکہ ہمارے پاس کام کرنے کا کوئی صحیح منصوبہ اور صحیح پلاننگ نہیں ہے۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ بغیر کسی منصوبے کے تمام مقاصد راتوں رات حاصل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات قانونِ فطرت اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ قوموں کے کردار اور ان کی نفسیات کو بدلنے کے لئے سخت محنت اور شدید جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ہمیں کل کی کامیابی کے لئے آج بنیاد ڈالنی ہوگی۔

وقت کی اہم ضرورت

حاصل یہ کہ اسلامی قانون و شریعت عقلی خوبیوں اور حکمتوں سے بھرپور ہونے کی بنا پر ایک خدائی معجزہ نظر آتا ہے۔ مگر غیر مسلم تو درکنار آج خود مسلمان تک اسلامی قانون و شریعت اور ان کی خوبیوں سے ناواقف دکھائی دیتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اس موضوع پر علمی و تحقیقی اعتبار سے غور و خوض اور ریسرچ کر کے جدید علوم کی روشنی میں اسلامی شریعت کی خوبیوں کو منظر عام پر لائے۔ یہ عصر جدید کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ جو تجدیدی نوعیت کی ہے۔ اور اس راہ میں سخت محنت و جانفشانی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس راہ میں دنیا بھر کے مختلف قوانین اور مختلف تہذیبوں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون اور جدید معلومات سے بھی مدد لینے کی ضرورت ہے

ظاہر ہے کہ جب تک اسلامی قوانین کا تقابل دیگر قوانین سے نہ کیا جائے اسلامی قوانین کی خوبیاں پوری طرح اُجاگر نہیں ہو سکتیں۔ اور جب تک اسلامی قوانین کی حکمتیں اور اس کی خوبیاں پوری طرح اُجاگر نہ ہوں خدائی قانون کا کمال اور اس کا معجزہ بھی ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اقوام عالم پر اسی طریقے سے حجت پوری ہو سکتی ہے۔ اور یہ قرآن حکیم کی نظر میں بہت بڑا جہاد ہے جو غیر مسلموں کے ساتھ قرآنی حقائق و معارف کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ (فرقان ۵۲)

شریعت ہاؤس کس لئے؟

لہذا فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ نے اس سلسلے میں پیش رفت کرتے ہوئے "شریعت ہاؤس" کے نام سے ایک ایسا وسیع تحقیقی مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے ماتحت خاص کر اسلامی شریعت کی معقولیت اور برتری ثابت کرنے کے لئے ایسے قابل اور باصلاحیت علماء کو ملک کے کونے کونے سے تلاش کر کے اکٹھا کیا جائے جو اس کام کو انجام دینے کی اہلیت و قابلیت رکھتے ہوں، اور ان کی یکسوئی کے لئے اس مرکز میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ وہ بطور رفقاء اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ نیز اس کے ساتھ جدید علوم و مسائل سے واقفیت رکھنے والے اسلام پسند اصحاب اور رفقائے کار کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اس طرح کام کرنے والوں کی ایک پوری ٹیم درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم کام کو انجام دینے کے لئے کافی وسائل کی ضرورت ہے۔ اور یہ کام اردو اور انگریزی کے علاوہ حسب سہولت دیگر زبانوں میں بھی انجام پائے گا۔ جو انشاء اللہ ہمارے روایتی قسم کے لٹریچر سے یکسر مختلف ہو گا۔ تاکہ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کو نئے ڈھنگ اور نئے انداز میں مخاطب کر کے ان کے ذہن و فکر کو بدلا جا سکے۔ اور یہ ضرورت ہر دور میں باقی رہے گی۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

" اپنے رب کے راستے کی طرف (لوگوں کو) حکیمانہ طریقے اور دلنشین قول کے ذریعہ بلاؤ اور ان کے ساتھ بہترین طریقے سے مباحثہ کرو۔" (نحل ۱۲۵)

جدید علوم و مسائل سے استفادہ

ظاہر ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں مختلف علوم و فنون میں غلبہ کے باعث لوگوں کا انداز فکر اور ان کے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ بدلتا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر قوموں کے عقلی مزاج اور ان کے فکری پیمانوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ جس طرح کہ خود زبان و بیان اور اسلوب کلام میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لہذا جب تک لوگوں کے ذہن و مزاج اور ان کی نفسیات کے مطابق اپنی بات مؤثر انداز میں پیش نہ کی جائے۔ مخاطب کے افکار و نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ جب کہ قرآن حکیم میں ہمیں مخاطب کے ذہن و مزاج کے پیش نظر دلنشین، حکیمانہ اور مؤثر انداز اختیار کرنے اور بہترین طریقے سے مباحثہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں خود مخاطب کے علوم و مسائل اور اس کے افکار و خیالات سے بھی واقفیت ضروری ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ داعی کے لئے مدعو یعنی مخاطب قوم کے علوم و مسائل کو نظر انداز کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ورنہ اپنی بات مؤثر اور کارگر نہیں رہے گی۔ اس اعتبار سے جدید علوم و مسائل سے بھی واقفیت بہت ضروری ہے، ورنہ یہ تحریک پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

"ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق گفتگو کریں۔" (کنزل العمال)

اور اس سلسلے میں حضرت علیؓ سے مروی ہے:

لوگوں سے ان کے جانے بوجھے مسائل کے ذریعہ گفتگو کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلا دیا جائے؟" (کنزل العمال)

فرقانیہ اکیڈمی کا ایک عظیم منصوبہ

الغرض فرقانیہ اکیڈمی کے پیش نظر اس سلسلے میں ایک وسیع منصوبہ ہے یعنی شریعت ہاؤس کے نام سے ہندوستان میں ایک ایسا عظیم الشان تحقیقی مرکز قائم کر دیا جائے تو متلاشیان علم اور علمائے محققین کا مرجع اور ماویٰ بن جائے۔ اور اس میں خاص کر شرعی مسائل و موضوعات پر تحقیقی کام کرنے والوں کو ترجیح دی جائے۔ شریعت ہاؤس کے ماتحت ایک عظیم الشان لائبریری

ایک آڈیٹوریم، چند لکچرز ہال، ایک مہمان خانہ اور تحقیقی کام کرنے والے طلباء کے قیام کیلئے چند کمرے ہوں۔ شریعت ہاؤس کے ماتحت وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر سمپوزیم اور سیمینار وغیرہ بھی منعقد کئے جائیں، اور ان میں لٹریچر ... صاحب ذوق اور خاص کر غیر مسلم تعلیم یافتہ طبقے کو مہیا کی جائے جس سے ان کی فکر کی تعمیر ہو سکے۔ نیز اس مرکز کے تحت عربی زبان اور مضامین کے کوچنگ کلاسس بھی چلائے جائیں تاکہ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق کئی مقاصد حاصل ہوں۔

یہ عظیم الشان منصوبہ جب مکمل ہو جائے گا تو وہ انشاء اللہ ہندوستان کا ایک مثالی ادارہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو وہ مسلمانانِ ہند کے لئے امید اور روشنی کی ایک کرن ہوگا اور پھر اس سے سارا جہان بھی مستفیض ہو سکے گا۔

زندہ قوموں کی علامت

آج ہندوستان میں ایک شریعت ہاؤس کا قیام مسلمانوں کی غیرتِ ملی کو للکار رہا ہے اور یہ ہمارے خوابوں کو حقیقت ثابت کرنے کی راہ میں انشاء اللہ اولین قدم ہوگا۔ لہذا ہمیں وقت کی نبض اور اس کی رفتار کو پہچانتے ہوئے موجودہ چیلنج کا مقابلہ زندہ قوموں کی طرح کرنا چاہئے ورنہ پھر خدانخواستہ اس ملک سے ہمارا نام و نشان تک مٹ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے کلام پاک میں صاف صاف طور پر متنبہ کر دیا ہے:

"پھر ہم نے ان (قوموں کو تباہ کرنے) کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو؟" (یونس ۱۴)

یہ اللہ تعالیٰ کی ابدی سنت اور اس کا طریقہ کار ہے کہ وہ دنیا کے اسٹیج سے ناکارہ قوموں اور ملتوں کو ہٹا کر نئی نئی اقوام کو زمین کی وارث سے نوازتا ہے اور انھیں ابھرنے اور عروج پانے کا پورا پورا موقع عنایت فرماتا ہے۔ مگر جب کوئی قوم خود اپنے آپ کو زمین کی جانشینی کے لئے نااہل ثابت کرکے دنیوی عیش و عشرت میں مست ہو جاتی ہے تو پھر اس کا تختہ پلٹ دیتا ہے۔ گویا کہ ہر قوم کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمان ربانی ہے:

خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت آپ نہ بدلے۔" (رعد ۱۱)

زندہ قومیں ہر قسم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھتی ہیں اور جو ملت نئے چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی وہ اپنے آپ کو زندہ و متحرک اور خوددار ملت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اپنے انجام بد کو ضرور پہنچ کر رہتی ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ مسلمانانِ ہند وقت کی اس پکار کو غور سے سنیں اور اس پر کان دھریں۔

ایک یادگار مرکز

شریعت ہاؤس انشاء اللہ جدید ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار حیثیت کا حامل اور مسلمانان ہند کی نشأۃ ثانیہ اور ان کی تعمیر نو میں ایک سنگ میل قائم کرنے والا ہوگا اور اس مرکز شریعت کی تعمیر و ترقی میں جو اصحاب خیر نمایاں طور پر حصہ لیں گے۔ وہ شریعت ہاؤس کے سرپرست اور فاؤنڈر ممبر کہلائیں گے۔ اور ایسے تمام اصحاب کے اسمائے گرامی شریعت ہاؤس میں بطور یادگار محفوظ رکھے جائیں گے، اور اس مجوزہ شریعت ہاؤس سے جو بھی علمی فائدہ ملت کو پہنچے گا اس کا اجر و ثواب ان مخلص ہستیوں کے نامۂ اعمال میں لکھا جائیگا۔

شریعت ہاؤس کے مقاصد

۱۔ مسلمانان ہند کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ایک جامع منصوبہ پیش کرنا۔

۲۔ اسلامی شریعت کی برتری اور معقولیت کا اثبات۔

۳۔ عصر جدید کے مادہ پرستانہ چیلنج کا علمی سطح پر مقابلہ۔

۴۔ جدید سائنٹفک دلائل کی روشنی میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنا۔

۵۔ اردو انگریزی اور دیگر زبانوں میں اسلام کے تعارفی لٹریچر کی تیاری۔

۶۔ اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی قانون کے حقائق غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنا۔

۷۔ ملک کے طول و عرض سے تحقیقی کام کرنے والوں کا انتخاب اور ان کے لئے وظائف کا اجراء

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں (قسط نمبر ۱)

(۱۵۸۰ - ۱۶۲۷ء)

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عہد سلطنت کے حکمرانوں کی طرح عہد مغلیہ کے درباری مورخوں نے اپنے سرپرست حکمرانوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ان بادشاہوں کی خوشنودی کے لئے ان مورخوں نے ان کی جنگوں، سیاست، حکمت عملیوں، اور انتظامی اصلاحات اور ان کی مذہبی زندگی، خانگی حالات، درباری جشن و تہوار، رقص و سرود کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ بادشاہوں کے علاوہ انہوں نے اس عہد کے امیروں کی جنگوں اور انکی ذاتی زندگی کے حالات بھی لکھے ہیں لیکن انہوں نے عوام کی اقتصادی، سماجی، اور مذہبی حالات کو یکسر سے نظر انداز کر دیا ہے۔ درباری مورخوں کو نہ تو عوام سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی انھیں انکے حالات معلوم ہوتے تھے اور اگر انھیں معلوم بھی ہو جاتے تو وہ اپنے قلم سے یہ نہ لکھ سکتے تھے کہ ان کے سرپرست حکمران کے عہد میں عوام کی حالت اچھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے عوام کے حالات اس عہد کی تواریخ میں دستیاب نہیں ہوتے اور قارئین عوام کے بھی حالات جاننے کے خواہاں ہیں۔ بہرحال عہد مغلیہ کی تاریخ کی کتابوں کی یہ بہت بڑی کمی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے کے حالات تاریکی میں ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کمی کو اس دور کے ان یورپی سیاحوں نے پورا کر دیا جنہوں نے عہد مغلیہ میں ہندوستان کی سیاحت کی۔ عہد مغلیہ میں بہت سے یورپی سیاحوں نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ ان سیاحوں نے بادشاہوں اور امیروں کا بالعموم اور عوام کے حالات پر بالخصوص سیر حاصل روشنی ڈالی ہے لہذا ان سفرناموں کے مطالعہ سے ہمیں ہندوستانی عوام کی اقتصادی، سماجی، مذہبی، انکے تہواروں، جشنوں اور جذبات کے بارے میں اچھی خاصی معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر یورپی سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں [illegible]

فادر مونسریٹ (۱۵۸۰ء ــ ۱۵۸۲ء)

سوانح عمری:

کتالونیا میں واقع وِک ڈی اوزونا نامی مقام میں فادر مونسریٹ کا جنم ۱۵۳۶ء میں ہوا تھا۔ ۱۵۵۸ء میں اسے سوسائٹی اوف جیسس میں داخل کیا گیا۔ اور ۱۵۶۹ء میں لبسن میں محکمۂ تعلیم کے ناظم خصوصی کی حیثیت سے اس کا تقرر ہوا۔ ۱۵۷۴ء میں ہندوستان کی سیاحت کے لئے وہ بحری جہاز پر سوار ہوا اور ۱۵۸۰ء میں اکبر بادشاہ کے دربار میں فادر اکوویا کے ہمراہ حاضر ہونے کے لئے اس کو منتخب کیا گیا۔

آگرہ میں (اکبر بادشاہ) نے مونسریٹ کو شہزادہ مراد کا اتالیق مقرر کیا۔ جس زمانے میں اکبر نے کابل پر حملہ کیا تو مونسریٹ اس کے ساتھ کابل گیا۔ اس حملے کا مقصد مرزا حکیم کے بُرے منصوبوں کو ناکام کرنا تھا۔ اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے فادر مونسریٹ جلال آباد سے آگے نہ جاسکا اور شاہی افواج کے ساتھ وہ لاہور واپس آگیا۔ ۱۵۸۲ء میں اکبر کے سفیر کے ساتھ وہ گووا آگیا۔ ۱۵۸۹ء میں ابی سینیا جانے کے لئے مونسریٹ کو حکم دیا گیا۔ دھافر نامی مقام کے قریب عربوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ کچھ دنوں وہ ایناد میں عربوں اور سنائی میں ترکوں کی حراست میں رہا۔ اس کے بعد ایک ہندوستانی تاجر کی سفارش پر اسے رہا کردیا گیا اور وہ گووا واپس چلا آیا۔ اس کے بعد اسے سلسٹی میں تعینات کیا گیا۔ اسی مقام پر ساٹھ سال کی عمر میں ۵ ار مارچ ۱۶۰۰ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

فادر مونسریٹ کئی کتابوں کا مصنف تھا لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ کمن ٹیریس نامی اس کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں اس نے اکبر کے دربار کے حالات (۱۵۸۰ء ـ ۱۵۸۲ء) قلمبند کئے ہیں۔ ۱۵۸۲ء میں جب مونسریٹ گووا پہونچا تو وہاں وہ اپنے روزنامچہ کو ایک داستان کی صورت میں مرتب کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ابی سینیا کے سفر میں وہ اس مسودہ کو اپنے ہمراہ لے گیا اور ایناد میں نظر بندی کے ایام میں اس نے اس مسودہ پر نظر ثانی کی لیکن سنائی کے سفر کے دوران اس سے یہ مسودہ چھین لیا گیا۔ بعد میں ترکی کا گورنر اس مسودہ کو برآمد کرنے میں کامیاب ہوا اور اسے مونسریٹ کو واپس دیدیا۔

غالباً اس تصنیف کی کئی نقلیں تیار کی گئی تھیں لیکن آنے والی نسلوں کے لئے ایک نقل کے علاوہ باقی نقلیں ضائع ہو گئی تھیں۔ وہ نقل کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں محفوظ تھی۔ ۱۸۳۶ء میں فورٹ ولیم کالج سے اس نسخے کو میٹکاف ہال کے ذخیرہ میں منتقل کر دیا گیا اس کے بعد انگلیکن کیتھاڈرل کے زیر اہتمام قائم کردہ سینٹ پال نامی کتب خانہ میں منتقل کیا گیا۔ کتابوں کے ڈھیر میں یہ نسخہ ۱۹۰۶ء میں ریو۔ ڈبلو۔ کے فرمنگر کے ہاتھ لگا۔ بعد میں فادر ہوسٹن نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جریدہ میں اس کے بعض اقتباسات شائع کئے۔ اس نے کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا لیکن نہ تو اس نے خود اس ترجمے کو شائع کیا اور نہ کسی دوسرے ادارے نے۔ فادر مونسریٹ کی اس تصنیف کا ایک دوسرا ترجمہ اوکسفورڈ پریس سے شائع ہوا۔ اس ترجمے کو بنرجی اور ہولینڈ نے مرتب کیا تھا۔

(۱) جن شہروں کو دیکھا اور جن راستوں سے سفر کیا

(الف) سورت سے آگرہ کا راستہ :

سورت، نائر، سلطان پور، سنپڑہ نامی پہاڑیوں کو پار کیا، سرانا، نربدا ندی پار کی مندو، اجین، سارنگپور، سبرمتی، ندی پار کی، برنتی ندی پار کی، پیپل دھر، سرونج نروار، گوالیار، دھولپور کے قریب، چنبل ندی پار کی، دھولپور اور آگرہ۔

(ب) شہروں کا بیان :

سورت : یہ شہر تاپتی کے کنارے پر واقع تھا۔ اس شہر میں ایک مضبوط گڈھی تھی اور ۲۰۰ گھوڑ سوار تیر انداز اس کی حفاظت کرتے تھے۔ دوسرے سیاحوں کے مقابلے میں سورت شہر کے بارے میں مونسریٹ کا بیان تفصیلی نہیں ہے۔ پھر بھی گوپی تلاؤ کا اس کا تفصیلی بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "سنگ مرمر کی ان سیڑھیوں کو دیکھ کر آنکھوں کو مسرت حاصل ہوتی تھی جو اس تالاب کے چاروں طرف بنی ہوئی تھیں"۔
"یہ سیڑھیاں دو سو فٹ چوڑی تھیں اور متعدد حصوں میں منقسم تھیں"۔ مونسریٹ

کے بیان کے مطابق خواجہ ظفر کے مقبرہ کیوجہ سے اس مقام کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ مقبرہ تالاب کے قریب بنا ہوا تھا۔ وہ مقبرہ بہت آراستہ پیراستہ تھا اور اچھی طرح سے تعمیر کیا گیا تھا۔ وہاں عورتیں پھولوں کے ہار لے کر آتیں اور اس صوفی کے مقبرے پر بطور نذر چڑھاتی تھیں۔ اس تالاب کے وسط میں ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی (مونسریٹ نے اس عمارت کو ایک مینار لکھا ہے) برائے تفریح طبع لوگ وہاں کشتیوں سے جایا کرتے تھے۔

منڈو: اس شہر کی فصیل کی لمبائی چھ میل تھی۔ اس شہر میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ مونسریٹ نے ایک نامکمل شاہی مقبرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل وہ ذیل سطور میں بیان کرتا ہے۔

"ایک چوکور چبوترے کے وسط میں یہ واقع ہے جو زمین کی سطح سے ڈھائی گز اونچائی پر بنا ہے اور اس کا اوپری سرا ۸۰ فٹ چوڑا ہے اور نچلے حصے میں چاروں طرف محرابیں اور ستون بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کے اوپر ایک گنبد ہے۔ وہ مقبرہ گنبد کی کرسی تک زمین سے ۲۰ فٹ چوڑا اور ۴۰ فٹ اونچا ہے۔ اس چبوترے کے چاروں کونوں پر سات منزلہ مینار کھڑے ہیں اور انکی ساخت ہشت اضلاعی ہے۔ ان میناروں کی ہر منزل ڈھائی گز اونچی ہے۔ ان میں چاروں طرف کھڑکیاں ہیں۔ ہر ایک مقبرہ کو موسوی پتھروں کی مرصع کاری سے سجایا گیا ہے۔ ان مقبروں کے سامنے تین بادشاہوں کے ملمع شاہی تختوں کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انہیں شاہی مراتب کی نشانیوں کی حیثیت سے تصور کیا جاتا ہے۔"

سرونج: یہاں کی آب و ہوا بہت خراب تھی اور زہریلے کیڑے مکوڑے مثلاً بچھو بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔

ناروار: یہ شہر ایک پہاڑی کی چوٹی پر آباد تھا۔ ناروار سے سپری تک سارا راستہ پُرخطر تھا کیونکہ اس راستے میں چوروں کے قبیلے کثرت سے بسے ہوئے تھے۔ یہاں مونسریٹ کو محرّم اور ہولی کے تہوار دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

گوالیار: اس شہر کے بارے میں اس نے کوئی تفصیل نہیں دی ہے لیکن وہاں کے قلعے میں پائے جانے والی مورتیوں کے بارے میں اس نے بڑی دلچسپ دیومالائی قصہ اختراع کیا ہے وہاں اس نے نیم قد صرف ۱۳ مورتیاں دیکھی تھیں۔ اور اس کے خیال کے مطابق ان میں دو میاں

مورتی عیسیٰ مسیح کی تھی اور اس کے بارہ پیروؤں میں سے چھ ایک طرف اور چھ دوسری طرف کھڑے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمان اُن مورتیوں کو وہاں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ تین سو سال پہلے یہاں عیسائی آباد تھے۔ مسلمانوں نے کئی جنگوں میں انھیں شکست دی تھی یہاں تک کہ ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

دہلی :۔ اس شہر میں برہمن آباد تھے اور مغلوں کے محافظ دستے اسکی حفاظت کرتے تھے۔ اچھے بنے ہوئے، بلند اور اعلیٰ پیمانے پر سجے ہوئے لوگوں کے ذاتی مکان تھے۔ اس کی سڑکیں چوڑی تھیں "مسلمانوں کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہاں کی گلیاں وسیع اور دلکش تھیں" ان سڑکوں کے وسط میں سایہ دار ہرے بھرے خوبصورت درخت لگے ہوئے تھے۔ یہاں بہت سے پارک (سبزہ زار) بھی تھے۔

سونی پت :۔ یہ ہتھیار بنانے کی دستکاری کے لیے مشہور تھا۔ یہاں تلواریں، خنجر، بھالوں کی فولادی نوکیں، نیزے، برچھیاں وغیرہ بنائی جاتی تھیں۔

سرہند :۔ یہ ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں کا طبی مدرسہ مشہور تھا۔ مغل حکومت کو وہاں سے اطبا مہیا کئے جاتے تھے۔ یہاں تیر، جوتے، سنڈل اور ترکش بھی بنائے جاتے تھے۔

لاہور :۔ فادر مونسریٹ نے لکھا ہے کہ یہ شہر "اپنی وسعت، آبادی اور دولت کے لحاظ سے ایشیا یا یورپ کے دوسرے شہروں میں بے مثل ہے" تمام دنیا کے تاجر آکر یہاں جمع ہوتے تھے۔ بڑی مقدار میں چیزیں یہاں درآمد کی جاتی تھیں۔ یہ شہر بہت آباد تھا۔ گلیوں میں لوگ ایک دوسرے سے دھکا مکی کرتے چلا کرتے تھے۔ "قلعے کے اندر ایک بازار تھا جسے دھوپ اور بارش سے بچانے کے لئے اس کے اوپر لکڑی کی ایک اونچی چھت بنی ہوئی تھی" وہاں زیادہ تر عمارتیں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ وہاں کے اکثر باشندے دولتمند تھے، بالخصوص کشمیری برہمن۔ یہاں کثرت سے عطریات بکتے تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ "انسانی زندگی کے بارے میں نہ تو کوئی ایسا فن تھا اور نہ کوئی دستکاری جو یہاں نہ پائی جاتی ہو"

مصنف کے ایک عمومی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دور سے دیکھنے میں ہندوستانی شہر بہت خوبصورت معلوم ہوتے تھے لیکن اندر سے وہ تنگ اور بے منصوبے کے بنے ہوئے

تھے اور مکانوں میں کھڑکیاں لگوانے کا رواج نہیں تھا۔

(۲) بادشاہ ـــ ذاتی (حلیہ اور شخصیت)

اکبر کا کردار اور حلیہ:

فادر مونسریٹ نے اکبر کا کردار اور اس کے ظاہری خدو خال کو جزوی طور پر بیان کیا ہے۔ جو قابلِ نقل ہے۔

"اس شہزادے کا قدو قامت اور اس کا ظاہری رنگ و روپ اس کی شاہی عظمت کے شایان شان ہے۔ یہاں تک ہر ایک شخص کو دور ہی سے بآسانی پہلی نظر میں اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ وہ بادشاہ ہے۔ اس کے کندھے چوڑے ہیں۔ اس کے پیر بینگے تھے جو گھوڑ سواری کے لئے بہت مناسب تھے۔ اور اس کا رنگ ہلکا بھورا تھا۔ دائیں کندھے کی طرف اس کا سر کچھ جھکا ہوا تھا اس کی پیشانی چوڑی اور کھلی ہوئی تھی اس کی آنکھیں اتنی چمکدار اور بھڑکیلی تھیں اور ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ سورج کی روشنی میں ایک سمندر ٹمٹما رہا ہے۔ اس کی مژگان بہت لمبی تھیں اسکی بھنوئیں زیادہ نمایاں نہ تھیں۔ اسکی ناک سیدھی اور چھوٹی تھی حالانکہ معمولی نہ تھیں۔ اسکے نتھنے بہت کھلے ہوئے تھے جیسے کہ تمسخر آمیز ہوں۔ اس کے بائیں نتھنے اور اوپری ہونٹ کے درمیان ایک تل تھا۔ وہ داڑھی منڈواتا تھا لیکن ایک ترکی نوجوان کیطرح مونچھیں رکھتا تھا۔ جو ابھی پختہ عمری کو نہیں پہونچا تھا۔ اپنے نسلی دستور کے برخلاف نہ تو وہ بال منڈواتا ہے اور نہ ہی ٹوپی پہنتا ہے بلکہ سر پر پگڑی باندھتا ہے۔ جس کے اندر وہ اپنے بال باندھ لیتا ہے۔ اس کے بائیں پیر میں لنگ ہے حالانکہ فی الواقع وہ پیر زخم خوردہ نہیں تھا۔ اس کا جسم سڈول تھا، وہ نہ تو بہت پتلا دبلا تھا اور نہ ہی بہت زیادہ موٹا تازہ۔ وہ قوی ہیکل، خوش مزاج اور طاقتور تھا۔ جب وہ ہنستا ہے تو اسکی شکل تقریباً بالکل بگڑ جاتی ہے۔ اس کی گفتگو کے انداز میں متانت اور شگفتگی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس میں وقار بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن جب اسے غصہ آجاتا ہے تو اسکی شخصیت سے رعب، جلال اور عظمت ترشح ہوتی ہے۔ وہ دقیقہ رس اور دور بیں بھی ہے۔ اور اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے وہ خطرات سے گریز کرتا ہے اور مساعد حالات پیدا کر کے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔" (باقی آئندہ)

ایصالِ ثواب برائے حضرت مفتی صاحبؒ

بعد از ختم قرآن کریم پروگرام و اہتمام ایصالِ ثواب برائے روحِ پاک مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، کرطا نظام الملک اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ ۱۱۰۰۰ بر موقعہ انکی سالانہ برسی بتاریخ ۱۲ مئی ۹۳ء منجانب مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگ والی سوہنہ، ضلع گوڑگانوہ ہریانہ انڈیا۔ ۱۲۲۱۰۳ -H.R

دل میں اِک ویرانہ پن ہے آپکے جانیکے بعد — سوگ میں ڈوبی ہے مِلّت آپکے جانیکے بعد

چاند میں کیسا گہن ہے آپ کے جانیکے بعد — پھول سے خالی چمن ہے آپکے جانیکے بعد

سب سے ہمدردی کی باتیں اور دعا سب کیلئے — مضطرب ہر مرد و زن ہے آپکے جانیکے بعد

پُرخلوص و پُر محبت مہرباں مصلح شفیق — دل میں یہ کیسی چبھن ہے آپکے جانیکے بعد

دے مُقامِ عالی خدا اب یہ دعا اپنی علی — دل میں اپنے مَوجزن ہے آپکے جانیکے بعد

مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے دینداری میں ایک امتیازی رول ادا کیا وہ ایک سچے پکے حق پرست مسلمان اور ایک نیک انسان تھے جس کے لئے وہ آخری دم تک جدوجہد کرتے رہے دین و ملت کا درد انہیں ورثہ میں ملا تھا ان کی پوری زندگی دینی نظریہ کی آئینہ دار ہے وہ اپنے دینی نظریہ پر نہایت پختہ عزمی کے ساتھ قائم اور عامل رہے وہ اپنے وقت کے سچے مفکر اسلام تھے ان کی وسیع القلبی اور کشادہ دلی مِلّت میں مشہور تھی انہوں نے اپنی بے غرض اور بے لوث خدمات سے مِلّت کا دِل جیت لیا تھا جن کا دِل آئینہ کی طرح صاف تھا مِلّت کے اعلیٰ ترین دینداروں میں انکا شمار ہوتا تھا آپکی ذہانت، تدبّر، صلاحیت، قابلیت، عدل و انصاف، امانت و دیانتداری کا سکّہ ساری قوم میں بیٹھ گیا تھا وہ اگرچہ آج ہمارے بیچ میں نہیں ہیں لیکن انکی روح زندہ ہے جو ہمارے دلوں کو گرماتی ہے جو ہمیں اچھے اصولوں کی سمت آگے بڑھنے کے لئے للکارتی ہے تاریخ میں ایسی ہستیاں بہت کم ملیں گی جو آڑے وقت دینی ملّی ضرورتوں اور غرباء کی آرزوؤں تمنّاؤں کا ملجا اور ماویٰ تھے مگر افسوس کہ اب وہ نہیں رہے۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔ جانے والا کبھی نہیں آتا بلکہ جانے والے کی یاد آتی ہے مرحوم ایک بُردبار اور باوقار انسان تھے

آپ کے حسین اوصاف واجب التعظیم ہیں آپ کو روحانی اور اخلاقی معاملات سے بڑی ہی دلچسپی تھی علاوہ ازیں آپ مثالی کردار کے مالک ہیں آپ انتہائی قناعت پسند انسان تھے ان کی وضع و قطع اور لباس سے ان کی پوری زندگی خلوص سے عبارت ہے درد مندی دلسوزی ان کی سب سے نمایاں شناخت تھی وہ اپنے سے کہیں زیادہ دوسروں کے لئے جیتے رہے ان کی دردمندی کا دائرہ ہمیشہ ہی بہت وسیع رہا مگر افسوس کہ اب وہ نہیں رہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے

(آمین)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی تمام دینی ملی اور قومی خدمات کو بے حد قبول فرماکر آغوشِ رحمت میں چھپالیں آمین ثم آمین اور پوری پوری مغفرت فرماکر جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائیں آمین ثم آمین اور پسماندگان میں ان کے عزیزوں کو ان کی پیروی کی توفیق دیں آمین ثم آمین۔

احقر رحمت علی غفرلہٗ
مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگ والی
سوہنہ، ضلع گوڑگانوہ ہریانہ

برہان

جلد ۱۱۱، ۱۱۲ | جون جولائی ۱۹۹۳ء مطابق محرم الحرام صفر المظفر ۱۴۱۴ھ | شمارہ ۶، ۱

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

پنجاب اور کشمیر میں حالات سازگار ہو رہے ہیں۔ یہ خبر ہر امن پسند انسان کے لئے خوشی کی بات ہے۔ پنجاب تو دس سال آگ میں جلتا رہا جسکی وجہ سے جان و مال کے نقصان کے علاوہ پنجاب میں ترقی و کامیابی کے تمام راستے رُک گئے تھے جو پنجاب ہندوستان کے دیگر صوبوں سے نسبتاً زیادہ خوشحال صوبہ کہلاتا تھا۔ اناج کے معاملے میں اسکو ہندوستان کے تمام صوبوں پر برتری حاصل تھی اور اس کے باشندے ملک کے دیگر علاقوں میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بدولت سراہے اور عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے حالات ناگفتہ بہ نے اس پنجاب کو کچھ عرصہ کے لئے فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی لعنت کے اندھیرے میں دھکیل کر رکھ دیا تھا۔ اطمینان و مسرت کی بات ہے کہ یہ تاریک دور اب چھٹ رہا ہے اور پنجاب اپنے سابقہ سنہری دور کی طرف لوٹ رہا ہے اس میں جہاں پنجاب کے عوام کی دور اندیشی کو دخل ہے وہیں مقامی حکومت اور صوبہ کے فرض شناس اعلیٰ افسران کی سوجھ بوجھ لیاقت و صلاحیت کو کریڈٹ پہنچتا ہے۔

کشمیر ۱۹۸۹ء سے تباہی و بربادی جارحیت و تشدد کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہا ہے جو کشمیر امن و امان کا گہوارہ رہا ہے جہاں مسلم آبادی کی اکثریت کیوجہ سے انسانیت اور بنی نوع انسانی کی فلاح اور بقاء و حفاظت کے کارہائے نمایاں انجام دیئے جاتے رہے ہوں وہیں اسلام کا سچا پرستار مجاہد خادم انسانیت میر واعظ حضرت مولوی محمد فاروق آناً فاناً گولیوں سے چھلنی کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ کشمیر اور کشمیری عوام کی زبردست بدبختی تھی کہ اسے چند ناعاقبت اندیش رہنماؤں کی قیادت و غلط رہنمائی کی بدولت چند سال تباہی و بربادی کے سائے میں بسر کرنے پڑے کئی بے گناہ انسان جن میں عورتیں بچے جوان سب ہی شامل ہیں موت کی آغوش میں پہونچ گئے اس کی وجہ کچھ بھی ہو مگر اس میں سب سے زیادہ دخل کچھ غلط رہنماؤں کی غلط

رہنمائی و قیادت ہی کو حاصل ہے۔ اور اسے ہم کسطرح بیان کریں کہ کشمیر کے زبردست رہنما اور کشمیری عوام کے دلوں پر عرصۂ دراز تک راج کرنے والے شیخ محمد عبداللہ کی قبر تک کی حفاظت کے لالے پڑ گئے تھے پولیس کے ذریعے ہی ان کی قبر کی حفاظت کرکے اسے اب تک محفوظ رکھا جا سکا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب کسی حد تک کشمیر میں حالات سازگار ہو رہے ہیں اور توقع ہے کہ جلد از جلد کشمیر پھر اپنی سابقہ شان و شوکت کی طرف لوٹے گا جس کے لئے وہ مشہور ہے اور پوری دنیا میں اسے جنت نشان سے یاد کیا جاتا ہے۔ کشمیر کے ذکر کے ساتھ قدرتی طور پر ہمارے ذہن میں مندرجہ ذیل واقعہ تازہ ہو گیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ کشمیری عوام کس قدر انسانیت کے پرستار ہیں وہ اسلامی تعلیمات کے سچے پیروکار ہیں اور اسلامی ورثہ، اسلامی تہذیب و تمدن کے صحیح معنوں میں امین ہیں ان میں اسلامی تعلیمات کی پیروی کے تحت اپنے غیر مسلم بھائیوں کی بھلائی و بہتری اور ان کی خدمت کرنے کی تڑپ ہر وقت دل میں رہتی ہے۔

"حاجی احمد اللہ مرحوم و مغفور سری نگر کشمیر کی ایک قابل لحاظ قابلِ احترام مخیّر و نیک دل اور مذہبی شخصیت ہوئے ہیں۔ ان سے متعلق ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے، سری نگر میں ان کی معمولی چھوٹی سی سوڈا واٹر کی ایک دکان تھی ایک دن میں وہ حسب معمول دوکان پر بیٹھے تھے کہ انکی دوکان کے سامنے والی سڑک پر سے ایک تانگہ گرتا پھسلتا ہوا آگرا اس میں ایک پورا ہندو پریوار جو اپنے آبائی وطن کلکتہ سے سری نگر گھومنے آیا ہوا تھا، بیٹھا تھا وہ سب تانگے سے ایسے گرے کہ ان کے ہاتھ پاؤں، کمر، پیٹ سب جگہ سخت چوٹیں آئیں۔ پردیس اور وہ بھی مسلم علاقہ میں ہندو پریوار کا کوئی شناسا ہی نہ تھا، اب زندگی کی امید اس کے سامنے ختم موت ہی موت دکھائی دے رہی ہے مگر نہیں۔ جہاں حاجی احمد اللہ جیسی نیک دل ہستیاں موجود ہوں وہاں نہ کوئی ہندو ہونے کیوجہ سے اجنبی ہے اور نہ کوئی اور دوسرے مذہبی ہونے کی وجہ سے بیگانہ! حاجی احمد اللہ اپنی دوکان کو کھلی چھوڑ، چوری چاری کی پرواہ کئے بغیر تانگے سے گری شدید چوٹوں میں مبتلا درد سے کراہ رہی سواریوں کی امداد کو لپکے اپنے سہارے سے انھیں اٹھایا اور اپنی دوکان میں چارپائی کا کسی نہ کسی طرح ارجنٹ انتظام کرکے انھیں اس

۱۶۳

لٹا کر دوکان کی صندوقچی میں سے سب کچھ پونجی نکال جیب میں رکھ کر ڈاکٹر کو لینے چلے گئے بھاگم بھاگ ڈاکٹر آئے تانگے سے گری سواریوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا، مرہم پٹی اور ضروری علاج ومعالجہ کیا۔ ڈاکٹر کے ساتھ حاجی احمد اللہ خود بھی ان کی معاونت کے لئے لگے رہے۔ چوٹ اور درد کی شدت کی کمی ہوئی اور سواریوں کی جان میں جان آئی، ڈاکٹر نے حاجی احمد اللہ سے فیس طلب کی جو اس قدر زیادہ تھی کہ حاجی صاحب کے جیب میں اتنی رقم نہیں تھی بہر حال نیک دل ہمدرد انسانیت حاجی احمد اللہ نے اپنے کسی واقف کار پڑوسی سے کسی طرح قرض لیکر ڈاکٹر صاحب کی فیس ادا کردی۔ کئی روز تک ان کا علاج ہوتا رہا اور حاجی احمد اللہ ڈاکٹر اور دواؤں کے تمام اخراجات جسطرح بھی بن پڑے ادا کرتے رہے اور ان جان نہ پہچان مصیبت زدہ ہندو پریوار سواریوں کی اپنی سگی اولاد سے بھی زیادہ اچھی طرح تیمارداری کرتے رہے۔ ذرا تصور کیجئے ۱۹۳۶ء کے دور کا جبکہ کشمیر میں سیکولرزم کے لفظ کا کسی کو علم ہی نہ تھا اسلامی معاشرہ وماحول کا بول بالا تھا اب ان کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ یہ غیر مسلم بھائی بہن ہیں انکا کھانے وغیرہ کا انتظام انھوں نے بہت ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک کشمیری پنڈت کے یہاں اپنے پیسوں سے کرادیا۔ اچھے علاج ومعالجہ اور حاجی احمد اللہ جیسے فرشتہ خصلت انسان کی بے لوث خدمت اور اللہ تعالی کے فضل وکرم سے وہ سب بالکل صحت یاب ہو گئے تو انہیں وطن کلکتہ پہنچانے کا انتظام کیا۔ مرحوم حاجی رحمۃ اللہ خود انھیں چھوڑنے اسٹیشن گئے پردیسی غیر مسلم پریوار ان کی انسانیت نوازی، ان کی خدمت، ان کی تیمارداری اور ان کے اچھے اخلاق برتاؤ کردار وعمل سے اس قدر متاثر تھے کہ بار بار وہ حاجی صاحب کا شکریہ ادا کررہے ہیں جواب میں حاجی احمد اللہ بار بار یہی کہتے رہے کہ یہ ان پر کوئی احسان نہیں بلکہ اپنا دینی، اخلاقی، انسانی فرض تھا۔ وداع ہوتے وقت پردیسی غیر مسلم پریوار کی ماں نے حاجی احمد اللہ کو گلے لگایا اور کہا کہ بیٹا میرے چھ بیٹے ہیں اور ساتواں بیٹا میرا تو ہے۔ ہم کلکتہ کے رہنے والے ہیں یہ میرا بڑا لڑکا ہے اس کا نام شیاما پرشاد مکرجی ہے یہ تیرا بھائی ہے کلکتہ میں اس کا نام لیکر ہمارے مکان کا پتہ ہر شخص بتادے گا تم کلکتہ ضرور ضرور آنا۔ اور ہمارے گھر ہی پر ٹھہرنا ـــــ بات آئی گئی ہوگئی، اس واقعہ کو سالہا سال بیت گئے حاجی احمد اللہ کی سوڈا واٹر کی دوکان کسی وجہ سے ختم ہوگئی،

اب وہ کسی دوسرے کام کی تلاش میں سری نگر سے باہر دوسرے شہروں کی طرف نکل پڑے۔ کلکتہ بھی گئے تو انہیں اپنے ان ہی جان نہ پہچان مصیبت زدہ غیر مسلم مہمانوں کا دل میں خیال آیا کلکتہ میں ان کا نام جیسے لوگوں کے سامنے لیا تو حاجی صاحب پر یہ بھید کھلا کہ ان کے جان نہ پہچان مہمان کوئی ایرے غیرے نہیں کلکتہ کے مشہور و معروف لوگ ہیں کوئی بیرسٹر ہے کوئی وکیل اور کوئی بہت بڑا بزنس مین۔ ان کی بہت بڑی حویلی نما کوٹھی کے دروازے پر زبردست پہرہ دیکھ کر حاجی صاحب دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ یہاں ہمیں کون پوچھے گا اور نہ انہیں یاد بھی ہوگا یا کوئی پہچانے گا بھی نہیں۔ دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا اور وہ اندر جانے کے لئے دربان سے بات کرتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ اتنے میں کوٹھی کے دربان نے ایک مسلمان کو ہندو کوٹھی کے سامنے اس طرح کھڑے دیکھا تو ڈانٹے ڈپٹتے ہوئے پوچھا کہ تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔ دربان اور حاجی صاحب کے درمیان یہ مکالمہ ہو ہی رہا تھا کہ حویلی نما کوٹھی سے کوئی نکلا تو اس نے لپک کر حاجی کو گلے سے لگا لیا کہ تم یہاں باہر کیسے کھڑے ہو اندر کیوں نہیں آئے۔

دربان یہ نظارہ دیکھ کر خود ہی خوف زدہ اور حیران و ششدر! خوف زدہ اس لیے کہ جس طرح گھر کا ایک ممبر ان سے لپٹ کر ملا ہے اسے دیکھ کر سگے رشتے دار یا فیملی ممبر ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور حیران کہ ایک کٹر ہندو پریوار ایک اُجڈ سے مسلمان کا کس طرح گلے لگا کر استقبال کر رہا ہے۔ حاجی احمد اللہ صاحب اندر کوٹھی میں گھستے ہیں کہ سب چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ ہمارا بھائی آ گیا ہمارا بھائی آ گیا اور ماں وہ تو بس دیکھتے ہی لپٹ گئیں کہ ارے بیٹا تو کب آیا چل نہا دھو اور پہلے کھانا کھا آرام کر پھر تجھ سے باتیں کریں گے پہلے تو اپنی تھکان دور کر اتنے لمبے سفر سے آیا ہے۔ پھر کوٹھی کے سارے ہی ممبر یعنی ایک ہندو پریوار کے سارے کے سارے لوگ اپنے مسلمان بھائی بیٹے کی خاطر داری اور خدمت میں ایک ٹانگ سے خوشی و مسرت سے ناچتے گاتے جھومتے جٹ گئے۔ حاجی احمد اللہ کی آنکھیں بھر آئیں اور انھیں معلوم ہوا کہ انسانیت محبت کیا شئے ہے ہندو گھر میں انھیں بالکل اپنا پن ملا۔ یہاں یہ اور سن لیجیے کہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی ملک کی مشہور ہستی اور ایک ہندو جماعت جن سنگھ کے بانی اور آر ایس ایس کے زبردست لیڈر ــــــ اور ان کا ایک بھائی سب سے پیارا سب سے دُلارا مسلمان حاجی احمد اللہ!

... میں اسلامی تعلیمات کی پیروی کے نتیجہ میں اعلیٰ عمل و کردار ۔۔۔ سری نگر کے مسلمان خاندان کا کلکتہ کے ہندو پریوار سے میل جول پروان چڑھا۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کے مشورے و تعاون سے حاجی احمد اللہ نے کشمیری شالوں کا کاروبار شروع کیا اور حاجی احمد اللہ مرحوم و مغفور ہو چکے ہیں۔ مگر ان کے ایک ہندو بھائی کے تعاون و مشورے سے شالوں کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور ان کی اولاد اپنی نیک و حلال کمائی سے دین اسلام کی انسانیت د عظیم خدمات انجام دے رہی ہے اور یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بنی نوع انسانی کو ان سے کب تک فیض حاصل ہوتا رہے گا ۔۔۔ اس سلسلے میں ایک ذکر اور سن لیجئے۔ کسی کام سے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کو لاہور جانا پڑا حاجی احمد اللہ نے لاہور میں ان کی اجنبیت محسوس کرتے ہوئے اپنے ایک دوست تاج الدین صاحب، جن کا لاہور میں کپڑے کا بڑا کاروبار تھا کے نام ایک تعارفی خط لکھا اور ڈاکٹر مکرجی سے کہا کہ تم کو لاہور میں رہنے ٹھہرنے کھانے وغیرہ کی ہر سہولت انشاء اللہ یہ دوست مہیا کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر مکرجی لاہور اسٹیشن سے سیدھے تاج الدین کی دکان پر تانگہ لے کر پہنچے۔ اور جب انہوں نے حاجی احمد اللہ کا خط پڑھا اور اسمیں شاما پرشاد مکرجی کا نام دیکھا تو تانگہ ہی سے سیدھے اپنے خرچہ پر لاہور کے عالی شان ہوٹل میں ان کے رہنے ٹھہرنے کا معقول انتظام کیا جتنے دن بھی وہ لاہور رہے تاج الدین صاحب ان کی میزبانی میں جٹے رہے رہنے کھانے وغیرہ کے تمام اخراجات مہمان کے بار بار منع کرنے کے خود ہی ادا کرتے رہے۔ کچھ عرصہ لاہور میں رہے اپنا کام پورا کرنے کے بعد ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی تاج الدین صاحب کا احسان و شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی خوشی لاہور سے رخصت ہوئے۔ تاج الدین صاحب نے اپنا اسلامی فرض سمجھتے ہوئے غیر مسلم مہمان کی ہر طرح خاطر داری و دلجوئی کی اس لئے انہوں نے حاجی احمد اللہ سے غیر مسلم مہمان کی آمد وغیرہ کا کوئی تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن حاجی احمد اللہ کو دل ہی میں بڑا کھٹکا لگا رہا کہ تاج الدین ڈاکٹر مکرجی کو ملے یا نہیں اور اگر ملے تو ان کی مہمان نوازی میں کوئی کوتاہی تو نہ کی۔ اور اگر خدانخواستہ تاج الدین صاحب نے لاہور میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کے ساتھ بے رخی برتی تو پھر کسقدر بری شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا ایک مسلمان کے بارے میں انکے دل میں اتنا اچھا خیال، اور دوسرے مسلمان کے بارے

میں کیا تیاں پیدا ہوگا؟ اس فکر و پریشانی میں مبتلا ایک دن حاجی احمد اللہ کی ڈاکٹر ... رشاد مکرجی سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ اور انہوں نے لاہور میں اپنے قیام کے دوران تاج الدین کی مہربانی ان کی طرف سے ہر طرح کی ہدایات سکھ، واسائش کو پہنچانے کا شکریہ کے ساتھ ذکر کیا۔ بار بار تاج الدین صاحب کے حسن سلوک کی تعریف ... کر حاجی صاحب کا دل طمئن ہوا احساس مسرت سے دل بھر آیا۔ لاہور میں تاج الدین صاحب کو خط لکھا شکریہ ادا کرنا چاہا جواب میں تاج الدین صاحب نے کہا کہ حاجی احمد اللہ شکریہ کیسا؟ شکریہ تو مجھے خود تمہارا کرنا ہے کہ تم نے مجھے ایک ممتاز غیر مسلم کی خدمت کا موقع بہم پہنچایا اور اس طرح میں نے اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بموجب غیر مسلم بھائی کی خصوصی دلجوئی و خاطر کر کے تبلیغ اسلام کا فرض پورا کیا —— اللہ اکبر یہ ہے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نیکی و اسلامی کردار و عمل کی عظیم الشان مثال! حاجی احمد اللہ کی عاقبت بھی سنور گئی اور دنیا میں بھی اللہ نے بہتری کے سامان پیدا کرائے۔ جس کشمیر میں حاجی احمد اللہ جیسے شیدائی و پرستار اسلام نے جنم لیا ہو اس کشمیر میں کسی تشدد اور خرمن امن کو برباد کرنے کی کوئی خبر پیدا ہوتی ہے تو اس سے ہر محب وطن اور شیدایان اسلام کے دل و دماغ کو دھچکا ہی لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کشمیر میں جلد از جلد امن و امان قائم ہو اور کشمیری عوام ملک و قوم کی خدمت و ترقی کے لئے برادران وطن کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لگے رہیں!

⁘　⁘　⁘　⁘　⁘　⁘　⁘　⁘

جدوجہد آزادی اور فرائضی تحریک

مختار احمد ملی، شعبہ سیاسیات، کریم سٹی کالج جمشید پور

انگریزوں کے خلاف بنگال کے نواب سراج الدولہ اور میسور کے ٹیپو سلطان [illegible]
کشمکش انفرادی اور وقتی نوعیت کی تھی اور اس میں کسی خاص بڑے نصب العین اور عوا[illegible]
تحریکات کو بہت زیادہ دخل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی شہادت کے بعد یہ جذبہ ان
کے دلوں پر سرد پڑ گیا اور اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ افراد کی اصلاح و تربیت اور
عوامی تحریک کی تنظیم پر زور دیا جائے اور اس کے لئے مولانا نثار علی عرف ٹیٹو میر (شہادت ۱۸۳۱ء)
[illegible] حاجی شریعت اللہ [illegible] نے بنگال میں فرائضی تحریک کو شروع کیا جس کو
بعد میں حاجی شریعت اللہ کے صاحبزادے حاجی محسن الدین احمد عرف دودو میاں (۱۸۱۹ء تا
۱۸۶۱ء) نے اپنے نقطہ عروج تک پہونچایا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلم بنگال مذہبی، سماجی، تعلیمی
معاشی اور سیاسی پسماندگی کے انتہا پر تھا شریعت ارباب تصوف اور پیرزادوں کے
حصار میں محصور ہو کر رہ گئی تھی پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ پیروں کے ساتھ محیر العقول
واقعات اور کرامات وابستہ تھے اور اس میں بدھ مت، ویشنو مت اور ہندو مذہب کی
خرافیات کا نمایاں اثر تھا معاشی طور پر مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی کیونکہ انگریزوں نے
قدیم زمینداری نظام کا خاتمہ کرکے پٹہ داری زمینداری کا نیا طریقہ شروع کیا تھا جس
کو تاریخ میں بندوبست دوامی کہا جاتا ہے۔ لارڈ کلائیو نے بہار و بنگال کی دیوانی ۱۷۶۵ء
میں حاصل کرنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ تمام زرعی اور غیر زرعی زمین ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت
ہے اور کھیتی باڑی کے لئے ٹھیکہ پر دی جائے گی ہر کھیت کے ٹھیکہ کا نیلام ممکن نہیں تھا اس
وجہ سے پندرہ بیس دیہات ایک ساتھ سال بھر کے لئے ٹھیکہ پر دئے جانے لگے۔ مسلمان

امراء اور زمیندار عام طور پر لٹ چکے تھے اس موقع پر ہندو بنیئے اور ساہوکار میدان عمل میں کود پڑے اور انہوں نے بنگال و بہار کی اسّی فیصد سے زیادہ زرعی اراضی کا ٹھیکہ لے لیا لارڈ کارنوالس (۱۷۸۶ء تا ۱۷۹۳ء) کے عہد میں جب ٹھیکہ حسب معمول نیلام کیا گیا تو ہندو ساہوکاروں اور گماشتوں نے سیکڑوں دیہات فی ایکڑ بالکل معمولی ملائے کے عوض حاصل کر [illegible] اس کے بعد کارنوالس نے ایک سرکاری اعلان کی رو سے ٹھیکیداروں کو مالکانہ حقوق [illegible] اس طرح زمینوں کے مالک محض مزارع بن کر رہ گئے ٹھیکیدار انہیں بروقت بے [illegible] تھا) زمین کے سے مالکوں سے جو کہ زمیندار یا راجہ کہلاتے تھے ظلم و ستم جبر و [illegible] جن زندگی کا ماحول بنا رکھا [illegible] اور بقول رو [illegible] سپیرین [illegible] ٹھیکیداروں کے کاشتکاروں سے تعلقات کی نوعیت [illegible] تھی کسی قصاب [illegible] کے مذبوح جانور سے ہوتا ہے (۱) عدل و انصاف کا حصول مشکل تھا تیل کے [illegible] سے کبھی فائدہ انگریزوں کے بعد ہندو زمینداروں اور مالکان کو ہی ہوا اور اس طرح مسلم کسان ہندو زمینداروں اور صنعت کاروں کے رحم و کرم پر چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستے رہتے۔ ہندو زمینداروں کا ظلم و ستم اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ قانونی ٹیکسوں کے علاوہ ہندو رسم و رواج اور پوجا پاٹ کے موقع پر بھی ٹیکس لگاتے اور جبراً وصول کرتے (۲) مسلمانوں کی مذہبی غیرت کو کچلنے اور ان کی دینی حس کو ختم کرنے کے لئے داڑھی ٹیکس بھی وصولنے لگے (۳) انہیں حالات میں ٹیٹو میر کی فرائضی تحریک مغربی بنگال اور ۲۴ پرگنہ کے علاقہ میں ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء میں بڑی تیزی سے ابھری اور انہوں نے بیک وقت ہندو زمیندار اور انگریز حاکموں سے ٹکر لی اور مسلم کاشتکار اور کسان مزدور دیوانہ وار اس تحریک سے وابستہ ہوتے چلے گئے کیونکہ خونیں انقلاب کے لئے یہ موزوں وقت تھا ظلم کے حد سے گذر جانے کے باعث مظلوم گربہ مسکین کے مانند ظالم سے بھی ٹکر لینے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

نثار علی عرف ٹیٹو میر کی پیدائش برسات ضلع کے چاند پور گاؤں میں ہوئی تھی اور وہ سید احمد شہید کے معتقدوں میں تھے وہابی تحریک سے وابستگی تھی اور ہندوانہ رسم و

رواج کے مخالف تھے انہوں نے ایمان خالص اور توحید کا درس دیا ان کی تدریس کے نتیجہ میں بہت جلد کسانوں کی عوامی تحریک کی شکل اختیار کرلی لیکن حاجی شریعت اللہ سے وہ ان معنوں میں مختلف تھے کہ انہوں نے عیدین اور جمعہ کی نماز ہندوستان میں ادائیگی پر اعتراض نہیں کیا۔ نومبر ۱۸۳۱ء میں ان کی جماعت پر زمینداروں نے حملہ کردیا اور اس معرکہ میں وہ شہید ہوگئے اور ان کی جماعت کے ۳۵۰ افراد گرفتار کرلئے گئے ان کے ایک خاص معتقد غلام معصوم کو موت کی سزا سنائی گئی اور ۱۴۰ دوسرے پیروکاروں کو مختلف نوعیت کی دوسری سزائیں دی گئیں (۴) اس طرح مغربی بنگال میں ٹیٹو میر کے ذریعہ چلائی گئی تحریک جلد ہی ختم ہوگئی۔

مشرقی بنگال میں حاجی شریعت اللہ کی قیادت میں فرائضی تحریک دوبارہ ابھری جس نے دو محاذوں پر اپنا کام شروع کیا ایک طرف افراد کی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ دیتے ہوئے توحید خالص کی راہ پر چلنے کی دعوت اور بدعات و خرافات اور اوہام و مشرکانہ رسوم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے اسلام کے متعین فرائض (فرض کی جمع) پر عمل درآمد ہونے کی ترغیب دی اور دوسری جانب زمینداروں اور انگریز حکمرانوں کے ناجائز مطالبات اور ظلم و زیادتی کے تدارک کے لئے عملی کوشش کیں۔ حاجی شریعت اللہ کی پیدائش فرید پور ضلع کے ہندکھولہ پرگنہ کے دولت پور گاؤں میں ۱۷۸۱ء میں ہوئی تھی۔ آٹھ سال کی عمر میں والد ماجد کا انتقال ہوگیا گاؤں میں تعلیم کا مناسب انتظام نہ ہونے کے باعث ۱۲ سال کی عمر میں کلکتہ کا رخ کیا اور مولانا بشارت علی سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی اٹھارہ سال کی عمر میں مکہ معظمہ کا قصد کیا جہاں شیخ طاہر السنبل الشافعی کے حلقہ ارادت میں تقریباً بیس سال شامل رہے ۱۸۲۰ء میں واپسی ہوئی تو ان کی شہرت ایک متقی عالم اور کامیاب مناظر کی تھی۔ بنگال پہونچ کر بڑی خاموشی اور لگن سے رشد و ہدایت اور اصلاح و تبلیغ کا کام شروع کیا فرائض کی ادائیگی اور گناہوں سے توبہ پر زور رہتا اور جلد ہی فرائضی یا شریعتی تحریک آندھی بن کر بنگال کے مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں کے دل پر چھا گئی بقول جیمس ٹائیلر ڈھاکہ، فرید پور، باقر گنج اور میمن سنگھ میں ہر چھٹا مسلمان حاجی صاحب کا پیرو تھا (۵) جیمس وائز کا کہنا ہے کہ حاجی صاحب کی اخلاقی زندگی نے عوام میں انہیں بے انتہا مقبول بنادیا اور

اور انہیں اپنا روحانی باپ سمجھتے تھے (۶) حاجی شریعت اللہ نے بنیادی طور پر اصلاح معاشرہ کی طرف توجہ دی غیر اسلامی رسم و رواج اور بدعات و خرافات کو ترک کرنے کا مشورہ دیا ہندوانہ رسم و رواج اور ثقافت سے دور رہنے کی تلقین کی اور گناہوں سے توبہ کرکے صاف ستھری زندگی بسر کرنے پر زور دیا عدل و انصاف اور بھائی چارہ کی تعلیم نے مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں کو متحد اور بیدار کر دیا اور انہوں نے ہندوانہ ٹیکس کی ادائیگی سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں ہندو زمینداروں سے نبرد آزمائی اور مسلح تصادم شروع ہوا لیکن انہوں نے ہندو کلچر و ثقافت کے خلاف جنگ جاری رکھی ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کی موت ہوئی اور ان کے اکلوتے صاحبزادے حاجی محسن الدین احمد عرف دودو میاں (۱۸۱۹ء تا ۱۸۶۰ء) نے بائیس سال کی عمر میں نئے حوصلوں عزم اور امنگوں کے ساتھ تحریک کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالی اور اس طرح یہ تحریک مذہبی خطوط پر اصلاح معاشرہ اور توحید خالص سے آگے بڑھکر سیاسی سماجی اور معاشی تحریک بننے لگی ہندو زمینداروں سے مسلح جھڑپوں کا آغاز ہو ہی چکا تھا اس لئے مسلح رضاکاروں کی ایک جماعت تیار کرنے کی غرض سے تاکہ بوقت ضرورت دفاع کے لئے افراد مل جائیں دودو میاں نے اپنے والد کے معتقد جلال الدین ملا فرید پوری کی خدمات حاصل کی جو کہ اپنے وقت میں لاٹھی چلانے کے استاد تھے دوسری جانب ہندو زمینداروں نے اپنے اپنے علاقہ کے مسلمانوں کو فرائضی تحریک سے الگ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی ظلم و ستم کے نئے نئے تجربات کئے جیمس وائز کے لفظوں میں ڈاڑھی والے مسلمانوں کی ڈاڑھیوں کو سختی سے باندھ دی جاتیں اور ان کی ناک میں سرخ مرچ کے سفوف ٹھونس دئے جاتے یا دوسرے ملزم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں ننگا کر دیا جاتا اور ان کے بدن پر سرخ چیونٹیوں کے چھتے توڑ دئے جاتے یا ملزم کو پیٹھ کے بل لٹا کر ان کی ناف پر مٹی یا سفید چیونٹے پیالہ میں اوندھا کر رکھ دئے جاتے (۷) لیکن عشق تمام جسمانی آزار سے الگ بے خطر کود پڑنے کا درس دیتا ہے فرائضی تحریک سے الگ کرنے کے لئے یہ تمام حربے ناکام رہے دودو میاں اپنے معتقدین کی جماعت کے ساتھ ان بستیوں اور زمینداروں کا محاصرہ کرنے لگے جس کے نتیجہ میں پر تشدد مزاحمت

کا سلسلہ شروع ہوا ہندو زمیندار نے انگریز صنعت کاروں اور انتظامی افسران کو ورغلایا اور تحریک خلاف کان بھرے، دونوں قوتیں متحد ہوگئیں اور دودو میاں اپنے ۴۸ معتقدین کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے اور مقامی عدالت کی جانب سے انہیں مختلف طرح کی سزائیں دی گئیں لیکن اگست ۱۸۴۷ء میں سزاؤں کی توثیق کے سلسلہ میں کلکتہ کی اعلیٰ عدالت لگائے گئے الزامات سے مطمئن نہ ہوسکی اس وجہ سے عدالت نے ساری سزاؤں کو کالعدم قرار دیتے ہوئے ملزمین کو بری الذمہ قرار دیا فرائضی تحریک کے کارکن اسے تائید غیبی اور حق کی فتح قرار دیتے ہوئے تازہ ولولوں کے ساتھ میدان جنگ میں سرگرم ہوگئے (۸) مقامی عدالتوں کے خلاف ان میں عدم اعتماد پیدا ہوا اور ان لوگوں نے انگریزی عدالتوں کا بائیکاٹ کرتے ہوئے پورے مشرقی بنگال میں متوازی عدالتوں کا نظام قائم کیا جو ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۷ء قائم رہا اور انگریزی عدلیہ ناکارہ ہوکر رہ گئیں اس زمانہ کے مورخین اسے نظام خلافت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کا اس پر اتفاق ہے کہ انہوں نے ایسی ہمہ گیر تحریک چلائی کہ سرکاری مشنری ان کے سامنے مفلوج اور ناکارہ ہوکر رہ گئیں تھی۔ بنگال کے پولیس کمشنر ڈیمپر کا خیال ہے کہ دودو میاں نے کم از کم اسّی ہزار کارکن جمع کر لئے تھے جو کہ مکمل طور پر ان کے تابع تھے اور ان کا مقصد انگریزوں کو نکال کر اسلامی حکومت قائم کرنا تھا (۹)

(THE EXPULSION OF THE FOREIGN RULERS AND RESTORATION OF THE MOHAMMEDAN POWER)

اس بناپر فرائضی جماعت کو غیر قانونی اور دودو میاں کو خطرناک انقلابی قرار دیتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا اور انہیں علی پور بعدازاں فریدپور جیل میں قید کر دیا گیا ۱۸۵۷ء میں ان پر جیل میں کڑی نظر رکھی گئی کیونکہ باغیوں سے ملنے کا خطرہ تھا۔ ۱۳ جنوری ۱۸۵۹ء میں بیماری کی حالت میں انہیں رہا کیا گیا اور ۲۴ ستمبر ۱۸۶۰ء کو بہادر پور ضلع ڈھاکہ میں ان کا انتقال ہوا۔

فرائضی تحریک کے تحت اس میں شامل ہونے والے کارکن کو اپنے پچھلے تمام گناہوں سے توبہ کرکے نئے سرے سے اسلام میں داخل ہونا پڑتا اور توحید خالص پر عمل کرتا ہوتا۔ بقول جیمس فرائضی قرآن کے حروف اور کلمات کے سختی سے متبع تھے اور رجوبات قرآن میں

موجود نہ ہو اس کے خلاف تھے۔ ہنٹر نے فرائضی کارکنوں اور ان کے رہنما حاجی شریعت اللہ کو جہاد کا عامل اور کفر و بدعت اور شرک کا دشمن قرار دیا ہے ہر فرائضی کارکن کے لئے لازم تھا کہ وہ تمام ہندوانہ رسوم اور ثقافت سے پرہیز کرے۔ فرائضی قرآن کو ایک مکمل ضابطۂ حیات تسلیم کرتے تھے اسی لئے وہ اپنے کو فرائضی کہتے یعنی وہ جو فرض پر گامزن ہوں تاریخی طور پر اسلام جس کی اصلی شکل سترہویں صدی کے بنگال میں بدل گئی تھی ان کو صراط مستقیم پر لانے کی یہ کوشش تھی لیکن اس طرح عرب کے وہابیوں سے ان کی مماثلت ہوگئی گرچہ ان دونوں میں یہ فرق تھا کہ وہابی جہاد پر بہت زور دیتے جبکہ فرائضی اس حد تک جہاد پر زور نہیں دیتے تھے۔

بنگال میں ابتداً یہ تحریک مذہبی تھی اور اس کا مقصد مشرکانہ رسوم کا خاتمہ اور توحید خالص کو اپنانا تھا کالی پوجا اور درگا پوجا کے موقعہ پر لگائے گئے ٹیکس کو ادا کرنے سے مسلمان کاشتکاروں کا انکار گائے کی قربانی پر زور وغیرہ کی وجہ سے ہندو زمینداروں سے مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا اور ضرورت محسوس ہوئی کہ کاشتکاروں اور مزدوروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ان کو مدافعت کی مناسب ٹریننگ دی جائے اور جب عدالت پر سے ان کا اعتماد ختم ہوگیا تو انہوں نے پنچایتی نظام کا نئے سرے سے احیاء کیا انہوں نے نظام خلافت پر زور دیا جس کے تحت فرائضی کارکنوں کو باہم مربوط رکھنے اور ایک دوسرے کے حالات سے مطلع کرنے اور امیر تحریک کو براہ راست نظم و ضبط سے منسلک رکھنا تھا۔ تحریک کا اعلیٰ ترین منصب استاد کا تھا جو کہ تمام فرائضیوں کا نگراں سرپرست اور ذمہ دار ہوتا تھا اس کے بعد اپرستا خلیفہ کا عہدہ تھا جو کہ نائب استاد تھا اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ خلیفہ اور آخری درجہ میں یونٹ خلیفہ وارڈ خلیفہ یا گاؤں خلیفہ کا عہدہ تھا جو کہ ایک یونٹ (سو سے پانچ سو فرائضی خاندان پر مشتمل) کا نگراں ہوتا دس یا زائد یونٹوں والا علاقہ گرڈ کہلاتا تھا اور وہ سپرنٹنڈنٹ خلیفہ کے زیر اہتمام ہوتا انہیں ایک پیادہ اور چپراسی رکھنے کا اختیار ہوتا تاکہ احکامات نافذ کئے جاسکیں اور احکامات و ہدایات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچایا جاسکے۔ یونٹ خلیفہ کے ذمہ فرائضیوں کو اسلام کے بنیادی ارکان سے واقف کرانا تھا با جماعت

نماز کے لئے جگہ متعین کرنا۔ اماموں کا تقرر سماجی واخلاقی ضروریات کی تکمیل شادی بیاہ
تدفین وتکفین وغیرہ کے معاملات شامل تھے سپرنٹنڈنٹ خلیفہ گرڈ کے تمام خلفاء کی نگرانی
کرتا اور انہیں مناسب اقدامات اور مشوروں سے نوازتا گرڈ کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور
مذہبی معاملات کی دیکھ ریکھ ان کی مکمل ذمہ داری تھی یونٹ خلیفہ اور سپرنٹنڈنٹ خلیفہ کی
تمام کارگذاری ریکارڈ میں محفوظ رکھی جاتیں اور جب استاد یا امیر ستا خلیفہ (نائب خلیفہ)
دورے پر نکلتا تو اس کے سامنے تمام رپورٹیں پیش ہوتیں اگر وہ ان سے اتفاق کرتا تو اپنا
دستخط یا مہر ان پر ثبت کر دیتا ورنہ تمام کارروائی مرکز کو تحقیق اور فیصلہ کے لئے بھیج دیئے
جاتے آپس کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے ان کے پاس مؤثر متوازی عدالتیں تھیں جس
میں غیر فرائضی مسلمان اور ہندو بھی اپنے مقدمات پیش کرتے اور بقول جیمس وائز فرائضی عدالتوں
کا نظام اس قدر مؤثر تھا کہ ہندو عیسائی اور مسلمان سبھی اس کے فیصلہ کے پابند ہوتے تھے (۱)
نوین چندر سین کا کہنا ہے کہ فرید آباد کی اکثریت نیا میاں (فرائضی تحریک کے ایک کارکن) کے
احکامات وحی الٰہی کی طرح تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح عاجزانہ اطاعت گذاری دوسری قوم میں
کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی ان لوگوں نے انگریزی حکومت کے اندر ایک اسٹیٹ قائم کر رکھی ہے
جہاں ان کی اپنی عدالتیں بھی ہیں۔

فرائضی تحریک کے مقبول عام ہونے کی ایک بڑی وجہ ان کا پرکشش سماجی پہلو
خاص طور پر ان کی مساویانہ تعلیمات تھیں ۱۹ویں صدی کے طبقاتی امتیازات اور سماجی تفریقات
کے ماحول میں فرائضیوں نے انسانیت مساوات، اخوت اور بھائی چارہ کا درس دیا۔ دودومیاں
کا موقف تھا کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مسلمان کی مصیبت کے وقت مدد
کرنا دوسرے مسلمان کا فرض ہے ادنیٰ اور غریبوں کے مفاد کا خیال مالداروں اور بڑوں سے
زیادہ رکھا جاتا تھا معاشی میدان میں دودو میاں کا موقف تھا کہ زمین خدا کا عطیہ اور اس کی
نعمت ہے اور انسان خدا کا بندہ اور مخلوق ہونے کیوجہ سے انتفاع اور استفادہ کا
یکساں حق رکھتا ہے ہر وہ شخص جو زمین کی کاشت کر رہا ہے اس کا مالک ہے ملکیت محنت
اور جدوجہد سے ثابت ہوتی ہے محض وراثت سے نہیں اس سے بنگال کی وہ زمین جو

کسانوں کی کاشت میں استعمال ہو رہی ہیں انہیں کی ملکیت سمجھی جائیں گی اور زمینداروں کا جبری قبضہ رکھنا اور کسانوں کا استحصال کرنا ظلم اور اسلام کے خلاف ہے اور اس کے لئے جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے۔(۱۲)

سیاسی بنیادوں پر فرائضیوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ان کا کہنا تھا کہ چونکہ بنگال پر انگریزوں کی حکومت ہے اور یہاں کی انتظامیہ اور معیشت پر ان کا پورا کنٹرول ہے اس لئے یہ دارالحرب ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دارالحرب کو دارالسلام میں تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور کوشاں رہیں دارالحرب قرار دینے کی وجہ سے بنگال میں عیدین اور جمعہ کی نماز مناسب نہیں ٹھہریں کیونکہ فرائضیوں کا کہنا تھا کہ عیدین اور جمعہ کی نماز کا اہتمام مصر الجامع میں ہی کیا جا سکتا ہے مصر الجامع سے ان کی مراد ایسے شہر سے تھی جہاں مسلم امیر اور قاضی موجود ہوں اور ان کی تقرری مسلم بادشاہ کی جانب سے کی گئی ہو اس مذہبی فتوی کے نتیجہ میں ایک انقلابی نقطہ مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور بقول ہنٹر اس فتوی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انقلابی مسلمانوں نے انگریزوں سے رزم آزمائی شروع کر دی دیندار مسلمانوں نے جمعہ و عیدین کی ادائیگی ترک کر دی کہ جب تک یہ ملک دارالسلام نہیں بن جاتا یہاں امن و چین سے رہنا جائز نہیں ؛ یہ انگریزوں سے نفرت باقی رکھنے کے لئے بھی تھا اس طرح ایک خالص مذہبی مسئلہ سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد آزادی میں فرائضیوں کے ہاتھ یہ ایک نایاب حربہ تھا دودو میاں کے وفات کے بعد فرائضی کرامت علی جونپوری (۱۸۰۰ء تا ۱۸۷۳ء) کے گرد جمع ہوئے جن کا بنیادی طور پر تعلق وہابی تحریک سے تھا وہ فرائضیوں کے برعکس ہندوستان کو دارالحرب نہیں بلکہ دارالامن مانتے تھے اس طرح وہابی تحریک کے لئے اسلحہ افراد اور روپیہ جمع کرنے میں بھی یہ علاقہ زرخیز زمین کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

References.

1. Rebospier ion -Calcutta review Vol.I 1844 196. and Saidullah Fahad -Tehrik Faraizi Ke Seyasi. Nazriyat - Fikro Nazer A.M.U. Aligarh vol.38 No.21992 P.70

2. James Wise Notes on the races castes and Trades in Eastern Bengal London 1884 P.53.

3. Abdul Karim Social History of Muslims in Bengal down to A.D. 1538 Asiatic society of Pakistan. Dacca 1959 P 209.

4. Lotifa Akanda Social history of Muslim Bengal Dacca 1981 P.182.

5. Moinuddin Ahmad Khan - History of Faridi. Movement in Bengal (1818-1906) Pakistan historical society Karachi 1965 P 12

6. James Wise op Cit P52

7. Ibid P46

8. Moinuddin Ahmad Khan Op cit P 40-41.

9. I bid P46

10. Latifa Akunda op Cit P 184

11. James Wise op Cit P 34

12. Moinuddin Ahmad Khan Op Cit 114

نظیری نیشاپوری

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، شعبۂ فارسی، ایم۔ ایس۔ یونیورسٹی، بڑودہ (گجرات)

غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا۔ ادبی اصطلاح میں یہ لفظ ان اشعار پر عائد ہوتا ہے جس میں عشق و محبت کے جذبات ادا کئے جائیں۔ فارسی شاعری کا آغاز سامانیوں کے عہد میں ہوا۔ شاعر سلاطین اور امراء کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے اور انعام و اکرام اور داد سخن پاتے تھے۔ لیکن انسان کے لئے بالعموم اور شاعر کے لئے بالخصوص عشق و محبت کے جذبات سے مفر نہیں۔ لہٰذا سامانی اور غزنوی دور کے شعراء قصیدے کا آغاز عشقیہ اشعار سے کرتے تھے اور قصیدہ کا یہ جزو تشبیب کہلاتا تھا۔ اکثر ان تشبیبوں میں محبوب کا سراپا، اس کی بے وفائی اور کج ادائی کا ذکر ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ عشقیہ جذبات کے اظہار کے لئے غزل ایک معین اور ممتاز شکل میں نمودار ہوئی۔ لیکن عشق مجازی کی واردات اور کیفیات کا دائرہ محدود ہوتا ہے نیز ان میں گہرائی اور گداز کی کمی ہوتی ہے۔ سلجوقیوں کا سیاسی اقتدار بڑھا تو خلافت اسلامی کی طاقت اور نفوذ اسی نسبت سے زوال پذیر ہوئے اہل ایران کے دلوں میں عجمیت کی خوابیدہ روح بیدار ہوئی اور اسلامی تعلیم اور طرز زندگی کی خشونت کا ردعمل تصوف کی شکل میں رونما ہوا۔ تصوف کے اثر سے غزل مجازی کی پستی سے ابھر کر حقیقت کی رفعت تک پہنچ گئی۔ سنائی، عطار اور ابوسعید ابی الخیر کی ادبی کاوشوں نے سعدی کی غزل گوئی کو جنم دیا۔ سعدی غزل کے ابوالآباء مانے گئے ہیں۔ ان کی غزل سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک عاشق کی زندگی کا آغاز و انجام اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

خاکی ماندانہ وجود دیگراں　　از وجود عاشقان خاکستری

کرتا ... اور حافظ نے ... ان دونوں

اس عہد اور اسی رنگ میں خواجو کرمانی نے غزل کہی ...

اور مجاز اور حسن معنی اور لطافت بیان کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

مذہبی ... کی استادانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے، وہ کہتے ہیں :-

دارد غزل مانند ... خواجو

تمام ... پیش ہمہ کس ...

دوسرے پر ...

دستخط ... اسلوب و معنی ...

جاتے ...

کو فروغ دیا۔

نظیری نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ ایران ...
خاندان کے حکمرانوں نے ایک طرف تو تشیع کو ایران کا ...
شاعروں کو مرثیہ گوئی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ ادھر ہندوستان میں سلاطین
مغلیہ کی حکومت اوجِ شباب پر تھی۔ بادشاہ اور امراء خود ادیب اور ادیب نواز
تھے، ان کی سخن پروری اور شاعر نوازی کی شہرت سن کر نظیری بھی ہندوستان چلا آیا۔
اور اکبر کے دربار سے وابستگی پیدا کی۔ اگرچہ غزل کے دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھا اور
مدحت سرائی بھی کی تو غزل کی صنف میں، لیکن اکبر سخن شناس اور قدردان مربی تھا۔
دل کھول کر دادِ سخن دی اور انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ نظیری کی زندگی خوشحالی
اور تموّل میں گذری۔ اس کا کلام خواص و عوام میں بہت مقبول ہوا۔ اگرچہ نظیری نے
تازہ گوئی کی روش اختیار کی۔ مگر وہ خود خواجہ حافظ کا معتقد تھا اور خواجہ شیرازی
کی پیروی کا مدعی، چنانچہ ایک غزل میں اعتراف کرتا ہے۔

تا اقتدا بہ حافظ شیراز کردہ ایم   گردید مقتدائی دو عالم کلام ما

دور کے کلام میں مجاز کا عنصر غالب ہے ۔ عشق و محبت کی واردات کی اتنی
اور پر تاثیر تصویر کھینچی ہے کہ قارئین بے ساختہ داد دیتے ہیں ۔ محبوب کی ادای
کے متعلق رقم طراز ہیں۔

شرم می آید ز قاصد طفل محجوب مرا برسر راهش بیند از ید مکتوب مرا

وصل کی کیفیت کا اس انداز میں نقشہ کھینچا ہے ؛

شادی تا صحر دستم به زلفی در همی دارد برسر راهش بیند از ید مکتوب مرا

وصل کی کیفیت کا اس انداز میں نقشہ کھینچا ہے ؛

تا صحر دستم بزلف در همی دارد گریبانم گریبانست و دامن دامن ست امشب

ہجر کا کیا رنگ ہے ؛

بخود از خلوت بردن آیم چو پروانه که برآید ز محفل ... شب ہا

کڑوی بات بھی عاشق کے کان میں شربت کے گھونٹ کی طرح ... بے نظیر
ہیں ؛

تو حرف تلخ فروشی و من شکر نوشم که چاشنی هزار آشتی ... جنگ ترا

... کی غزل سرائی کی سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ذہنی اور تعلیمی
احساسات کو مادی زندگی کی تمثیلات سے واضح کرتے ہیں ۔ محبوب کی رقیب نوازی کو
بیان کرتے ہیں ؛

نشست پہلوی من و ز رقیب جام گرفت گل تلافی من رنگ انتقام گرفت

عاشق کی بے قراری اور اضطراب کو بیان کرنے کے لئے ایک انوکھی تمثیل کا ... ہے ؛

تمنا لیش جو گرد دگرد خاطر مضطرب گردم چو محتاجی که گرد در سر اپش میهمان پیدا

آخری دور کے کلام میں حقیقت کا رنگ غالب ہے ۔ اپنے جذبۂ عشق صادق پر بجا طور
پر ناز کرتے ہیں ؛

عشق بازیم به معشوق مزاجی انداخت کز نیازیم که با اوست بخود نازی هست

جب سالکِ راہِ طریقت عرفان کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کتابی علم سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؛

اس عہد اور اسی رنگ میں خواجو کرمانی نے غزل کہی اور حافظ نے، جس کی غزل میں حقیقت اور مجاز اور حسنِ معنی اور لطافت بیان کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے، وہ کہتے ہیں ؎

استاد غزل سعدی ست پیش ہمہ کس اما　　　دارد غزل حافظ طرزِ روشِ خواجو

یہ تینوں شاعر فی الحقیقت صاحبدل اور صاحب معرفت سخنور تھے۔ متاخرین نے ان کی تقلید میں عارفانہ مضامین باندھنے شروع کئے لیکن وقت گذرنے پران کا رنگ پھیکا پڑنا شروع ہوگیا۔ اسلوب و معنی فرسودہ ہوگئے نویں صدی ہجری میں بابا فغانی شیرازی نے ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے کلام میں ہر بیت بہت سے پہلو لئے ہوئے ہوتا تھا۔ دو مصرعوں میں دس باتیں کہی جاتی تھیں۔ یہ طرز تازہ گوئی کے نام سے مشہور ہوئی اور ہندوستان کے شاعروں میں بہت مقبول ہوئی، نظیری نے بھی اس شیوۂ سخن گوئی کو فروغ دیا۔

نظیری نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ ایران میں صفوی خاندان کی عملداری تھی۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے ایک طرف تو تشیع کو ایران کا رسمی مذہب قرار دیا۔ دوسری طرف شاعروں کو مرثیہ گوئی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ ادھر ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کی حکومت اوجِ شباب پر تھی۔ بادشاہ اور امراء خود ادیب اور ادیب نواز تھے، ان کی سخن پروری اور شاعر نوازی کی شہرت سن کر نظیری بھی ہندوستان چلا آیا۔ اور اکبر کے دربار سے وابستگی پیدا کی۔ اگرچہ غزل کے دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھا اور مدحت سرائی بھی کی تو غزل کی صنف میں، لیکن اکبر سخن شناس اور قدردان مربی تھا۔ دل کھول کر دادِ سخن دی اور انعام و اکرام سے مالا مال کردیا۔ نظیری کی زندگی خوشحالی اور تموّل میں گذری۔ اس کا کلام خواص و عوام میں بہت مقبول ہوا۔ اگرچہ نظیری نے تازہ گوئی کی روش اختیار کی۔ مگر وہ خود خواجہ حافظ کا معتقد تھا اور خواجہ شیرازی کی پیروی کا مدعی، چنانچہ ایک غزل میں اعتراف کرتا ہے۔

تا اقتدا بہ حافظ شیراز کردہ ایم　　　گردید مقتدائے دو عالم کلام ما

ابتدائی دور کے کلام میں مجاز کا عنصر غالب ہے۔ عشق و محبت کی واردات کی آتنی صحیح اور پرتاثیر تصویر کھینچی ہے کہ قارئین بے ساختہ داد دیتے ہیں۔ محبوب کی ادائی حجاب کے متعلق رقم طراز ہیں۔

شرم می آید ز قاصد طفل محجوب مرا　　　　برسر راهش ببند از یاد مکتوب مرا

شب وصل کی کیفیت کا اس انداز میں نقشہ کھینچا ہے:

شماری تا سحر دستم بہ زلفی درهمی دارد　　　　برسر راهش ببند از یاد مکتوب مرا

شب وصل کی کیفیت کا اس انداز میں نقشہ کھینچا ہے:

شماری تا سحر دستم بزلف درهمی دارد　　　　گریبانم گریبانست در دامن دامن ست امشب

اور پھر شب وصل کی صبح کا کیا رنگ ہے:

سحر گہ خستہ و رنجور از خلوت بردن آیم　　　　چو پروانہ کہ برآید ز محفل آخر شبہا

محبوب کی کڑوی بات بھی عاشق کے کان میں شربت کے گھونٹ کی طرح اتر جاتی ہے نظیری کہتے ہیں:

تو حرف تلخ فروشی و من شکر نوشم　　　　کہ چاشنی ہزار آشتی ست جنگ ترا

نظیری کی غزل سرائی کی سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ذہنی اور تعلیمی احساسات کو مادی زندگی کی تمثیلات سے واضح کرتے ہیں محبوب کی رقیب نوازی کو بیان کرتے ہیں:

نشست پہلوی من وز رقیب جام گرفت　　　　گل تلافی من رنگ انتقام گرفت

عاشق کی بے قراری اور اضطراب کو بیان کرنے کے لئے ایک انوکھی تمثیل کا سہارا لیا ہے:

تمنائش جو گرد د گرد خاطر مضطرب گردم　　　　چو محتاجی کہ گرد در سرایش میہمان پیدا

آخری دور کے کلام میں حقیقت کا رنگ غالب ہے۔ اپنے جذبۂ عشق صادق پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں:

عشق بازیم بہ معشوق مزاجی انداخت　　　　کز نیازیم کہ با اوست بخود نازی ہست

جب سالک راہ طریقت عرفان کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کتابی علم سے بے نیاز ہو جاتا ہے:

کتاب ہفت ملت گر بخواند آدمی عامی ست　　　　نخواند تا ز جزو آشنائی داستانی را

نظیری گنتی کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھیں اپنی زندگی میں بھی شہرت اور حسن قبول حاصل ہوا اور بعد میں بھی ارباب ذوق نے ان کے کلام کو سر آنکھوں پر رکھا۔ ان کے معاصرین نے غزل گوئی میں ان کی فضیلت تسلیم کی۔

صائب اصفہانی کی رائے ہے:

صائب چہ خیال است شوی ہمچو نظیری　　　　عرفی بہ نظیری نرساند سخن را

موجودہ دور میں اقبال نے اس شعر میں نظیری کو خراج تحسین ادا کیا ہے:

ہر آنکہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست　　　　بملک جم ندہم مصرع نظیری را

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ضروری اعلان

"برہان" کا یہ شمارہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے، ماہ جون و جولائی ۱۹۹۳ء کا مشترکہ شائع کیا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں قبلہ آبا جان مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے خصوصی معتقدین حضرت مولانا غلام محمد نورگت اور حضرت مفتی شوکت علی فہمیؔ صاحب کے اچانک انتقال سے دل و دماغ کو جو غم اور دھچکا لگا اس سے ادارہ کے کام میں کچھ تعطل پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ جس کی وجہ سے رسالہ برہان بروقت کتابت و طباعت کے لئے نہ بھیجا جا سکا۔ امید ہے کہ قارئین ادارہ کی مذکورہ بالا مجبوری کو اچھی طرح سمجھیں گے۔

(ادارہ)

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں (آخری قسط)

(۱۵۸۰ - ۱۶۲۷ء)

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اس بادشاہ کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اسکی تفریح طبع کے لئے شکار کھیلنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس منظر سے امراء اور عوام دونوں محظوظ ہوتے تھے۔ حالانکہ تفریحی مشاغل کے موقعوں پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ امور سلطنت کیطرف سے بالکل غافل ہوگیا ہو لیکن حکومت کی ذمہ داریوں کا اسے ہمیشہ احساس رہتا تھا۔

اکبر کی ناخواندگی کے بارے میں فادر رقمطراز ہے:

" ہر ایک سوال کے بارے میں وہ اپنی رائے کا اتنی فراست اور دقیقہ رسی کا اظہار کرتا تھا کہ ہر وہ شخص جسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ خواندہ نہیں ہے، وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک عالم اور فاضل شخص تھا۔ فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے وہ اپنے متبحر عالم ملازمین پر فضیلت رکھتا تھا۔ جب کبھی بادشاہ اپنے محل سے باہر جاتا تھا تو اس کے ارد گرد امراء ہوا کرتے تھے اور پیدل چلتے تھے جب تک انھیں گھوڑوں پر سوار ہونے کی اجازت نہ دیدی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ فوجی دستے بھی ہمراہ ہوتے تھے۔"

بادشاہ کا لباس | بادشاہ ریشمی کپڑے پہنا کرتا تھا جن پر بڑی خوبصورت سنہری کشیدہ کاری ہوتی تھی۔ وہ سونے کے زیورات اور ہیرے جواہرات پہنا کرتا تھا اس کا فوجی لبادہ لمبائی میں اس کے گھٹنوں تک نیچے گرا ہوتا تھا۔ اور اس کے جوتے ٹخنوں تک ہوتے تھے۔ وہ بذاتِ خود اُن جوتوں کے نمونے بناتا اور انکی تراش وخراش خود ہی تجویز کرتا تھا۔ جب کبھی وہ محل سے باہر آتا تو وہ پوری طرح مسلح ہوتا۔ یورپی تلواریں اور خنجر رکھنے کا اُسے بڑا شوق تھا۔ خلوت میں کبھی کبھی وہ پرتگالی لباس پہنا کرتا تھا۔

اشیائے خوردنی :

اس کا دسترخوان بہت پُرتکلف ہوتا تھا۔ اکثر اس میں چالیس قسموں کے کھانے چُنے جاتے تھے۔ طعام خانے میں ان کھانوں کو سوتی کپڑوں میں لپیٹ اور ڈھک کر لایا جاتا تھا۔ ان کو باندھ دیا جاتا تھا اور باورچی ان پر مہر ثبت کر دیتا تھا۔ ان کھانوں کو نوجوان طعام خانے کے دروازے تک لاتے تھے، ان کے آگے آگے نوکر ہوتے تھے اور ان سب کے پیچھے ناظم مطبخ خانہ چلتا تھا۔ اور دروازے پر خواجہ سرا اُن کھانوں کو لے لیتے تھے۔ اور وہ لوگ ان کھانوں کو اُن لڑکیوں کے حوالے کر دیتے تھے جو کھانا کھلانے کی خدمات انجام دیتی تھیں۔

شاہانہ ضیافتوں کے علاوہ اکبر ہمیشہ تنِ تنہا کھانا کھاتا تھا۔ اکبر کوچ پر بیٹھ کر گاؤ تکیئے لگا کر وہ کھانا کھاتا تھا۔

علم و ادب کی سرپرستی :

مونسریٹ نے لکھا ہے کہ اعلیٰ خاندان کے یتیم لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا وہ بادشاہ بڑا اہتمام کرتا تھا۔

صنعت و حرفت کی سرپرستی :

اس کے محل سے منسلک شاہی کارخانے بھی تھے وہ صناعوں کی دستکاری کے کاموں کا معائنہ کیا کرتا تھا اور تفریح طبع کے لئے وہ خود بھی دستکاری کا کام کیا کرتا تھا بعض مرتبہ پتھر کی کانوں سے بذاتِ خود وہ پتھر کاٹ کر نکالا کرتا تھا۔

بادشاہ کی کبوتریں :

اکبر محل میں کبوتریں رکھتا تھا اور ان کی دیکھ بھال خواجہ سرا اور لونڈیاں کرتی تھیں اشاروں پر وہ کبوتریں اڑ جاتی تھیں اور ہوا میں طرح طرح کے کرتب دکھاتی تھیں۔

مذہبی عقائد :

مونسریٹ نے لکھا ہے کہ اکبر نے ایک مرتبہ پیغمبر اسلام کو "ایک بدمعاش اور مکّار کہا تھا"۔ دوسری ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ "اکبر برملا یہ کہا کرتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

وردین محمدی کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے" وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ وہ ایک ایسے فرقے کا پیرو ہے جو ایک ایسے خدا کی عبادت کرتا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور حقیقی لگن سے اس کی تلاش کرتا ہے۔ سچائی کے علم کے مقابلے میں وہ بیبیوں، بچوں، خزانوں اور مملکت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ اس طرح بادشاہ نے صوفی فرقے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

دوسرے ایک موقع پر فادر مونسریٹ نے شیخ کبور کا ذکر کیا ہے جسے وہ "ایک ملعون شخص" کی حیثیت سے یاد کرتا ہے۔ شیخ کے سلسلے کا ذکر کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے۔ "لذت پسندوں کے اس مقتدر کے بے شمار مرید اور مداح ہیں جن میں بہت سے شہزادے بھی شامل ہیں۔ یہاں تک کہ جلال الدین بھی بذات خود شامل ہے۔"

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اکبر کے پاس ایک سفید خیمہ تھا جو کابل کے سفر کے دوران شاہی صدر مقاموں کے احاطوں میں نصب کیا جاتا تھا جہاں وہ نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ لیکن واپسی کے سفر میں" وہ ایسا ظاہر کرتا تھا کہ اب وہ یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ اب وہ خیمہ نہیں نصب کیا جاتا۔"

فادر نے بالناتھ کی سمادھی پر اکبر کے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اکبر کو اس مقام تک لے جایا گیا تھا جہاں بالناتھ رہتا تھا۔ "ننگے پاؤں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ جاکر اس نے اس مقام اور اس پیغمبر کو عزت بخشی۔"

شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم:

فارس (ایران) کے ضابطے کے مطابق شہزادوں کی تعلیم دینے کا کام عالموں کے سپرد کیا جاتا تھا۔ مغلوں کا بھی یہی دستور تھا کہ جب کسی شہزادے کی مکتب نشینی کی رسم ادا کی جاتی تھی تو اس موقع پر شاہ وقت معلم اور اتالیق کو سونے کا ایک سکہ بطور نذر پیش کیا کرتا تھا۔ جب فادر کو شہزادہ مراد کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا تو اکبر نے اس کی خدمت میں سونے کا ایک سکہ پیش کیا تھا لیکن سچے ایک یسوعی ہونے کی وجہ

سے اس نے اس نذر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اکبر نے فادر مونسریٹ کو اپنے بیٹے کو سزا دینے کی بھی اجازت دیدی تھی۔ اس شہزادے کو ہتھیاروں کے چلانے گھوڑے کی سواری اور تیر اندازی کے فنون کی تعلیم دینے کے لئے دوسرے ماہرین مقرر کئے گئے تھے۔

شہزادیوں کی تعلیم کی طرف بہت توجہ دی جاتی تھی۔ شادی شدہ عورتیں انہیں دوسرے فنون کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ دوسرے مردوں کی نظروں سے بچانے کے لئے انہیں "سخت پردے" کے اندر رکھا جاتا تھا۔

مغل فوج اور فوجی پڑاؤ

مغلوں کا فوجی پڑاؤ:

ہمیشہ ایک منصوبے کے تحت مغلوں کا لشکری پڑاؤ عمل میں آتا ہے۔ اگر کوئی شخص چند دنوں اس پڑاؤ میں قیام کرتا تو بڑی آسانی سے وہاں کی جغرافیائی حالت کا علم حاصل کر سکتا تھا۔ "پیش خانہ" خوشگوار کھلے ایک میدان میں نصب کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کے خیمے کی داہنی سمت بادشاہ کے بڑے بیٹے اور اس کے ہم رکاب امیروں کے خیمے نصب کئے جاتے تھے۔ اس خیمے کی بائیں سمت اس کے دوسرے بیٹے اور اس کی سرکار کے امیروں کے خیمے لگائے جاتے تھے۔ دوسری قطار میں دوسرے شہزادوں کے خیمے نصب کئے جاتے تھے۔ اتفاقاً اگر کوئی شہزادہ بادشاہ کے ہمراہ نہ ہوتا تو بادشاہ کے خیمے کے دائیں بائیں اعلیٰ امیروں کے خیمے نصب کئے جاتے تھے۔

" ظاہری وضع قطع اور جسامت میں مساوی" بادشاہ کے دو پیش خیمے ہوتے تھے۔" ایک اس کے قیام کے لئے نصب کیا جاتا تھا اور دوسرا آگے کی منزل کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ پردے دیواروں کا کام دیتے تھے۔ شاہی خیمے کے دروازے کے سامنے اونچے ایک مستول کی چوٹی پر ایک مشعل راہ گیروں کی رہنمائی کے لئے روشن کی جاتی تھی۔ اگر رات کو کوئی شور و غل ہوتا تو لوگ دوڑ کر اس طرف جاتے تھے۔

بادشاہ، اس کے بیٹوں، ان کے امیروں اور دوسرے شہزادوں کے خیموں کی پشت پر بقیہ افواج کے خیمے "جہاں تک ممکن ہوتا ان کے افسروں کے خیموں کے قریب" یکجا نصب کئے جاتے تھے۔ بھیڑ بھاڑ سے بچنے کے لئے ان کو "فوجی ٹولیوں" میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔ ان کے درباری فوجی عہدہ داروں کے خیموں کے قریب بادشاہ، شہزادوں اور امیروں کے لئے علیحدہ علیحدہ بازاروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان بازاروں کو اردو کہا جاتا تھا۔

اگلی منزل میں خیمہ لگانے کے موقع پر "توپ خانے کی فوج شاہی پیش خانہ کے دروازے کے سامنے کھلے ایک میدان میں ٹھہرائی جاتی تھی" اور مہم سے افواج کی واپسی کے وقت توپ خانے کی فوج پیش خانے کے عقب میں یکجا جمع کی جاتی تھی۔

کوچ کے موقع پر فوج کی ترتیب:

سلطنت کی سرحدوں کے اندر فوج جنگی صف بندی کے ضابطے کے مطابق آگے نہیں بڑھتی تھی، سوائے چند ان فوجیوں کے جنہیں اس دن بطور محافظ دستے کے تعینات کیا جاتا تھا۔ بقیہ شاہی ملازم اور پیدل فوج کے ساتھ مل کر یہ محافظ دستے قطار بنا کر چلتے تھے۔ جب بادشاہ پڑاؤ کرتا تھا تو اس موقع پر پیش خیمے کے سامنے دونوں طرف دو سو قدم کی دوری تک سیدھی قطار باندھ کر شاہی فوج اس کا خیر مقدم کرتی تھی۔ ایک طرف ہاتھی کھڑے کئے جاتے تھے جنہیں پھینک کر مارنے والے ہتھیاروں سے زخمی ہونے سے بچانے کے لئے ہتھیار بند فوج بڑی چوکسی سے ان کی حفاظت کرتی تھی دوسری طرف تیر انداز گھوڑ سوار، کان کنی کے مزدور اور ہلکے ہتھیاروں سے لیس افواج ہوتی تھی۔ کیونکہ مغلوں کی سرکار میں سواروں کے رسالوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ان کے سامنے سے جب بادشاہ گذرتا تھا تو ان میں سے ہر ایک اسے آداب بجالاتا تھا۔ سفر کے موقع پر بادشاہ کے جلو میں پہلے سواروں کے دستے اور ان کے بعد ہاتھی چلتے تھے۔ ایک فرد کے علاوہ بقیہ لوگ خاموش رہتے تھے، جو دس قدم چلنے کے تھوڑے وقفے کے بعد آہستہ اور پر عظمت انداز سے نقارہ بجاتا تھا۔ مخبروں کے گھوڑ سوار دستے آگے آگے چلتے تھے اور جو کوئی شخص ان کے سامنے

آجاتا تو وہ اسے بھگا دیتے تھے۔

کوچ کے وقت شاہی حرم:

خوشگوار انداز میں مرصع ہودوں میں باپردہ بیٹھ کر شاہی بیگمات ہتھنیوں پر سفر کیا کرتی تھیں۔" باوقار اور باعظمت حلیہ کے معمر ۵۰۰ آدمی کی نگرانی اور تحفظ کے لئے مقرر ہوتے تھے۔" اس راستے میں ایسی احتیاط سے کام لیا جاتا کہ جو لوگ اس راستے میں آجاتے تو انھیں بہت دور تک کھدیڑ دیا جاتا۔ ان بیگمات کی خادمائیں بلا پردہ اپنی بیگمات کی سواری کے پیچھے اونٹوں پر سفر کرتی تھیں۔

باربرداری اور ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان لے جانے کا طریقہ:

خزانے کی نگرانی کے لئے باقاعدہ محافظ دستے مقرر کئے جاتے تھے۔ اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر لاد کر خزانہ لے جایا کرتے تھے۔ توپوں اور دوسرے سامانوں کو لے جانے کے لئے دو پہیوں کی گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ سامان کے لے جانے کے لئے ہتھنیوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ہاتھیوں کو جنگ کے لئے محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ دفاعی فوجی دستے ان ہاتھیوں کی نگرانی کرتے تھے۔ ان میں سے بعض ہاتھیوں کو بندوقیں لیجانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ لہٰذا جب بندوقیں چلائی جاتی تھیں تو یہ جانور ذرا سا بھی خوفزدہ نہ ہوتے تھے۔

کوچ کے فاصلے کی پیمائش:

ایک دن میں سفر کے دوران جتنا فاصلہ طے کیا جاتا تھا اسکی پیمائش مخصوص ایک عہدہ دار کیا کرتا تھا جو اس کام کے لئے تعینات کیا جاتا تھا۔ اس پیمائش کے لئے دس فٹ کا ایک ڈنڈا استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسے ہی بادشاہ سفر پر روانہ ہوتا تھا تو شاہی پیش خیمے سے وہ ناپنا شروع کرتے تھے۔ اور زمین کی پیمائش کرنے کے لئے بھی یہ ضابطہ

سودمند تھا۔ مونسریٹ نے لکھا ہے کہ "دس فٹ کے اس ڈنڈے کی دو سو فٹ لمبائی ایک کوس یا کروہ کے برابر ہوتی ہے جو دو میلوں کے برابر ہے"۔

فوج کے کھانے پینے کا سامان:

فوج کے لئے کھانے پینے کا سامان چاروں طرف کے شہروں کے علاوہ دیہاتوں سے بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ غلہ سستا تھا۔ یہاں تک کہ حزب مخالف کے ملک میں بھی خورد و نوش کے سامان کی قلت نہ ہوتی تھی"۔

شاہی سفر مینا:

اس موقع پر افواج کو کام کرنے والے مزدوروں کی کمی کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہ لوگ راستے کو ہموار کرتے چلتے تھے۔ اکبر نے جب کابل کے لئے سفر کیا تھا تو وہ لوگ علیحدہ ایک افسر کے زیر نگراں تھے۔ محمد قاسم خاں سڑکیں بنانے کے لئے خشک کنکری زمین کے مقابلے میں پہاڑی دلدلی گھاٹی پسند کیا کرتا تھا۔

افواج کا ندیاں پار کرنا:

فوج کو ندی پار اتارنے کے لئے کشتیوں کو آپس میں رسیوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ ان میں کاٹ کر درخت، جھاڑیاں اور گھاس پھوس ڈالدی جاتی تھی تاکہ فوج ان پر سے گذر سکے۔ صرف ایک قسم کی فوج اور باربرداری کی گاڑی کو ایک وقت میں ان پر سے ہوکر جانے کی اجازت دی جاتی تھی۔ گھوڑسوار، پیدل، باربرداری کے جانور اور ان کے جھنڈ ایک قطار میں اور علیحدہ علیحدہ اس پار جاتے تھے۔ نگراں عہدہ داروں کے لئے ندی کے قریب ایک چوکی قائم کی جاتی تھی جو پل پر سے جانے والی سواریوں کی نگرانی کرتے تھے۔ ان پلوں سے ہوکر ہاتھیوں کے لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

کالے پرچم: جب عزیز خاں کوکا کو دربار میں طلب کیا گیا اور اُسے بنگال بھیجا گیا

تو اس موقع پر اس کے ساتھ کالے پرچم تھے جو جنگ سے موت تک کے نشان تھے۔" ان جھنڈوں کا استعمال تیمور لنگ جنگ کے موقع پر کیا کرتا تھا۔ وہ شاہ مغلیہ کے جدامجد تھے:۔

دربار اور ضابطے

متعمدین دربار کی روئیداد قلم بند کیا کرتے تھے:
روزانہ کی روئیداد قلم بند کرنے کے لئے اکبر نے چار، پانچ سیکریٹری مقرر کئے تھے جو کام وہاں ہوتا تھا' اقدام اٹھائے جاتے تھے اور احکامات جاری ہوتے تھے وہ، وہ لوگ ان سب باتوں کو قلم بند کر لیتے تھے:" مونسریٹ نے لکھا ہے۔ مزید برآں اس نے لکھا ہے کہ وہ لوگ بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے اس کے الفاظ لکھ لیتے تھے اور اس کے حکم کا کوئی لفظ نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ محافظ دستے دن رات اپنے فرائض انجام دیتے تھے اور بادشاہ کی طرف سے انہیں راشن دیا جاتا تھا۔

نوروز کا جشن، مارچ ۱۵۸۲ء:

مونسریٹ نے اس جشن کو" نودنوں کے جشن" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس موقع پر محل کی دیواروں اور دالانوں کو بالخصوص سنہری اور ریشمی پردوں سے سجایا جاتا تھا۔ کھیلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا اور روزانہ کھیل تماشے ہوتے تھے۔ اکبر بذات خود سنہری تخت پر جلوہ افروز ہوتا اور اپنا تاج اور شاہی تمغے پہنتا تھا۔ اپنے سرداروں کو انعامات تقسیم کرتا تھا۔ احکامات جاری ہوتے تھے۔ وہ ان سب لوگوں کو خوش آمدید کہتا تھا۔ جو اس جشن کو دیکھنے آتے تھے۔ اس خاص موقع پر رقاصاؤں کی ایک جماعت رقص کے ذریعہ بادشاہ کو محظوظ کیا کرتی تھی۔ عورتوں کو محل میں آنے اور وہاں کے شاندار لوازمات اور سازوسامان دیکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔

سرکاری خزانہ میں تبادلۂ زر: شاہی خزانوں کے ناظرین اور" زرشمار کنندہ"

کے علاوہ ملک میں تبادلۂ زر کرنے والوں اور ساہوکاروں کو لین دین کا کاروبار کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ صرف سرکاری خزانوں میں ہی سونے کے سکوں کو چاندی اور تانبے کے سکوں میں بدلا جا سکتا تھا۔ ان کے منصب کے مطابق سرکاری ملازمین کو سونے، چاندی اور تانبے کے سکوں میں ان کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔ اگر انھیں ان کے علاوہ دوسرے سکوں کی ضرورت ہوتی تو انھیں وہ سکے صرف شاہی خزانوں سے مل سکتے تھے اس کاروبار سے سرکار کو بہت منافع ہوتا تھا۔

حکومت کی اجازت کے بنا گھوڑوں کی خرید فروخت پر پابندی:

ایک قانون کے ذریعہ حکومت نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بادشاہ یا اس کے کارندوں کی اجازت کے بنا کوئی شخص گھوڑے فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ بالعموم گھوڑے نیلام کئے جاتے تھے اور تمام اچھے گھوڑے بادشاہ خود خرید لیتا تھا۔ قیمت کی عدم ادائیگی کے بارے میں شبہ کو رفع کرنے کے لئے عوام کے سامنے روپے گنے جاتے تھے۔ فروخت کنندہ کو اسی جگہ گھوڑوں کی قیمت طلائی سکوں میں ادا کر دی جاتی تھی۔

عدل وانصاف:-

قانون شکنی کے معاملوں میں اکبر بڑی سختی سے کام لیتا تھا۔ اور ہر ایک فرد اس کی سختی کیوجہ سے خوف زدہ رہتا تھا۔ تمام سنگین اور مالی مقدموں کی وہ بذات خود سماعت کیا کرتا تھا۔ "لہذا جن مقدموں کا وہ بذات خود منصف ہوتا ہے تو اس کے حکم کے مطابق ملزموں کو اس وقت تک سزا نہیں دیجاتی ہے جبتک کہ وہ تیسری مرتبہ سزا دینے کا حکم صادر نہیں کرتا ہے۔"

سزائیں:

جو لوگ فوجداری یا سنگین جرموں کا ارتکاب کرتے تھے انھیں یا تو ہاتھیوں کے پیروں کے نیچے کچل دیا جاتا تھا یا ان کے جسم میں میخیں ٹھکوا کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ یا

انھیں پھانسی دیدی جاتی تھی۔ عورتوں کو اغوا کرنے والوں یا زانیوں کو
دیا جاتا تھا یا انھیں سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا یا انھیں چمڑے کے کوڑوں سے پٹوایا جاتا
تھا۔ کسی قسم کا اہری دباؤ زانیوں کو نہیں بچا سکتا تھا۔ معمولی مجرموں کو زیر نگرانی رکھا جاتا
تھا لیکن قید میں نہیں ڈالا جاتا تھا۔ شہزادوں کو سزا دے کر گوالیار بھیج دیا جاتا تھا۔
امیروں کے طبقے کے مجرموں کو سزا دینے کے لئے انھیں امیروں کے ہی حوالے کر دیا جاتا
تھا۔ ارزال طبقے کے لوگوں کو یا تو فوجی مراسلے لے جانے والے سوار کے نگراں یا جلاد کے
حوالے کر دیا جاتا تھا۔

سزائیں اور آلات:

سزائیں دینے کے آلات یہ تھے۔ چمڑے کے کوڑے، کمانوں کی تانت جس میں تانبے
کی نوکیلی میخیں جڑی ہوئی تھیں، سر کچلنے یا جسم کے عضوؤں کو چور چور کرنے کے لئے
لکڑی کا ایک چکنا لٹھا، کوڑے، ایسی چھوٹی گیندیں جن میں کانسے کے تیز کانٹے جڑے ہوتے
تھے، زنجیریں، بیڑیاں، ہتھکڑیاں وغیرہ۔ عوام کو دکھانے کے لئے ان آلات کو محل کے
دروازے پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ ان کی نگرانی جلاد کیا کرتا تھا۔

پانی کی گھڑیاں اور گھڑیال:

اس کام کے لئے اردلی مقرر کئے جاتے تھے۔ کانسے کے گھڑیالوں کو بجا کر دن یا رات
کے گھنٹوں کے گذرنے کا اعلان کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ پانی کی گھڑی کی مدد سے وقت کا اندازہ
لگاتے تھے۔ مونسریٹ نے لکھا ہے "پانی کی گھڑیاں ایک کانسے کے برتن کی ہوتی ہیں جن میں
پانی بھر دیا جاتا ہے۔ ایسی جسامت کا ایک مخروطی خول ہوتا ہے۔ اس کی تہ میں ایک چھوٹا سا
سوراخ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ پانی بھرنے میں ۱۵ منٹ لگتے ہیں۔ اس خول کا پانی اس رفتار
سے ٹپکتا ہے کہ اس برتن کے بھرنے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ پانی سے بھرے اس کانسے کے
مخروطی خول کو اس برتن کے اوپری سرے پر رکھ دیا جاتا ہے اور وہ پانی اس میں سے ہو کر
بہہ کر اس کی تہ میں چلا جاتا ہے۔ جب وہ مخروطی خول پوری طرح بھر جاتا ہے تو وہ پانی بیٹھنے لگتا

ہے اور اس طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ پندرہ منٹ گذر گئے ہیں۔

ہرکارے :

سرکاری مراسلات ہرکارے لے جایا کرتے تھے۔ وہ ایک دن میں دوڑ کر اتنا فاصلہ طے کر لیتے تھے جتنا فاصلہ پوری رفتار سے دوڑ کر ایک گھوڑے طے کر سکتا تھا۔ سیسے کے بنے جوتے پہن کر وہ دوڑتے تھے یا وہ اپنے قدموں یا پیروں کو بار بار جلا کر ایسے دوڑتے تھے کہ وہ ان کے لوہے چھوڑنے لگتے تھے۔

(۳) عوام

بالعموم لوگ مسلح رہتے تھے :

جیسا کہ مصنف کے بیان سے واضح ہوتا ہے ہندوستان کے لوگ پوری طرح مسلح رہا کرتے تھے کیونکہ انگریزی سفارت کے لوگ جب فتح پور پہونچے تو وہاں کے لوگ انھیں حیرت سے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے کہ "یہ غیر مسلح اجنبی لوگ کون ہو سکتے ہیں"۔

گھکڑ لوگ :

وہ لوگ مسلمان تھے اور اپنی عادتوں اور طور طریقوں کے لحاظ سے بدنام تھے۔ وہ لوگ راستوں میں آنے جانے والے مسافروں کی گھات میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی شخص ان کے ہاتھ لگ جاتا تھا تو وہ اسے پکڑ لیتے تھے۔ اس کا سر مونڈ دیتے تھے، اسے لولا کر دیتے تھے اور ایران لے جا کر ایک غلام کی حیثیت سے اسے فروخت کر دیتے تھے۔ بال منڈولتے وقت اگر اس قبیلے کا کوئی دوسرا فرد وہاں آجاتا تو اسے بھی مال غنیمہ میں حصہ دار بنا لیتے تھے۔

جلال آباد کے باشندے :

مغل لوگ انھیں افغان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ ان کے ملک میں باربرداری کے جانوروں اور کشتیوں کی کمی تھی، خشکی میں وہ لوگ [illegible]

بذات خود اٹھا کر لے جاتے تھے۔ رسیوں کے پھندوں میں باندھ کر وہ لوگ اس سامان کو اپنی پیٹھ پر لاد لیتے تھے۔ اپنی باہوں میں ان رسیوں کو اس طرح ڈال لیتے تھے جیسے کہ چار آئینہ پہنا جاتا ہے؛ وہ لوگ سیدھے چلتے تھے حالانکہ ان پر وہ بھاری بوجھ لدا ہوتا تھا۔ بیلوں کی ایسی کھالوں کے ذریعہ جن میں چکنائی یا روغن لگا ہوتا تھا، وہ اپنا سامان ندی کے پار اتارتے تھے۔ غلہ یا سبزیوں کو ان کھالوں میں بھر کر اور ندی کے بہاؤ کی سمت اچھی طرح تیر کر وہ اس سامان کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ وہ تنگ لباس پہنا کرتے تھے جو ٹخنوں تک لٹکا ہوتا تھا۔ انھیں گانے سے بڑی دلچسپی تھی اور بانسریا کے ذریعہ دل آویز گیت گایا کرتے تھے۔

سورت کے پارسی باشندے: وہ لوگ سفید رنگ کے کپڑے زیب تن کیا کرتے تھے اور دماغی اور جسمانی خصائص کے لحاظ سے بظاہر وہ یہودیوں کے مشابہ تھے۔ وہ لوگ بہت جفاکش تھے۔ وہ ختنہ کرواتے تھے۔ ان کی پوشاک سوتی، سنئی یا ململ کے کپڑے کا بنا ہوتا تھا اور جانگھوں تک لٹکا ہوتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں کو آپس میں ملا دیا جاتا تھا اور سروں کو ملا کر سی دئے جاتے تھے۔ اس پوشاک سے سر ڈھک جاتا تھا اور اس کے کناروں کو ملا کر چھاتی پر باندھ دیا جاتا تھا۔ تقریباً ایک چار انچ چوکور جگہ چھوڑ دی جاتی تھی۔ ان کے قانون کے مطابق اس خالی جگہ میں کسی چیز کا رکھنا ممنوع تھا۔ وہ لوگ اپنے لباسوں کے چاروں طرف اون کی بنی ایک ڈوری کس لیتے تھے۔ وہ ڈوری اتنی لمبی ہوتی تھی کہ کمر میں کئی مرتبہ لپیٹ لی جاتی تھی۔

ان کی خوراک دودھ، گھی، روغن، سبزی، دال اور پھل وغیرہ پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ شراب نہیں پیتے تھے۔

اپنے تہواروں کے دنوں میں وہ لوگ صبح سویرے بلند آواز سے عبادت کیا کرتے تھے ان کا اپنا مذہبی صحیفہ تھا۔

قسم کھانے کے ان کے طریقے کا مونسریٹ ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"اگر انھیں قسم کھا کر کسی بیان کی تصدیق کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا تو وہ جلتے

ہوئے لکڑی کے انگاروں پر پیشاب کرتے ہیں جسے وہ لوگ قسم کھانے کا متبرک طریقہ سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اس بات سے انکار کرتے تھے تو "ان کی حلف کا یقین نہیں کیا جاتا تھا"

اپنی مرضی کے مطابق وہ لوگ اپنی بیبیوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ "وہ لوگ بدچلن عورتوں کی ناک کاٹ لیا کرتے تھے اور انہیں طوائف کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔

اگر وہ لوگ کسی نعش کو چھو لیتے تھے تو وہ خود کو ناپاک سمجھنے لگتے تھے۔ اپنے مردوں کو وہ لوگ اپنے کندھوں پر نہیں لے جاتے تھے بلکہ ان کے پیروں کو ملا کر باندھ دیتے اور نعش کو زمین پر چت لٹا کر گھسیٹ کر لے جاتے۔ اپنے مردوں کو نہ تو وہ دفن کرتے اور نہ ہی جلاتے، بلکہ ایک چار دیواری کے اندر رکھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ گھر میں جو پانی باقی رہ جاتا اُسے وہ بہا دیتے تھے۔ متوفی کی چھوڑی ہوئی کسی چیز کو خاندان کے کسی فرد کو استعمال کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔

اگر ان پر کوئی آفت ٹوٹ پڑتی تو وہ ہیبت انگیز طریقے سے خودکشی کر لیا کرتے تھے۔

مذہبی عقائد اور توہمات

شیخ کپور کا سلسلہ:

فادر مونسریٹ نے شیخ کو "عیش پرستوں کے سربراہ" اور ملعون ایک شخص" کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ گوالیار میں واقع ایک مشہور فقیر کے مزار کو دیکھنے گیا تھا جہاں اس نے دیکھا کہ اس کے تیس پیرو اس مزار کی نگرانی کرتے تھے۔" وہ لوگ پیاز، لہسن، یا اسی طرح کی کوئی دوسری چیز نہیں کھاتے تھے۔ اور یہاں تک کہ وہ لوگ پھلوں سے بھی پرہیز کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ وہ ایسا کوئی تیل نہ کھائیں جو افیون کھانے یا بھنگ پینے کے بعد ضرر رساں ثابت ہو۔ وہ لوگ صرف دال اور میٹھی چیزیں کھاتے ہیں۔

بذاتِ خود بادشاہ اور اس کے بہت سے امیروں کا اس کے پیروؤں میں شمار ہوتا تھا۔

متھرا کی ایک زیارتگاہ اور نہانے کی رسم؛

وہاں کے بہت سے مندروں میں سے مسلمانوں نے صرف ایک مندر باقی چھوڑا ہے۔ یہ جمنا ندی کے کنارے پر واقع تھا۔ اپنے دیوتا کی پوجا کرنے کے لئے وہاں بڑی تعداد میں زائرین جمع ہوا کرتے تھے۔ ان زائرین کو اس وقت تک مندر میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا" جب تک مرد اپنی داڑھیاں اور سر کے بال اور عورتیں اپنے سر کے بال اور بھنویں نہ منڈوالیں۔ حجام زائرین کے بال بڑی تیزی سے مونڈتے تھے۔ زائرین ندی میں کمر تک پانی میں جاکر کھڑے ہوجاتے تھے۔ مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ نہاتے تھے لیکن اس موقع پر حیا و شرم کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا"

متھرا کے نزدیک بندر؛

متھرا سے چھ کوس کی دوری پر واقع ایک زیارتگاہ کے بندروں کے ڈسیپلن کا مونسریٹ نے ذکر کیا ہے۔ ایک گھنٹے کے بجنے کی آواز سنکر وہ بندر اسلحات اٹھالیا کرتے تھے اور دو جماعتوں میں منقسم ہو کر آپس میں لڑنے لگتے تھے اور ایک جنگ کا منظر پیش کیا کرتے تھے۔ دوبارہ جب وہ گھنٹا بجتا تو وہ اپنے ہتھیاروں کو رکھ دیتے

[illegible] کا سلسلہ:

[illegible] میں پایا جاتا تھا۔ اس سلسلے [illegible]

[illegible] وار کو ایک مخصوص قسم کے [illegible]

[illegible] خدمت کرنی پڑتی تھی۔ جیسے [illegible]

پیروں تک لٹکا ہوتا تھا اور اس کا رنگ گیروا ہوتا تھا، عطا کیا جاتا تھا۔ امیدواروں کو اس بات کا وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ خود کو پاک صاف رکھیں گے۔ اور پرہیزگاری پر عمل کریں گے۔ ان سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ اس سلسلے کے قواعد کی خلاف ورزی نہ کریں گے اگر ان سے کوئی "غیر مناسب حرکت سرزد ہو جاتی تھی تو انھیں برطرف کر دیا جاتا تھا۔ انھیں اس بات کی اجازت نہ دی جاتی تھی کہ وہ جہاں چاہیں جائیں اور گداگری کی زندگی بسر کریں۔

ان کے سربراہ کا انتخاب ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی مقام پر رہتا تھا۔ اس کی مدد کے لئے معمر لوگوں پر مشتمل ایک مجلس مشاورت ہوتی تھی جو موجودہ سربراہ کے انتقال پر دوسرے سربراہ کا انتخاب کرتی تھی۔ ایک سربراہ کے مرتبے کی نشاندہی اس فیتے سے ہوتی تھی جس میں ڈھیلے ریشمی تسمے لٹکے ہوتے تھے۔

صبح سویرے مشرق کی طرف رخ کر کے بانسریوں اور سنکھ کو بجا کر سورج کے نکلنے کا وہ آگ خیر مقدم کرتے تھے اور شام کے وقت یہی عمل وہ لوگ مغرب کی طرف منہ کر کے کیا کرتے تھے۔ جب وہ کھانا کھا چکتے تھے تو خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ اشیائے خوردنی اور لوگوں سے ملنے جلنے کے بارے میں ان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جاتی تھی۔ ان میں دو گروہ تھے ایک شادی شدہ اور دوسرا غیر شادی شدہ۔ ان کی زیارت گاہ کے چاروں طرف دو تین غاروں میں ننگے بہت سے سادھو پائے جاتے تھے۔

اکبر کو اس مقام پر لے جایا گیا تھا جہاں بال ناتھ رہتا تھا "ننگے پیر اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ وہاں جا کر اس نے اس مقام کو عزت بخشی۔

رسم ستی:

رسم ستی کے بارے میں مونسریٹ نے بعض دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ ستی ہونے والی عورتوں کو منشیات کے ذریعہ کم و بیش بے ہوش کر دیا جاتا تھا تاکہ انھیں تکلیف محسوس نہ ہو۔ بعض مرتبہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تیزی سے یہ اعلان کرتے ہوئے، منتر پڑھتے ہوئے اور وعدے کرتے ہوئے، انھیں چتا کے لئے لے جایا جاتا تھا۔ اگر ستی ہونے والی خواتین

پس و پیش کریں تو انھیں زبردستی آگ میں جھونک دیا جاتا تھا اور اگر وہ باہر نکلنے کی کوشش کرتیں تو ڈنڈوں اور بھالوں کے ذریعہ انھیں روکا جاتا اور باہر نہ نکلنے دیتے تھے۔

آخری روانگی:

اجین میں مونسریٹ نے ایسے ایک بوڑھے ہندو کی ارتھی کا منظر دیکھا تھا جس کا وہ لوگ احترام کرتے تھے۔ اس کی ارتھی پر جاذب نظر رنگ سازی اور ملمع کاری کی گئی تھی اور "اس ارتھی کو اتنے بڑے اہتمام کے ساتھ لے جایا گیا تھا کہ راستے کے ایک ایک تنکے کو صاف کر دیا گیا تھا۔ ارتھی کے چاروں طرف لوبان اور اگربتیاں جل رہی تھیں۔

رتھ سپتمی نامی تہوار:

سورت سے منڈو کے لئے سفر کے دوران مونسریٹ تاپتی ندی کے کنارے ٹھہرا تھا جہاں اسے اس تہوار کے دیکھنے کا موقع ملا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ایک ناریل کا کھوپڑا چھیل کر باہر نکالا گیا اور اس میں تیل بھر دیا گیا۔ اس میں ایک فتیلہ ڈال دیا گیا۔ اور اسے جلا دیا گیا۔ کپڑے اتار کر سر پر چراغ رکھ کر عقیدت مند لوگ ندی میں گھس گئے۔ اس کے بعد وہ پانی میں یہاں تک گھستے گئے کہ وہ چراغ پانی کی سطح پر تیرنے لگے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ" اس تہوار کو ہندو لوگ ستمیا کہتے ہیں کیونکہ یہ تہوار ہندوؤں کی جنتری کے مطابق گیارہویں مہینے میں چاند کی سات تاریخ کو منایا جاتا ہے:

نادوار میں محرم:

مونسریٹ نے اس تہوار کو" ۹ دنوں کے جشن" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس زمانے میں مسلمان اس تہوار کو نو دن منایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہ صرف دال کھا کر گذر کرتے [illegible] ایک پتلا کے اوپر سے وہ مرثیے پڑھا کرتے تھے اور" ان کے الفاظ [illegible] [illegible] کر دیتے تھے کہ وہ رونا دھونا اور ماتم کرنے لگتے

آخری دن تعزیے کھڑے کئے جاتے تھے اور یکے بعد دیگرے انھیں جلا دیا جاتا تھا ان جلتے ہوئے تعزیوں پر لوگ کود پڑتے تھے اور اپنے پیروں سے جلتی ہوئی راکھ کو بکھیر دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر وہ "حسن و حسین" کے نام لے لے کر نعرے لگایا کرتے تھے۔

ناردار میں ہولی کا جشن :

پندرہ دنوں تک آپس میں ایک دوسرے پر دھول ڈالنے کی ہندوؤں کو آزادی ہوتی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں پر کیچڑ پھینکتے تھے اور پچکاریوں سے لال رنگ پھینکا جاتا تھا۔ پندرہویں دن وہ لوگ دیوتا کے نام کا ایک درخت چڑھاتے تھے اور اس کے سامنے چڑھاوے پیش کرتے تھے۔ اپنے گھروں کے سامنے تہواروں میں وہ لوگ لکڑی کے ڈھیر لگاتے تھے اور آدھی رات کے بعد اس کے چاروں طرف رقص کرتے، گانا گاتے اور آخر میں اس مقدس درخت کو جلا کر خاکستر کر دیتے۔

(۵) متفرقات

شہزادہ مراد کی جوانمردی :

جب یہ واقعہ پیش آیا تھا تو اس زمانے میں اس شہزادے کی عمر بارہ برس تھی۔ مونسریٹ کا بیان ہے کہ حکیم (مرزا محمد) کے حامیوں نے اسے اس درجہ پریشان کر رکھا تھا کہ اس کے رفقا اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ جب اس نے انھیں فرار ہوتے دیکھا تو وہ اپنی سواری سے نیچے اتر آیا، ایک بھالا ہاتھ میں لے لیا اور یہ اعلان کیا کہ چاہے دشمن کی ساری فوج اس پر حملہ کرے اور ہتھ گولوں سے اس پر وار کرے، وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ٹس سے مس نہ ہوگا۔ لیکن اگر زندگی نے اس کا ساتھ دیا تو وہ ان لوگوں کو یاد رکھے گا جو اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اپنے غدروں پر ان کے واپس آنے کے لئے یہ اعلان بہت مؤثر ثابت ہوا۔

شاہ منصور کی اصلاحیں :

شاہ منصور نے یہ احکامات جاری کئے تھے کہ تمام عہدہ داروں کو جائزے کے لئے اپنے گھوڑے حاضر کرنے ہوں گے۔ ان کے داغ لگا یا جائے گا۔ اگر وہ گھوڑے مر گئے ہوں تو انکی پونچھیں لائی جائیں۔ نہ تو کسی دوسرے سے عاریتاً گھوڑے لینے یا ان کی بجائے دوسرے گھوڑے رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ بادشاہ کی اجازت کی بنا سارے ملک میں کوئی گھوڑا فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آگ میں جلانے کی سزا :

آگ میں جلا کر سزا دینے کا مطالبہ علمار نے کیا تھا۔ بادشاہ نے اس بات کی سفارش کی تھی لیکن یسوعی پادریوں نے اس کو قبول نہ کیا تھا۔ فادر روڈولپ نے اس کے بارے میں ذیل عذر پیش کئے۔

(الف) وہ اس بات سے خوفزدہ نہیں ہیں لیکن وہ گناہگار ہیں اور وہ یہ بات نہیں جانتے کہ خدا بھی آیا انھیں سدّ راہ سمجھتا ہے۔"

(ب) یہ کہ وہ عیسیٰ مسیح کے پیرو ہیں اور چونکہ انہوں نے کسی معجزہ کے دکھانے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا وہ لوگ اس طرح کی سزا سے انکار کرتے ہیں۔

(د) یہ کہ آگ سے مسجدیں جلائی گئیں اور ان کے ساتھ ساتھ مذہبی صحیفے بھی۔ اس لئے" آگ سے کسی بات کا ثابت ہونا مشکوک اور مشتبہ ہے۔"

(س) یہ کہ اسپولیٹینس کی نظیر ان کے سامنے تھی اور انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ اگر وہ اس سے محفوظ بچ نکلے تو وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ بہر حال اکبر نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ وہ اس سزا کے نتائج کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

خشخاش :

خشخاش کے تیار کرنے کا اس مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے۔" پھلیوں سے پہلے

ان کا رس نچوڑ لیا جاتا تھا پھر انھیں اس کام کے لئے الگ الگ بکھیر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد انھیں پکنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد بیجوں کو نکال لیا جاتا تھا اور چھلیوں کو پانی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس وقت تک انھیں پانی میں ڈوبا رہنے دیا جاتا تھا جب تک وہ اس شراب کا رنگ اختیار نہ کر لیتا۔ تھوڑی زیادہ مدت کے لئے اس پانی کو وہاں پڑا رہنے دیا جاتا اور اس کے بعد سنی کی بنی عمدہ چھلنی سے اُسے چھان کر دوسرے برتن میں کر دیا جاتا تھا۔"

فیروز شاہ کی مسجد :

مونسریٹ کا بیان ہے کہ پانی کے بجائے چونے میں دودھ ملا کر فیروز شاہ کی مسجد بنائی گئی تھی۔" یہ شیشے کی طرح چمکدار ہے کیوں کہ دودھ اور چونے کا یہ ملمع نہ صرف حیرت انگیز طریقے پر اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اس میں کسی جگہ پر بھی دراریں نہیں پڑتیں بلکہ یہ بھی ہے کہ جب اسے پتائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ بڑے شاندار پیرائے میں دکھتی ہے۔"

ختم شد

برہان

شمارہ ۲	اگست ۱۹۹۳ء مطابق ربیع الاول ۱۴۱۴ھ	جلد ۱۱۲

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خوجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

لیجئے صاحب! اب مطلع صاف ہوگیا ہے۔ بادل چھٹ گئے ہیں اور امریکہ کا چہرہ بالکل آسانی کے ساتھ سب کے سامنے بے نقاب ہوگیا ہے ــــ سوویت روس کی متحدہ ریاستوں کے بکھراؤ کے بعد دنیا میں دو ہی مدمقابل رہ گئے ہیں، عیسائیت اور اسلام۔

اس سے پہلے ان دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان میں ایک تیسری طاقت کے روپ میں کمیونزم ابھرا تھا، اور اس کی حقیقت سے خالی لیکن چکاچوند دکھائی دینے والی بعض اقتصادی اصلاحات نے پورے عالم میں تہلکہ مچادیا تھا، اور امیری و غریبی کے ماحول میں کمیونزم کی مقبولیت نے سوشلزم کی پالیسیوں پر کار بند رہنے والے ممالک میں کھلبلی مچادی تھی۔ جس کی وجہ سے ان ممالک نے کمیونزم کے خلاف ایک مشترکہ محاذ کھول دیا تھا متواتر اس کی برائیوں کی طرف عوام الناس کی توجہ مبذول کرائی جاتی رہی۔ اور دوسرے ذرائع سے کمیونزم پر وار کئے جاتے رہے۔ بالآخر کمیونزم مخالف محاذ کو کامیابی نصیب ہوئی اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جو کمیونزم پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے کمربستہ ہوکر میدان میں نکلا تھا وہ بیسویں صدی کے آخری دہے میں زمین دوز ہوگیا اور پھر ایسی صورت پیدا ہوئی کہ خود سوویت روس میں کمیونزم قابلِ نفرت چیز سمجھی جانے لگی۔
اس صورت حال سے پوری بنی نوع انسانیت کو راحت واطمینان نصیب ہوا کیونکہ کمیونزم میں مذہبی تصور کو افیون کی نشے سے تعبیر کیا گیا تھا اور اس نے تمام مذاہب کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہوئے کمیونزم میں ہی بنی نوع انسانی کی فلاح و ترقی کا حصول سمجھایا گیا تھا جو آخر میں سراسر غلط ثابت ہوا۔ اور دنیا نے محسوس کیا کہ کوئی بھی انسانی ترقی مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے بغیر ناممکن ہے۔ چنانچہ جس ملک میں خدا کا تصور خلاف قانون تھا اس ملک میں روزی وروٹی کے لئے گڑگڑا کر عجز و انکساری کے ساتھ خدا کو یاد کیا گیا ــــ کمیونزم کے

بنی نوع انسانی کے خلاف خطرناک عزائم کو بے نقاب کرنے کے لئے ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے اپنے طریقے پر مہم چلائی اور اسی مہم کی وجہ سے کمیونزم دنیا سے رفع دفع ہوا۔ اور مذاہب کے ماننے والوں نے چین وسکھ کی سانس لی ـــ مگر اس موقع پر عالم انسانیت کی بہتر سے بہتر طریقہ پر خدمت کرنیکے منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لئے انسانیت کے بہی خواہوں کو آگے آنا چاہیئے تھا کہ امریکہ نے اسے عالم انسانیت کے مفاد سے روگردانی کرتے ہوئے اپنے ہی مفاد میں لینا شروع کر دیا ہے۔ اور اب وہ تیزی سے تمام انسانی حقوق کی پامالی کرتے ہوئے اسی تاناشاہی کے ساتھ اپنے مخالف ممالک کے خلاف سرگرم ہے جس تاناشاہی کے ساتھ کمیونزم کے نام لیواؤں نے بنی نوع انسانی کے خلاف اپنی سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ امریکہ جو عیسائی مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت کا ملک ہے اپنے اکثریتی باشندوں کے مذہب عیسائیت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی شاطرانہ چالوں سے اپنے بدمقابل مذہب اسلام کا جو اس کے لئے اس کی دانش میں سب سے بڑا خطرہ ہے بیخ کنی کے لئے کمربستہ دکھائی دے رہا ہے۔ عراق پر تازہ حملہ، بوسنیا ہرزیگو نیا میں مقامی باشندوں و فوجیوں کے ذریعہ بے گناہ مسلمانوں پر اندھادھند ظلم وستم قتل وغارتگری، لبنان پر اسرائیل کی زبردست بمباری کے نتیجہ میں ۲ لاکھ سے زیادہ عربوں کی تباہی و بربادی اور ان کے گھر بار سے بے دخلی، لیبیا پر پابندی اور عراق پر مسلسل اقتصادی پابندی یہ سب کیا ہے اسی شیطانیت کا کھیل ہے جس میں انسانیت کے مفاد سے سراسر ان دیکھی کرتے ہوئے ایک ہی ملک کی داداگیری کا سکہ قائم کیا جائے۔

کس کو کیا معلوم تھا کہ کمیونزم کے بکھراؤ کے بعد امریکہ کا دوسرا نشانہ اسلام پسند قوت کو تہس نہس کر کے تمام عالم میں اپنا ہی جھنڈا گاڑنا ہوگا۔

ماہانہ معارف اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۷۴ء کے شذرات کی ابتدا میں مرحوم جناب شاہ معین الدین ندوی رقم طراز ہیں؛

" ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ بڑی خامی ہے کہ وہ وقتی جوش میں آکر ایک مرتبہ بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں مگر کسی معاملہ میں متحد اور منظم ہو کر مسلسل جدو

جہد نہیں کرسکتے حالات کی ناسازگاری نے ان کو اور بھی پست ہمت بنا دیا ہے۔"

مرحوم شاہ معین الدین ندوی صرف ہندوستانی مسلمانوں ہی کی نافہمی کا شکوہ کر رہے ہیں۔ مگر ہم یہاں ۱۹۹۳ء میں پورے عالم کے مسلمانوں کی جذباتیت اور نافہمی کا رونا رونے پر مجبور ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں بھی اور اس سے بھی بہت پہلے تک اور آج بھی یہ صورتحال موجود ہے بلکہ زیادہ ہی زیادہ ترقی پر ہے۔ معلوم نہیں کہ ملّت اسلامیہ کو کب ہوش آئے گا اور وہ کب اس حقیقت کو محسوس کرے گی کہ دوسری اقوام ان کے اختلاف منظم طریقہ سے منصوبوں پہ منصوبے ترتیب دے رہی ہیں تاکہ ان کی داستان بھی نہ رہے داستانوں میں، ان کا چین اور سکھ، روزی روٹی، آرام و راحت سب کچھ چھین لیکر ایسا حال بنا دیا جائے کہ اس حال میں انھیں اپنے مذہب سے کوئی لینا دینا نہ رہے اور نہ ہی کوئی واسطہ و مطلب، فکر روزی میں ہی وہ ہر دم اور ہر حال میں مستغرق رہے۔ کیا ایسی صورتحال کو عالم اسلام کی مقتدر قائد ہستیاں محسوس کریں گی کہ ابھی سے وہ اس زبردست خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے لنگر لنگوٹ کس کر میدانِ عمل میں کود پڑیں۔ آپ تمام عالم کے حالات کا بغور جائزہ لیں، ایران عراق آپس میں لڑ پڑے مرے تباہ ہوئے، پھر عراق اور عرب ممالک لڑے بھڑے، اور تباہ و برباد ہوئے مرے پٹے۔ اسرائیل کے ہاتھوں فلسطینیوں کی، عربوں کی پامالی، بربادی، بوسنیا وہرزیگونیا میں عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو مارا ماری اور ہندوستان میں ایک انتہاپسند تنظیم کے اشتعال انگیزانہ منصوبوں کے تحت بابری مسجد کی شہادت یہ سب کیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے بڑی گہری نظر چاہیئے، بڑا صاف و شفاف دماغ کی ضرورت درکار ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک موقع پر بھارت کے سابق وزیر اعظم جناب چندر شیکھر کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل ہی گیا کہ "مسلم انتہاپسندوں کی سرکوبی کے لئے ہندو انتہاپسندوں کی پس پشت امریکہ کی منشا و رضا صاف دکھائی دیتی ہے"۔ اس ایک جملہ میں سب ہی کچھ تو اشارہ و کنایہ سے کہہ دیا گیا ہے۔ اب امریکہ کی ساری کارروائی اسلام پسند قوتوں کے استحصال کی طرف ہی مرکوز ہوگی، کیا عالم اسلام کے قائدین اس واقعی زبردست خطرہ سے آگاہ و خبردار ہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو تب تو راحت و اطمینان کی بات ہے اور اگر اس کا جواب

نفی میں ہے اور ملت اسلامیہ کے قائدین اسی طرح غافل ہیں جسطرح اس سے پہلے ہندوستان سے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلم مخالف لہر کی کامیابی، یا ترکی سے ایکدم منصب خلافت کو ختم کر دینا۔ یا فلسطینیوں کو اجاڑ کر اس پر ہر طرح سے ناجائز اسرائیل نام کی یہودی سلطنت قائم کر دینے کے وقت غافل ولاپرواہ تھے۔ آنے والے وقت میں مسلمانوں کے لئے انتہائی مشکل حالات ہیں۔ جس کے بُرے نتائج سے ملت اسلامیہ مدتوں روتی چیختی، چلاتی اور سر پٹختی رہے گی۔ کیا ہی اچھا ہو ابھی سے اس کے تدارک کے لئے ہم سب ملکر کوئی لائحہ عمل بنالیں تو تمام عالم اسلام کی بہتری و فلاح کے لئے یہ ایک نیک فعال اقدام ثابت ہوگا انشاء اللہ۔

مقام شکر ہے کہ عرب لیگ نے اس خطرہ کو کسی قدر محسوس کیا ہے۔ قاہرہ میں ۲۹ جولائی ۱۹۹۳ء عرب لیگ کی ہنگامی میٹنگ میں مشترکہ طور پر امریکہ کو متنبہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر امریکی شیطان نے اسرائیل کی لبنان کے علاقوں پر بمباری کی حمایت جاری رکھی تو ہم کئی امریکی ٹھکانوں پر حملہ کریں گے۔ دوسری طرف قاہرہ کے ممتاز شہری اور اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری بطرس غالی نے اسرائیل کی لبنان کے شہریوں پر اندھادھند بمباری کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی ہے۔ ہم یہاں صرف اتنا ہی کہنا زیادہ مناسب سمجھیں گے کہ عرب لیگ اصل خطرہ کو سمجھتے ہوئے امریکی ٹھکانوں پر بمباری کرنے سے مسئلہ کو حل نہ سمجھے بلکہ اس صورتحال کا خاتمہ کرنے کی طرف زیادہ دھیان مرکوز کرے جس سے اسلام پسند قوتوں کا استحصال ہو رہا ہے اس پیمانۂ انصاف کا خاتمہ کرے جس میں طاقتور کی کارروائی پرستائش وسراہنا کی جائے اور کمزور کے ساتھ ظلم وستم کو جائز قرار دیا جائے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی روایت آج کے دور میں جس تیزی کے ساتھ دیکھنے کو مل رہی ہے اس سے پہلے ایسی اندھیر نگری کو شرمساری کے احساس کے ساتھ ہی دیکھنے کو ملتی تھی۔ آج یہ شرم بھی ختم ہو چکی ہے پوری ڈھٹائی کے ساتھ کمزوروں کے ساتھ ناانصافی کا کھیل کھیلا جارہا ہے اس سے بڑھکر بیسویں صدی کا المیہ اور کیا ہوگا۔ ہندوستان بھی اس ناانصافی کے کھیل کی زد میں ہے ابھی حال ہی میں روس کے ساتھ سائنسی ٹکنالوجی کے معاہدہ کو امریکی دباؤ سے منسوخ کیا گیا

ہے وہ بھی امریکی تاناشاہی اور دادا گیری کا جیتا جاگتا نمونہ ہے ــــ وہ ممالک بھی جو انصاف اور انسانیت کے زیر سائے جینا چاہتے ہیں انھیں امریکی شیطانیت کا مقابلہ کرنا ہی چاہیئے۔ اسلام دشمنی میں کہیں وہ اپنے ملکی مفاد ہی کو نہ کھو بیٹھے لسے بہر حال انہیں سمجھنا کی ضرورت ہے کہ امریکی اور اس کے حلیف ملکوں کی ناانصافی پر مبنی کارروائی کا تمام انصاف پسند ممالک اور اس کے باشندے ڈٹ کر مقابلہ کریں ــــ اسی میں بنی نوع انسانی کی صحیح معنوں میں بہتری ہے۔

قراء سبعہ اور انکے علمی و دینی کارنامے

(از محمد الیاس الاعظمی، ایم اے)

قراء سبعہ یہ ہیں:-

۱۔	امام نافع مدنیؒ	ولادت	سنہ؟	وفات	۱۶۹ھ
۲۔	امام ابن کثیر مکیؒ	"	۴۵ھ	"	۱۲۰ھ
۳۔	امام ابو عمرو بصریؒ	"	۶۸ھ	"	۱۵۴ھ
۴۔	امام ابن عامر شامیؒ	"	۲۱ھ	"	۱۱۸ھ
۵۔	امام عاصم کوفیؒ	"	نامعلوم	"	۱۲۷ھ
۶۔	امام حمزہ الزیات کوفیؒ	"	۸۰ھ	"	۱۴۸ھ
۷۔	امام ابوالحسن کسائیؒ	"	۱۱۹ھ	"	۱۸۹ھ

ان کی قراتوں کو قرأت سبعہ اور ان کو قراء سبعہ کہا جاتا ہے ان میں بعض تابعی اور بعض تبع تابعی ہیں۔ ان کا کل زمانہ ۲۱ھ سے شروع ہو کر ۱۸۹ھ تک ختم ہو جاتا ہے۔ مذکورہ بالا ترتیب علامہ ابن مجاہد متوفی ۳۲۴ھ کی ہے۔ جو تیسری صدی ہجری کے اوائل میں عمل میں آئی۔ اگرچہ موصوف کی ترتیب سے پہلے قراء سبعہ مشہور ہو چکے تھے۔ ابن مجاہد نے ترتیب میں کسی کو پہلے اور کسی کو بعد میں ذکر کیا اور یعقوب حضرمی کو خارج کر دیا اس ترتیب کی کوئی اہمیت نہیں جسکو چاہیں پہلے کر دیں اور جسکو چاہیں بعد میں۔ البتہ اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ قرأت قرآن میں کسی ایک ترتیب پر عمل ضروری ہے چونکہ تیسری صدی ہجری سے آج تک ابن مجاہد کی ترتیب پر سب کا عمل رہا ہے اس لئے میں اسی کی اقتدار کرتا ہوں اور سلف کے طریقوں کو اچھا اور بہتر تصور کرتا ہوں۔

قرأت سبعہ سے متعلق ہم یہاں بحث نہیں کریں گے کہ یہ موضوع سے خارج ہے البتہ ایک ضروری بات یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں قرأتوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی لیکن جب قرأتوں میں اختلاف پلئے گئے اور لوگ ایک دوسرے کی قرأتوں پر ناواقفیت کی بنا پر طعن و تشنیع اور نکتہ چینی کرنے لگے اور اپنی قرأت کو صحیح اور دوسروں کی قرأت کو غلط قرار دینے لگے تو آپس میں چشمک بڑھی اور جب معاملہ بہت سنگین ہوگیا تو امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کیطرف توجہ کی اور معاملہ کو حل کیا۔ مصاحف لکھوائے انھیں صدر مقامات میں تقسیم کروائے اور حکم دیا کہ انھیں کے مطابق قرآن کی تعلیم دی جائے اور بقیہ نسخوں کو نذر آتش کر دیا جائے چنانچہ اس پر سختی سے عمل ہوا اور تمام قرأتوں کو مدنظر رکھکر یہ اصول بنایا گیا کہ اگر کوئی قرأت ان اصولوں کے خلاف پائی جائے تو وہ غلط قرار دیدی جائے۔ وہ اصول یہ ہیں۔

(۱) مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی زبان و قواعد کے مطابق ہو۔

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو اور ائمہ قرأت میں مشہور ہو۔

ان اصولوں کو سامنے رکھکر جب چھان بین ہوئی تو یہ سات قرأتیں متواتر اور صحیح ثابت ہوئیں۔ چونکہ ان قرأتوں میں بعض لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا اس لئے یہ قرأتیں ان ہی کے ناموں سے منسوب ہوگئیں۔ ان پر جمہور کا اجماع ہے۔ ان سات قرأتوں کے علاوہ تین قرأتیں اور ہیں جو ابو جعفر یزید بن قعقاع مدنی، یعقوب بن اسحاق حضرمی اور خلف بن ہشام بزاز کی طرف منسوب ہیں۔ ان کے تواتر میں کسی قدر اختلاف ہے اس کے علاوہ چار قرأتیں اور ہیں جو ابن محیصین مکی، یحییٰ بن مبارک یزیدی حسن بصری اور اعمش سلیمان بن مہران کے ناموں سے منسوب ہیں انھیں علماء نے شاذ قرار دیا ہے۔

اس بیان سے یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ:

ان ھذا القرآن انزل علیٰ سبعۃ احرف فاقرءُ ما تیسر منہ۔ (صحیح بخاری شریف)

یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا پس ان میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اس طریقہ پر پڑھو۔

زمانہ میں سب سے اہم کام درس و تدریس ہی کا تھا۔ چنانچہ تمام اہل علم
مشغلہ درس و تدریس ہی نظر آتا ہے۔

امام مدنی کی علمی زندگی درس و تدریس سے ہی عبارت ہے ان کے درس کی وسعت
ہمہ گیری کا عالم یہ تھا کہ طلبہ کا ایک ہجوم ان کے پاس حصول علم کے لئے ہر وقت جمع رہتا
تھا کسی بھی طالبعلم کو تیس آیتوں سے زیادہ پڑھنے کا موقع نہیں ملتا تھا خود امام موصوف
ستر تابعین کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی تھی۔ ان باتوں سے یہ اندازہ بھی لگایا جا
سکتا ہے کہ اس دور میں مدرسوں کی علمی و تعلیمی کس درجہ وسعت اور ہمہ گیری رکھتی تھی
... کا بیان ہے کہ :

"كان من القراء الفقهاء العباد" وہ قرار، فقہا اور عبادت گزاروں میں تھے۔

امام صاحب کا شمار قراء سبعہ میں سب سے پہلے کیا جاتا ہے یہ ان کے قرأت قرآن کی
... کا شاہد ہے، اپنے شیخ ابو جعفر یزید بن القعقاع مدنی کی وفات کے بعد مدینہ منورہ
... بالاتفاق امام القراء تسلیم کئے گئے حدیث میں بھی درک و بصیرت رکھتے تھے۔ اور ائمہ
... سے سو حدیثوں کا سماع کیا تھا علامہ ابن حجر مکی کا بیان ہے کہ :۔

" میں ان کی مرویات میں کوئی منکر بات نہیں دیکھتا اور میرا خیال ہے ان کے قبول کرنے
میں کوئی حرج نہیں "

امام مدنی کو خدمت قرآن کی برکت سے ایک قسم کی کرامت عطا کی گئی تھی جب تلاوت
قرآن کرتے یا کسی سے ہم کلام ہوتے تو منہ سے مشک کی سی خوشبو آتی تھی لوگوں نے دریافت
کیا کہ کیا آپ ہمیشہ خوشبو استعمال کرتے ہیں تو انہوں نے فرمایا نہ میں خوشبو استعمال کرتا ہوں
اور نہ اس کے قریب جاتا ہوں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم
رؤیا میں زیارت نصیب ہوئی اور میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے منہ سے
اپنا منہ مبارک ملا کر قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے ہیں پھر جب میں بیدار ہوا تو میرے
منہ سے خوشبو آرہی تھی اسی وقت سے یہ خوشبو میرے منہ سے آرہی ہے امام صاحب
کی وفات کا جب وقت آیا تو صاحب زادوں نے وصیت کی درخواست کی تو فرمایا :۔

"اتقوا اللّٰہ واصلحوا ذات بینکم واطیعوا اللّٰہ ورسولہ ان کنتم مومنین"

تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور اپنے تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

(۲) دوسرے قاری امام ابن کثیر مکیؒ ہیں۔ یہ ۴۵ھ میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ھ میں بزمانہ خلافت ہشام بن عبدالملک مکہ معظمہ میں ہی وفات پائی۔ اصلاً فارسی النسل ہیں، امام مجاہد ابن جبیر مکی، شیخ القراء درباس، امام عکرمہ ابوالزبیر، ابوالمنہال اور حضرت عبداللہ بن السائب مخزومی صحابی رسول سے تحصیل علم کی۔ اور اپنے اندر بڑی جامعیت اور فن میں بڑا کمال پیدا کیا اور لائق تقلید قرار پائے ان کی زندگی کا ماحصل بھی درس و تدریس ہی ہے ان کے درس کا اندازہ ان کے جلیل القدر شاگردوں سے لگایا جا سکتا ہے چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

امام محمد بن ادریس شافعی، امام ابو عمرو بصری، سفیان بن عیینہ، خلیل بن احمد، شبل بن عباد، امام ابن جریج، ابن ابی نجیح، ابن خثیم حماد، اور جریج بن حازم وغیرہ۔

قرأت و حدیث میں آپ کا درجہ و مرتبہ بہت ارفع و بلند ہے۔ سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں عبداللہ ابن کثیر اور حمید بن قیس الاعرج سے بہتر کوئی قاری نہ تھا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

وکان اماماً فی الحدیث — اور وہ (ابن کثیر) حدیث میں امام تھے۔

(۳) تیسرے قاری امام ابو عمرو زبان بصری ہیں۔ ۶۸ھ میں بزمانہ خلافت ہشام بن عبدالملک مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۴ھ میں بزمانہ خلافت منصور عباسی کوفہ میں وفات پائی، قراء سبعہ میں بہت ممتاز ہیں مختلف النوع خصوصیات کے مالک تھے قرأت، نحو، صرف، لغت، انساب، اشعار وغیرہ علوم میں مہارت حاصل تھی اور نہایت عابد و زاہد عادل معتبر اور صادق القول نیز مختلف علوم و فنون میں اپنی نظیر آپ تھے، انہیں گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بصرہ کے امام القراء تسلیم کیے گئے۔ آپ بھی پوری زندگی درس و تدریس میں ہی گزاری اور آپ کے چشم فیض سے لاتعداد لوگوں نے اپنی

علمی تشنگی بجھائی اور قرآنی علوم کے چراغ روشن کئے۔ اپنے زمانہ کے مجتہد اور ائمہ فن سے تحصیل علم کیا۔ جن میں ابوجعفر یزید بن القعقاع مدنی، شیبہ بن نصاح، مجاہد ابن کثیر عکرمہ بن خالد، حمید بن قیس الاعرج، ابن محیصن نصر بن عاصم، سعید ابن جبیر عاصم بن بہدلہ اور حسن بصری وغیرہ جیسے بلند مرتبہ علماء و فقہا اور قراء و محدث شامل تھے۔ آپ کے درس میں طلبہ کا اژدھام رہا کرتا تھا جس کو دیکھ کر آپ کے شیخ خواجہ حسن بصری نے تعجب سے فرمایا علماء ارباب بن گئے ہیں۔ اور بیشک جس عزت کی بنیاد علم پر نہ رکھی جائے اس کا انجام ذلت ہے۔

امام سفیان بن عیینہ کو عالم رؤیا میں ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ تو انہوں نے دریافت کیا کہ اس وقت متعدد قرأتیں رائج ہیں میں کس کی قرأت پڑھوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ ابو عمر بن العائد بصری کی قرأت پڑھو۔

امام اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے ابو عمر واجدی سے ایک ہزار مسائل دریافت کئے تو انہوں نے ہر مسئلے کا جواب جدا جدا اور ممتاز طریقے سے دیا اور ہر مسئلے کے جواب میں دور جاہلیت کے شعراء کے اشعار سے استدلال کیا اور شواہد پیش کئے۔

(۴) چوتھے قاری امام عبداللہ ابن عامر شامی ہیں۔ ۲۱ھ میں موضع جابیہ جو شام کا ایک قریہ ہے پیدا ہوئے۔ اور فتح شام کے بعد دمشق میں مقیم ہو گئے اس وقت آپ کی عمر ۹ سال کی تھی اور ۱۰ محرم الحرام ۱۱۸ھ میں زمانہ خلافت ہشام بن عبدالملک دمشق میں وفات پائی۔
آپ جلیل القدر تابعی ہیں۔ آپ اگرچہ قراء سبعہ میں چوتھے نمبر پر بیان کئے جاتے ہیں اور یہ ترتیب علامہ ابن مجاہد متوفی ۳۲۴ھ کی ہے لیکن باعتبار زمانہ اور شیوخ سب سے مقدم ہیں۔

حضرت عثمان غنیؓ سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی ان کے علاوہ بہت سے صحابہ کی زیارت کی اور قرآن پڑھا ان کے نام یہ ہیں۔ حضرت ابوالدرداء، عویمر بن عامرؓ، ابوالہاشم مغیرہ بن ابی شہاب عبداللہ ابن عمرؓ مغیرہ، فضالہ ابن عبید اوسی، اور واثلہ بن الاسقع لیثی وغیرہ۔

حضرت بلال بن ابی الدرداء کی وفات کے بعد ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں دمشق کے قاضی مقرر ہوئے پھر امام بنائے گئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنی خلافت میں آپکے پیچھے نماز پڑھتے تھے احکام و مسائل میں آپ کی وسعت نظر کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قضاء و امامت کے مناصب جلیلہ پر فائز تھے۔

آپ کی زندگی کا بھی بیشتر حصہ درس و تدریس اور قضا و امامت ہی میں گزرا۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت بڑی ہے بعض تو بہت نامور ثقہ اور معتبر ہیں مثلاً ولید بن عقبہ ولید بن مسلم اور عبدالرزاق الوراق وغیرہ۔

(۵) قاری امام عاصم بن ابی النجود اسدی کوفی، کوفہ کے رہنے والے ہیں جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش معلوم نہیں ۱۲۷ھ میں خلافت مروان کے اخیر زمانہ میں کوفہ یا سماوہ میں انتقال کیا۔

چمنستان علم و فن کو جنت نظیر بنانے میں جن اصحاب کمال بزرگوں نے نمایاں کردار ادا کیا ان میں امام عاصم کا نام سرفہرست ہے ان کا شمار تابعین کے اس طبقہ میں ہوتا ہے جو حضرات صحابہ کرام کی زیارت سے مشرف ہوئے ان کا مرتبہ اور سند قرأت دونوں اعلیٰ اور بلند پایہ ہیں۔

امام عاصم کوفی عالم و فاضل فصیح و بلیغ عابد و زاہد خوش الحان تجوید داں نیز قرآن و حدیث قرأت، فقہ، لغت، نحو و صرف کے امام تھے امام عجلی کا بیان ہے کہ عاصم صاحب سنت و قرأت ہیں اور ثقہ و رئیس القراء تھے۔

ان کی زندگی کا بھی زیادہ تر حصہ درس و تدریس ہی میں گذرا ہے اہل کوفہ نے آپ کے شیخ ابوعبدالرحمٰن السلمی کی وفات کے بعد آپ کو مسند قرأت سے نوازا جس پر پچاس سال تک فائز رہے اور اپنے سرچشمہ فیض سے لوگوں کو سیراب کرتے رہے۔

آپ کے تلامذہ میں امام شعبہ، سفیان بن عیینہ، سعید بن ابی عروبہ، حماد، امام اعظم ابو حنیفہ، زائدہ ابوخیثمہ شریک، ابوعوانہ ابوبکر بن عیاش اور حفص بن سلیمان جیسے بلند مراتب قراء شامل ہیں۔

حدیث پاک میں بھی درک وبصیرت رکھتے تھے، حافظ ابو شامہ تحریر فرماتے ہیں:

ابوبکر عاصم بن ابی النجود احد السادۃ من ائمۃ القراۃ والحدیث — امام ابوبکر عاصم بن ابی النجود ائمہ قرأت و حدیث کے امام تھے۔

ابو عوانہ کا بیان ہے کہ عاصمؒ کی کوئی حدیث امام مسلم نے نہیں نقل کی ہے سوائے ابی بن کعب کی حدیث لیلۃ القدر کے۔

امام عاصم بڑے عابد و زاہد تھے، نمازیں بکثرت پڑھتے تھے جمعہ کے دن نماز عصر تک مسجد سے باہر نہ نکلنا لازم سمجھتے اور عبادت میں مصروف رہتے عبادت کے ساتھ والہانہ ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ اگر کہیں کسی کام سے جاتے ہوئے راستے میں مسجد نظر آتی وہاں رک کر دو چار رکعت نوافل ادا کئے بغیر آگے نہ بڑھتے ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

"امام عاصم کوفی عابد اور کثیر الصلوٰۃ تھے جمعہ کے دن نماز عصر تک جامع مسجد میں رہنا لازم سمجھتے تھے۔"

موصوف کا اصل طغرائے امتیاز فن قرأت ہی ہے اس فن کے ماہر و مشاق اور رموز و نکات کے فہیم تھے اس کا سب سے واضح ثبوت آپ کی قرأت پر علمائے امت کا اتفاق و اجتماع ہے، تمام ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں آپ کی قرأت آپ کے شاگرد امام حفص بن سلیمان کے طریق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ اور بہت مقبول اور مشہور ہے۔

(۶) چھٹے قاری امام حمزہ الزیات کوفی ہیں جو ۸۰ھ میں ہشام بن عبدالملک کے دور خلافت میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے اور یہی آپ کا وطن ہے اصلاً فارسی النسل ہیں ۱۵۸ھ میں حلوان میں بزمانہ خلافت خلیفہ منصور عباسی انتقال کیا آپ کی قبر حلوان میں ہے۔

امام حمزہ نے تابعین کی ایک سرکردہ جماعت سے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اس میں اس قدر صلاحیت و مہارت پیدا کی کہ خود ان کی شخصیت مرجع انام بن گئی علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

"انہوں نے تابعین سے قرأت کی تعلیم حاصل کی اور اس کے صدر نشین قرار پائے پھر اکثر اہل کوفہ نے ان سے اس فن کو حاصل کیا۔"

آپ کے اساتذہ میں سلیمان بن مہران الاعمش، حمران بن رعین شیبانی محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ انصاری، ابو عبداللہ جعفر الصادق وغیرہ جیسے حضرات شامل ہیں۔ امام موصوف نے جن محدثین سے حدیث کا سماع کیا تھا ان میں حکم بن عیینہ حبیب بن ابی ثابت عمر بن مرہ، ابو محمد طلحہ بن مصرف عدی بن ثابت حماد بن رعین، ابواسحاق اسبیعی ابو اسحاق شیبانی اور منصور بن المعتمر سلمی وغیرہ جیسے ائمہ فن شامل ہیں۔

آپ کے تلامذہ میں ابو عیسیٰ خلاد صیرفی اور محمد خلف بہت مشہور ہیں اور آپ کی قرأت کے راوی بھی ہیں ان کے علاوہ چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں: عبداللہ ابن مبارک حسین بن علی جعفی، عبداللہ بن صالح عجلی، سلیم بن عیسیٰ محمد بن فضل، عیسیٰ بن یونس امام وکیع قبیصہ بن عقبہ یحییٰ بن یمان ابراہیم بن ادہم، سفیان ثوری، شریک بن عبداللہ وغیرہ۔

امام حمزہ بڑے عالم و فاضل تھے قرآن و حدیث قرأت و تجدید اور ادب و فرائض میں غیر معمولی دسترس رکھتے تھے آپ کے شیخ امام الاعمش جب آپ کو دیکھتے تو فرماتے اَنْتَ عَالِمُ الْقُرآن۔ امام الاعمش کے بعد آپ ہی کو منصب امامت و مشیخیت حاصل تھی۔

امام حمزہ کو علم فرائض یعنی قانون وراثت میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی اس وقت اس فن میں آپ کی کوئی نظیر نہ تھی دراصل یہی دونوں علوم یعنی قرآن اور فرائض ہی آپ کی شہرت و مقبولیت کی اصل بنیاد بنے۔ امام اعظم ابو حنیفہ کا بیان ہے کہ امام حمزہ قرآن اور فرائض میں لوگوں پر غالب تھے۔

امام حمزہ بڑے عابد و زاہد کثیر الصلوٰۃ تھے کہا جاتا ہے کہ کثرت عبادت میں وہ صلحاء ست کا اعلیٰ اور بہترین نمونہ تھے رات کا زیادہ تر حصہ عبادت میں گذارتے تھے اور بہت کم سوتے تھے علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ وہ عبادت و فضیلت اور دنیا سے بے تعلقی میں

جلیل القدر بندے تھے۔

امام حمزہ کی ذات میں بہت سی ایسی خوبیاں جمع تھیں جو انسان کے باطن کو ہر قسم کی کثافتوں سے صاف کر کے اسے مثل آئینہ مجلی کر دیتی ہیں۔ جریر ابن عبد الحمید کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شدید گرمی میں حمزہ کا ہمارے پاس سے گزر ہوا میں نے پینے کے لئے پانی پیش کیا مگر موصوف نے اسے قبول نہ کیا کیونکہ میں ان سے قرآن پاک پڑھتا تھا۔

امام حمزہ اصول قرأت میں افراط و تفریط کے ساتھ پڑھنے کو منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کیا تم نہیں جانتے کہ سفید رنگ سے معاملہ بڑھ جائے تو برص ہو جاتا ہے گھنگھریالے بال اگر مزید گھنگھریالا بنانے کی کوشش کیجائے تو سخت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرأت میں افراط و تفریط سے کام لیا جائے تو وہ قرأت باقی نہیں رہتی۔

ساتویں قاری امام ابو الحسن علی کسائی ہیں، فارسی النسل ہیں یعنی ان کے آباء و اجداد فارس کے رہنے والے تھے ۱۱۹ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹ھ میں شہر "رے" میں وفات پائی۔

قراء سبعہ میں یہ سب سے آخری لیکن سب سے زیادہ ہمہ گیر و ہمہ جہت ہیں امام حمزہ زیات، قاضی محمد بن ابی لیلیٰ، امام ابو بکر، امام اسماعیل بن جعفر انصاری زائدہ بن قدامہ اور عیسیٰ بن عمر ہمدانی سے قرأت قرآن کی تحصیل کی۔ اور پھر بڑا کمال پیدا کیا اور لائق تقلید ہو گئے۔ ابن الانباری کا بیان ہے کہ "قرأت عربیت اور لغت میں اعلم الناس" تھے علامہ ذہبی نے ابن حجر کا قول نقل کیا ہے کہ کسائیؒ کی قرأت سب قرأتوں میں سب سے زیادہ صحیح ہے" امام ابن معین فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے امام کسائیؒ سے زیادہ عمدہ پڑھنے والا نہیں دیکھا"

امام کسائیؒ کو ہارون الرشید کی خدمت میں بڑا اثر و رسوخ تھا اور اکثر صحبتیں رہا کرتی تھیں اور ہارون کی اتالیقی بھی کی تھی بعد میں ان کے لڑکے امین کو بھی پڑھایا بڑے بڑے ائمہ آپ کے شاگرد ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرا۔ ان کے علم کی وسعت اور جامعیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ [illegible]

قدر ہوتا تھا کہ آپ ممبر پر بیٹھ کر درس دیتے تھے آپ پڑھتے جاتے تھے اور طلبہ مصاحف میں قرأت لکھتے جاتے تھے۔

سیبویہ سے اکثر مناظرے ہوتے تھے، یزیدی سے بھی صحبتیں رہا کرتی تھی امام محمد بن حسن شیبانی کے خالہ زاد بھائی ہیں دونوں نے ایک ہی دن ہارون الرشید کے ساتھ خراسان جاتے ہوئے شہر "رئی" میں وفات پائی، اس کا اثر ہارون الرشید پر گہرا ہوا اس نے دکھ کے ساتھ اس کا اظہار کیا:

"ہم نے علم فقہ اور نحو دونوں کو ایک ہی دن شہر "رئی" میں دفن کر دیا"

نحو کے امام تھے اور کوفی نحوی اسکول کے بانی بھی، کوفہ میں موصوف اور ان کے شاگرد فراء ہی نے نحو کی داغ بیل ڈالی اور اسکی وسعت ہمہ گیری بنا دی ان میں دونوں نے اس کے خطوط بنائے اور اپنی علمیت کی بناء پر کوفی نحو کو بڑی وسعت دی اور ایک مکمل نظریہ اصول کے طور پر پیش کیا اس کے مقدمات کو ترتیب دیا اور علم نحو کے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔

ان کا علم نحو سے متعلق یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے: کسائیؒ ایک مرتبہ لمبا سفر طے کر کے اپنے دوستوں کے پاس گئے اور اپنی تکان ان لفظوں میں بیان کیا "لقد عییتُ"، اس پر ان کے دوستوں نے کہا کہ تم ہماری صحبت میں رہتے ہوئے بھی اس طرح کی فروگذاشت کرتے ہو انہوں نے کہا کہ میں نے کون سی غلطی کی ہے تو ان لوگوں نے بتایا کہ اگر تم محنت کرنے کی وجہ سے تھک گئے ہو تو عییت، کے بجائے اعییت کہنا چاہیئے۔ عییت اس وقت بولا جاتا ہے جب انسان کو کوئی تدبیر سجھائی نہ دے اور بالکل عاجز و بے بس ہو۔ کسائیؒ کو اس واقعہ سے بڑی خجالت محسوس ہوئی اور اسی وقت علم نحو کے حصول کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دریافت کیا کہ اس وقت علم نحو کا ماہر کون شخص ہے۔ لوگوں نے معاذ بن الہراؒ کا نام بتایا۔ چنانچہ ان کے پاس گئے اور ان کے پاس جو بھی تھا سب حاصل کر لیا۔ بعد ازاں خلیل بن احمد نحوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بھی استفادہ کیا۔ خلیل بن احمد کے علمی تجربہ کو دیکھ کر بہت متعجب ہوئے اور دریافت کیا کہ آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا انھوں نے بتایا کہ حجاز، نجد اور تہامہ کے دیہاتوں سے چنانچہ کسائیؒ بھی ان دیہاتوں کی طرف چلے گئے اور جب واپس ہوئے تو حفظ کی ہوئی چیزوں

کے علاوہ روشنائی کی پندرہ بوتلیں دیہاتوں کے اقوال و محاورات کے لکھنے میں صرف کی تھیں۔

امام کسائیؒ نے اگرچہ زندگی کا بیشتر حصّہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم ہی میں گزارا لیکن تصنیف و تالیف بھی کی جو اس زمانہ میں مفقود تھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ علوم قرآنی میں ایک کتاب معانی القرآن تصنیف کی۔ نحو سے دلچسپی اور تعلق کا حال اوپر گزرا اس فن میں دو کتابیں مختصر النحو اور کتاب الحدود فی النحو لکھیں۔ یہ کتابیں ناپید ہیں البتہ ایک کتاب اغلاط عام سے متعلق تھی جس کا نام "ماتلحن فیہ العلوم" ہے جو چھپ کر شائع ہو گئی ہے۔

قراء سبعہ کے علمی و دینی کارناموں میں سب سے اہم ان لوگوں کی تدریسی زندگی ہے ۵۰ سال سے سو سال تک کی عمریں پائی اور زندگی کا بیشتر حصہ خدمت قرآن میں صرف کیا ہر وقت تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہتا کسی کو تہجد کے بعد موقع ملتا تو کسی کو فجر کے بعد کسی کو حکم ہوتا کہ مسجد میں رہو جب وقت ملے گا پڑھا دوں گا غرض قراء سبعہ کے درس میں طلبہ کا اژدھام رہا کرتا تھا بعض قراء کا کثرت طلبہ کی وجہ سے حال یہ تھا کہ ممبر پر بیٹھ کر درس دیتے تھے۔

قراء سبعہ کی ذاتی زندگی پاک و صاف اور بے عیب تھی۔ زہد و تقویٰ میں صلحائے امت کے اعلیٰ نمونہ تھے اپنے عصر کے رائجہ علوم میں دسترس رکھتے تھے ان کا سب سے اہم کارنامہ خدمت قرآن ہے۔ جس کے لئے اپنی پوری زندگیاں صرف کر دیں ؎

جزا اللہ بالخیرات عنا ائمۃ

لنا نقلوا القرآن عذبا و سلسلا

پہلی قسط

ترجمہ "تذکرہ علمائے ہند" پر ایک نظر

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، استاذ شعبہ تقابل ادیان، ہمدرد یونیورسٹی۔ نئی دلی

قوموں کا کلچر ان کے راگ رنگ اور انداز رقص و سرور کا نام نہیں ہوا کرتا اس کا حقیقی و واقعی مصداق وہ علوم و فنون ہیں جو ان کے اسلاف کی سعی مشکور سے ظہور میں آئے اور پروان چڑھے انہی علوم و فنون سے ہر قوم کی ثقافتی عظمت کا مقام متعین کیا جاتا ہے کہ اس نے عالمی تہذیب و تمدن کی ترقی میں کیا کردار انجام دیا ہے۔

اور ان علوم و فنون کے امین و محافظ ہوتے ہیں اس کے علماء جن کی علمی و حکمی سرگرمیوں کا تذکرہ اخلاف کے شوق حصول علم اور جذبۂ تحقیق کو ایک تازہ ولولہ بخشتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو علمائے اسلام کی تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں ہماری عظمت ماضی کا قابل فخر و ابتہاج کارنامہ اور ہماری قومی ثقافت کا سرچشمہ اور اس کا جزو لاینفک ہیں۔ مگر پچھلے دو سو سال میں بیرونی حکمرانوں نے اپنے استعمار پسندانہ مصالح کے پیش نظر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ نئی نسل کا قدیم سے ناطہ اس حد تک ٹوٹ گیا کہ آج حصول آزادی کے بعد بھی اس کا بحال کرنا دشوار ہو رہا ہے شاید اسی صورت حال سے متاثر ہو کر شاعر ملت نے فرمایا تھا۔

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

پھر بھی عظمت ماضی کو ایک مرتبہ بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

لیکن بہی خواہان ملت کی سعی پیہم کے باوجود عربی و فارسی کو سماج میں وہ مقام نہیں دلایا جا سکا جو کسی زمانہ میں انہیں حاصل تھا کہ اس کی تلافی ان زبانوں میں ودیعت کردہ علمی سرمایہ کو اردو میں منتقل کرکے کی جا رہی ہے اور یہ کام پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ منظم طور

پر کیا جا رہا ہے۔ حکومت اپنی جگہ انتہائی فراخدلی سے اس کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اکابر ملت اپنی جگہ اپنی انتظامی صلاحیتوں سے اس کوشش کو بارآور بنانے میں ساعی ہیں اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس پر دو ٹوک فیصلہ قبل از وقت بھی ہے اور غیر ضروری بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ انفرادی مساعی میں اگر کہیں جھول رہ گئے ہوں یا اصلاح کی حاجت ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے تاکہ دوسرے کارکنوں کے لئے وہ رہنما ہدایات کا کام دے سکے۔

عہد اسلام میں علماء کے بے شمار تذکرے لکھے گئے ہیں نہ صرف عمومی تذکرے بلکہ مختلف فنون کے ماہرین کے خصوصی تذکرے بھی، مفسرین کے، محدثین کے، فقہاء کے، متکلمین کے، لغویئن و نحاۃ کے، حکماء و فلاسفہ کے، اطباء کے حتیٰ کہ امراض چشم کے ماہرین کحالوں کے۔ پھر مختلف اسلامی ممالک کے علماء کے، مختلف مردم خیز شہروں کے۔ علمائے ہندوستان کے بھی تذکرے لکھے گئے جس کا ایک فاضلانہ جائزہ پاکستانی ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر نے اپنے اس مقدمہ میں دیا ہے جو انھوں نے مولوی رحمٰن علی کے "تذکرۂ علمائے ہند" کے اردو ترجمہ پر لکھا ہے:

"ان تذکروں میں محررہ بالا مولوی رحمٰن علی کا "تذکرہ علمائے ہند" ہماری تذکراتی ادبیات میں خاص مقام رکھتا ہے وہ ایک سرکاری آدمی تھے اور ایک سرکاری آدمی کی مشغولیات ظاہر ہیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان مشغولیات کے درمیان انہوں نے علمائے سابقین کا تذکرہ مرتب کرنے کا منصوبہ کیسے بنایا اور کیسے اسے مکمل کیا۔ یہ تو ایک انتہائی تاب فرسا کام ہے پھر اس زمانہ میں انہیں ضروری سواد کہاں سے مل گیا۔ مولانا عبدالحئی ندوی نے بھی "نزہۃ الخواطر" کے نام سے ایک مبسوط تذکرہ لکھا ہے۔ مگر وہ خالص علمی آدمی تھے اور اسی کام کے لئے ہو لئے تھے۔

بہر حال مولوی رحمٰن علی نے اپنا تذکرہ ۱۳۰۵ھ میں مرتب کیا تھا یعنی مولانا عبدالحئی ندوی کی نزہۃ الخواطر سے پہلے اور الفضل للمتقدم۔ یہ تذکرہ نول کشور پریس لکھنؤ میں ایک ہی مرتبہ چھپا۔ کتابت طباعت کی اغلاط کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ مصنف کا اصل مسودہ معلوم کہاں ہوگا، ان کے ورثاء کے پاس یا نول کشور پریس کے پچھلے ریکارڈ میں [illegible] ہوں میں۔ مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں لہٰذا پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی [illegible] کرا کے شائع کر دیا ہے۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے فاضل صدر

لکھا ہے اور برصغیر کے جانے پہچانے اور مانے اہل علم حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی نے "پیش لفظ"۔

سطور ذیل کا مقصد تحریر مصنف یا مترجم یا ناشرین پر تنقید و تبصرہ نہیں ہے۔ راقم السطور نہ اس کا اہل ہے اور نہ اسے اس قسم کے غیر نفع بخش مشاغل سے کوئی دلچسپی ہے۔ مجھے تو صرف اپنے یہاں کی علمی تاریخ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے جو آج نئی نسل کے لئے غیر مانوس بن گئے ہیں اس کے لئے میں نے مولوی رحمٰن علی کے اس "تذکرہ علمائے ہند" کو اپنی معروضات کی اساس بنایا ہے اور چونکہ اس کی فارسی اصل کے نسخے کمیاب ہیں اور عام اہل علم کی دسترس اسکے اردو ترجمہ ہی تک ہو سکتی ہے لہذا ضمناً اس ترجمہ سے تعرض بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

مجوزہ مباحث میں سب سے زیادہ اہم دو مبحث ہیں۔

۱۔ برصغیر میں علم و حکمت کا آغاز و ارتقاء۔

۲۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا معقولات میں سلسلۂ اسناد جس کی ابتداء خواجہ جمال الدین محمود سے ہوتی ہے انہی کے تلامذہ نے یہاں آکر علم و حکمت کے تعلیم و تعلم کی تجدید کی۔

کمتر اہمیت کے مباحث میں حافظ امان اللہ بنارسی کا وہ رسالہ ہے جس میں انہوں نے میر داماد اور ملا محمود جونپوری کے درمیان حدوث زہری کے مسئلے میں محاکمہ کیا ہے، نیز درس نظامی کی چند کتابوں کا تعارف ہے۔ اول الذکر (حدوث دہری کے مسئلہ میں محاکمہ) مفکرین اسلام کی تفکیر متعلقہ مسئلہ زمان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور مسئلہ زمان بقول علامہ اقبال ملت اسلامیہ کے لئے زندگی اور موت کے سوال کے مترادف ہے۔ مجوزہ درسی کتابیں ہمارے اسلاف کے علمی ورثہ کا انتہائی بیش قیمت جزء ہیں جن کی قیمت انکے ان کی نظروں میں لعل و گہر سے فزوں ہونا چاہیئے۔ لیکن اصل بحث شروع کرنے سے پہلے فن ترجمہ پر تھوڑی نظر رکھنی ضروری ہے اس دور میں ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام جس تیزی سے ہو رہا ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں اور اس صدی کے نصف [illegible] علماء و دانشوروں نے فن ترجمہ کی طرف قابل قدر حد تک توجہ فرمائی [illegible] ان تمام

شروح و متون اور حواشی کے ترجمے کر ڈالے جو داخل نصاب ہیں ان ترجموں کی وجہ سے طلبہ کی علمی صلاحیت فزوں تر ہونے کے بجائے فروتر ہو گئی کیونکہ وہ اپنی تن آسانی اور پست ہمتی کے سبب اسی ترجمے ہی سے کام چلا لیتے ہیں اور اصل تک پہونچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اس طرح ان کی ساری معلومات ثانوی درجہ کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن بسا اوقات یہی ترجمے اپنے حسن بیان، ادائیگی مفہوم اور طرز نگارش کے باعث ادبیات عالیہ میں شامل ہونے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب (CHAPMAN) نے ہومر کی الیڈ کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ شاعر KEAT کی نظر سے گذرا تو وہ اس سے بے انتہا متاثر ہوا اور اس نے اپنے تاثرات کو جس طرح ادا کیا وہ بجائے خود انگریزی ادب کا قابل ذکر کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ملی ادب میں بھی اس کی مثالیں کمیاب ہوں تو ہوں، نایاب نہیں ہیں عبداللہ بن المقفع نے کلیلہ دمنہ کا جو ترجمہ کیا تھا، وہ عربی ادب کی ادبیات عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے قصص و حکایات سے گذر کر علوم حکمیہ کے اندر بھی جن یونانی شاہکاروں کے عربی میں ترجمے ہوئے عرصۂ دراز تک فضلائے یوروپ نے اصل یونانی ہوتے ہوئے بھی انہی کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا۔

مگر بدقسمتی سے اردو کو یہ شرف حاصل نہ ہو سکا۔ عربی فارسی کے معیاری شاہکاروں کے تراجم کئے اور کرائے جا رہے ہیں۔ مگر آج اس کام نے ایک تاجرانہ کاروبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور جو لوگ یہ ترجمے کراتے ہیں وہ قوم کے پیسہ کو تو برباد کرتے ہی ہیں قارئین کی گمراہی کا ثواب بھی اسی جھوک میں کما رہے ہیں۔

مترجم کتنا ہی زیرک کیوں نہ ہو اسے عربی و فارسی زبان و ادب کے ساتھ اردو پر کتنا ہی عبور کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی وہ مصنف کا مافی الضمیر اپنی زبان میں ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے یہ ان مترجمین کے ترجموں کا حال ہے جو ذرۂ فضل و کمال پر پہونچے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ مترجمین جن کی حیثیت پیشہ ورانہ ہے ان کی کاوشوں کی قیمت کیا ہو گی یہ اہل علم پر مخفی نہیں۔ ایک لطیفہ ہے کہ محمود غزنوی کے دربار میں احناف و شوافع کے درمیان مناظرہ ہوا شافعی مناظر نے حنفی مذہب کی نماز پڑھائی اور باتیں تو در کنار قرأت کے اندر اس نے "دو برگ سبز"

کہا اور رکوع میں جھک گیا سامعین میں سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کسی نے تو اسے تفریح طبع کا ذریعہ سمجھ کر ہنسی اڑائی اور کسی نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ احناف نے نماز میں فرض و واجب کی تدقیق کی ہے فرض صرف بفحوائے آیت" فاقرءوا ماتیسر من القرآن" (۱) ایک آیت کا پڑھنا ہے اور یہ فریضہ مدھامّتان (۲) پڑھنے سے بھی ادا ہو سکتا ہے اور چونکہ امام صاحب فارسی میں قرأت کو جائز سمجھتے ہیں اس لئے اس میں مدھامتان دو برگ سبز کہدیا کیونکہ مدھامتان کا ترجمہ دو برگ سبز ہی ہے۔ ترجمہ اپنی جگہ بالکل درست تھا لیکن یہی ترجمہ تضحیک و تفضیح کا باعث بن گیا۔

ایک دوسری مثال جو بسا اوقات بڑی خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہے وہ صحیح اور تندرست آدمی کے روزہ نہ رکھنے کے بجائے فدیہ دینے کا مسئلہ ہے آیت کریمہ" وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین" (۳) کا ترجمہ عام طور سے قارئین یہی کرتے ہیں کہ" جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں ان پر واجب ہے کہ فدیہ دیں" ایسی صورت میں آیت کا مطلب بالکل غلط ہو جاتا ہے اگر قارئین کو خاصیت ابواب سے ذرا بھی واقفیت ہوتی تو" یطیقونہ" کا ترجمہ طاقت رکھنے کا کبھی نہیں کرتے یہاں دراصل" یطیقونہ" باب افعال فعل مضارع سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ضمیر" ہ" منصوب متصل ہے اس باب کی ایک خاصیت سلب ماخذ کی ہے جیسا کہ اس لفظ میں ہے یہاں سلب طاقت مراد ہے ایسی صورت میں اس کے لازمی معنی یہی ہوں گے" جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ فدیہ دیں" لیکن اس ترجمہ پر فوراً آزاد خیال حلقوں کی طرف سے اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن صیغہ مثبت" یطیقونہ" کا ترجمہ صیغہ نفی" طاقت نہیں رکھتے کیسے کر دیا یہ تو مداخلت فی الدین اور تفسیر بالرائے ہوئی جو ممنوع ہے اس اعتراض کا کچھ لوگ یوں جواب دیکر پیچھا چھڑایا کرتے ہیں کہ یہاں "لا" مقدر ہے لیکن اس تقدیر پر پھر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ قیام تقدر کے لئے قرینہ کی ضرورت ہے وہ کہاں ہے پھر ان لوگوں سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ اس لئے اردو ترجمہ کے ساتھ جب تک عربی [illegible] پر گہری نظر نہیں ہوگی اس کی روح تک نہیں پہنچا جا سکتا ہے جس طرح سطور بالا [illegible] ہوا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے کتنی ہی تشریح و توضیح کے بعد بھی ترجمے سے نہیں سمجھایا جا سکتا

یہ ترجمے کے مفاسد میں سے ایک خطرناک مفسدہ ہے دوسرے مفاسد کا،

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

کے مصداق بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غالباً اس معروض کی مزید شہادت یوروپ اور مسیحی دنیا کے مذہبی اور دینی زوال کے ذریعہ ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ عام العقیدہ لوگ عرصہ تک اپنے احبار و رہبان کے افاضات و ارشادات پر اس درجہ اعتماد کرتے تھے کہ وہ شرک باللہ کی حد تک پہنچ جاتا تھا لیکن بہرحال اس غلوفی الاعتقاد کے باوجود ان کا دین و مذہب ایک حد تک برقرار رہا مگر جب سولھویں صدی میں یوروپ کے اندر وہ تحریک پیدا ہوئی جسے نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) اور عہد اصلاح کہتے ہیں اور جمہور اپنے مذہبی پیشواؤں کی گندی اور ناگفتہ بہ بدکرداریوں سے بیزار ہونے لگے تو انھیں اصل مذہبی صحیفوں کی طرف رجوع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس کے لئے ان کے ترجمے کی ضرورت لاحق ہوئی اور پھر ہر عامی "عالم"، اور ہر چرواہا "فاضل" بن گیا۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ہر شخص نے حسب دلخواہ ان ترجموں کے احکام و مسائل کا استنباط شروع کر دیا اور پھر دین میں ایسا خلفشار پیدا ہوا جو پہلے ہی سے اہل مذہب کی بدکرداریوں سے صید زبوں بنا ہوا تھا۔ جو تاریخ کا ایک جانا پہچانا واقعہ ہے لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہزاروں زندہ آگ میں جلا دیئے گئے اور پھر اس کا مجموعی نتیجہ مذہب بیزاری کی شکل میں نمودار ہوا جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے آج ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ خطرناک تجربہ جو یوروپ میں سو فیصد ناکام ہو چکا ہے صرف تقلید یوروپ کی خاطر ہمارے یہاں دہرایا جا رہا ہے۔

تذکرہ علمائے ہند کا ترجمہ بھی کچھ اسی طرح کی داستان کی یاد دلاتی ہے یہ تذکرہ ایک مشہور فاضل رحمن علی نے ۱۳۰۵ھ میں لکھا تھا یعنی مولانا عبدالحئی کی "نزہۃ الخواطر" سے پہلے اس سے اصل کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگائیے مگر اسے پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے اردو میں جس طرح ترجمہ کیا ہے اس سے علم و تحقیق کے معصوم گلے پر جو مردار چھری چلی ہے وہ قابل ماتم ہے۔

[illegible] ہے لیکن ان کا ترجمہ ان کی زندگی کی [illegible]

[illegible] کا سامان فراہم کر رہا ہے چونکہ موصوف کا یہ ترجمہ حلقۂ علم و ادب [illegible]
[illegible] کا شرف حاصل کر چکا ہے اور قارئین تن آسانی کے باعث اصل ماخذ [illegible]
[illegible] کے بجائے ترجمہ تک ہی اپنی رسائی محدود رکھتے ہیں اس لئے ان فروگذاشت [illegible]
[illegible] کی نشاندہی ضروری سمجھی گئی جو پروفیسر موصوف سے اس تذکرہ کو اردو زبان میں منتقل
[illegible] کے وقت سرزد ہوئیں۔ تاکہ قارئین کرام اب مزید کسی گمراہی کا شکار نہ ہوں۔

مترجم کے غیر معمولی علم و فضل سے قطع نظر جس کی جھلکیاں ترجمہ کے ہر صفحہ پر مل جائیں گی
اس علمی ادارہ کے سربراہ کی ذمہ داری پر بھی نظر ڈالنا ہوگا جنہوں نے یہ ترجمہ کرایا ہے
علمی اداروں کے سربراہوں کا فرض منصبی ہے کہ وہ کار مفوضہ کی انجام دہی کے لئے صرف اہل علم
[illegible] کا انتخاب کریں محض چاپلوسوں کی دون اڑانے سے متاثر نہ ہوں۔

ترجمے کے کام کے لئے جس طرح بنیادی طور پر اس زبان سے واقف ہونا شرط ہے جس سے
ترجمہ کیا جاتا ہے نیز اس زبان پر مافی الضمیر ادا کرنے کی قدرت ضروری ہے جس میں ترجمہ کیا جاتا
ہے۔ اسی طرح اس فن سے آشنائی بھی لابدی اور ناگزیر ہے جس فن کی کتاب کا ترجمہ کیا جاتا
ہے۔ مگر غالباً پروفیسر موصوف میں یہ تینوں شرطیں مفقود تھیں۔

(الف) جہاں تک فارسی زبان سے (جس میں یہ تذکرہ مصنف نے لکھا تھا) تعلق کا ذکر
ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پروفیسر موصوف اس کے معمولی اور متعارف الفاظ
سے ناواقف ہیں۔

مثلاً مصنف رحمٰن علی نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں خود ان کے رسالہ
دانشمندی سے نقل کیا تھا

"وایشاں از ملا محمود مشہور یوسف کوسج شیرازی" (۴)

ہمارے پروفیسر صاحب نے اس کا ترجمہ بدیں منظور کیا ہے۔

"اور انہوں نے ملا یوسف شیخ شیرازی سے" (۵)

[illegible] کہ یہ "شیخ" کہاں سے آ کودا۔ مگر قارئین کو یہ پڑھ کر ہنسی بھی آئے گی [illegible]

[illegible] صاحب نے [illegible] (ک س ج) کی یہ لکھ ماری ہے "کوسج" معرب ہے "کوسہ" کا اور [illegible] فارسی میں اس شخص کو کہتے ہیں، جس کی ٹھوڑی پر چند گنے چنے بال ہو چنانچہ "برہان قاطع" [illegible] جو فارسی کی مستند لغت میں لکھا ہے۔

"کوسہ بروزن بوسہ معروف است یعنی شخصے کہ او را در چانہ و زنخ زیادہ بر چند موئے بنا شد . . . . و معرب آں کوسج است" (۶)

سوال یہ ہے کہ کیا کسی مدعی علم و ادب کو جس کا مبلغ علم "اتنا" وسیع ہو" کہ جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اس کے معمولی الفاظ کو بھی جنھیں اہل لغت "معروف است" کہکر مزید توضیح کی بڑی مشکل سے زحمت فرماتے ہیں (بلکہ کبھی تو زحمت فرمانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے جیسا کہ مصنف" فرہنگ جہانگیری" نے "معروف است" کہکر کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ انھوں نے اس کی وضاحت ضرور کی ہے" معرب آں کوسج است" (۷) ترجمہ جیسی اہم ذمہ داری کو سونپا جا سکتا ہے۔

اور پھر پروفیسر صاحب اس پر بس نہیں فرماتے، اظہار ہمہ دانی کے لئے اس پر EMENDATION کی بھی مشق عمل فرماتے ہیں یعنی" کوسج" کے "کو" کو نظر انداز فرما دیتے ہیں اور "سج" (س ج) کے س مہملہ کو ش معجمہ سے اور" ج" تحتانی کو" خ" فوقانی سے بدل کر دونوں کے درمیان "ی" کا اضافہ بھی فرما دیتے ہیں۔ اور اس طرح ملّا صاحب کو "شیخ" (ش ی خ) بنا ڈالتے ہیں گویا کہ زبان فارسی بھی جناب کے گھر کی لونڈی ہے جس طرح چاہیں تصرف بیجا فرمائیں بخوف تطویل مزید امثلہ کے ایراد سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔

(ب) اردو زبان پر قادر الکلامی کی کیفیت ملاحظہ ہو مصنف نے شیخ زین الدین خوافی کے تذکرے میں لکھا تھا۔

" وے تاریخ نوشتہ مشتمل بر فتح ہندوستان و شرح غرائب آں و داد سخنوری در آں دادہ" (۸)

پروفیسر موصوف نے اس عبارت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

"انہوں نے ہندوستان کی فتح کی تاریخ لکھی ہے جس میں غرابت کی شرح اور سخنوری کا

کمال دکھایا ہے" (۹)

مترجم کو اس کا سیاق و سباق معلوم ہو گا مگر ترجمہ سے پتہ نہیں چلتا کہ کس فاتح کے ہندوستان فتح کرنے کی تاریخ؟ مصنف (رحمان علی) کا مآخذ غالباً بدایونی کی منتخب التواریخ تھی جس میں انہوں نے شیخ زین کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

" واز جملہ فضلائے زمانہ او رشیخ زین خافی است کہ واقعات بابری راکہ آں بادشاہ مغفور نوشتہ بعبارتے بلیغ ترجمہ کردہ "

یعنی بادشاہ نے بابر نامہ میں ہندوستان کی فتح کے سلسلے میں جو کچھ تحریر کیا تھا، اس (؟) یعنی جو کچھ بابر نے لکھا تھا شیخ زین نے اس کا فصیح و بلیغ عبارت میں ترجمہ کیا۔ (بابر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ترکی میں لکھی تھی اس کا پہلا فارسی ترجمہ شیخ زین نے کیا اور دوسرا بعد میں بہرام خاں کے صاحبزادے عبدالرحیم خان خاناں نے اور یہی آج کل متداول ہے)

ابوالفضل نے بابر کی ابراہیم لودی پر فتح پانے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:"و ہمدراں روز فتح نامہا نوشتہ" ممکن ہے یہ فتحنامے شیخ زین نے لکھے ہوں۔ کچھ بھی ہو مگر ترجمہ سے قاری کے پلے کچھ نہیں پڑ سکتا۔

(۳) مصنف نے لکھا تھا "شرح غرائب آں"

پروفیسر صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا "غرابت کی شرح"

معمولی فارسی داں بھی جانتے ہیں کہ "غرائب" اور "غرابت" دو مختلف لفظ ہیں۔ غرائب جمع ہے غریبہ کی یعنی عجیب و غریب چیزیں، نوادر اور غرابت اسم مصدر ہے غریب ہونا بالخصوص کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے معنی عام طور پر لوگ نہ جانتے ہوں۔

مصنف کا مقصد تھا کہ شیخ زین نے ہندوستان کے عجیب و غریب اشیاء کا ذکر کیا ہے (اگر ان کی مراد واقعات بابری کے ترجمے سے ہے) یا جنگ میں جو عجیب و غریب واقعات رونما ہوئے مثلاً تیرہ ہزار کی مغل فوج نے ایک لاکھ ہندوستانی فوج کو شکست دیدی۔ یا بندوقوں کی آواز اور توپوں کی گرج سے ہندوستانی فوج کے ہاتھی جن پر ہندوستانیوں کو گھمنڈ تھا۔

خود اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ نکلے (اگر ان کی مراد ان فتحناموں سے ہے جو بابر نے لکھوا کر کابل، بدخشاں اور قندھار بھجوائے تھے۔)

مگر مترجم کی گلفشانی نے اسے غرابت (کلام) کی شرح بنا دیا یعنی اس کتاب "تاریخ مشتمل بر فتح ہندوستان" میں جو غریب الفاظ آئے ہیں خود شیخ زین نے (نہ کہ بعد کے کسی شرح نویس نے جیسا کہ عام دستور ہے) ان کی شرح و ایضاح کی۔

یہ ہے پروفیسر مترجم کی قادر الکلامی کہ ایک معمولی جملے کا بھی صحیح مفہوم قارئین کے ذہن نشین نہ کر سکے۔ اس ضمن میں بھی مزید امثلہ کے ایراد سے بخوف تطویل صرف نظر کیا جا رہا ہے

(ج) جب فارسی فہمی اور اردو نویسی میں پروفیسر صاحب کی علمیت کا یہ عالم ہے تو پھر ان سے تیسری شرط کی توقع بے سود ہے۔

پوری کتاب گلفشانیوں سے لبریز ہے۔ مثلاً

مصنف نے حافظ کو مکی کا ذکر کرتے وقت لکھا ہے۔

"بملازمت اکبر شاہ مشرف شدہ تفسیر سورہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحضور شاہ گذرانیدہ قریب چہل ہزار روپیہ صلہ یافتہ" (۱۰)

اس عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے لکھا ہے۔

"اکبر شاہ کی ملازمت سے مشرف ہوئے بادشاہ کے حضور میں سورہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کی قریب چالیس ہزار روپیہ انعام ملا" (۱۱)

اس ترجمہ میں یا تو مترجم نے لفظ تفسیر کا اضافہ درخور اعتنا نہیں سمجھا یا کاتب کی بے توجہی کا شکار ہو گیا بہرحال اس کی ذمہ داری مترجم، مصحح اور ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر پر یکساں آتی ہے۔

کیونکہ "سورہ محمد" اللہ تعالیٰ کا کلام ہے حافظ کو مکی کا نہیں (نعوذ باللہ منہا) انہوں نے اس کی تفسیر لکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کی تھی جس کے صلہ میں اس نے چالیس لاکھ انعام دیا تھا۔

(باقی آئندہ)

حواشی و حوالے

(۱) المزمل ۲۰

(۲) الرحمٰن ۶۴

(۳) البقرہ ۱۸۴

(۴) رحمٰن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۲ باردوم لکھنؤ ۱۹۱۴ء

(۵) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۴۳ کراچی ۱۹۶۱ء

(۶) محمد حسین: برہان قاطع (۳: ۱۷۲۹) تہران ۱۳۴۶ خورشیدی

(۷) جمال الدین: فرہنگ جہانگیری (۲: ۲۲۰) لکھنؤ ۱۸۷۶ء

(۸) رحمٰن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۶۹

(۹) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶

(۱۰) رحمٰن علی: تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۰

(۱۱) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۷

پہلی قسط

"زینب" ایک تجزیاتی مطالعہ

ابوالنصر، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مصر پر سلطان سلیم کے قبضے کے بعد وہاں علمی وادبی سرگرمیوں کو گہن لگ گیا اور وہ اپنی پچھلی رفتار ترقی کو برقرار نہ رکھ سکا۔ چونکہ عثمانی اتراک عرب نژاد نہ تھے، عربی زبان سے لگاؤ اور اس پر قدرت کے معاملے میں وہ عربوں سے کافی پیچھے تھے اور پھر سیاسی اور سماجی انتشار اور اضمحلال نے بھی علمی وادبی سرگرمیوں کو مزید سست رفتار بنا دیا مگر ۱۷۹۸ء میں نیپولین کے حملے نے عربی زبان وادب کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونکا اور اس میں ایک نئی حرکت اور توانائی پیدا ہوئی۔ نیپولین نے مصر میں مختلف علوم وفنون کو ترقی دینے کے لئے متعدد اکیڈمیاں قائم کیں اور متعدد اسکول مغربی طرز پر کھولے جسمیں اس نے انگریز اور فرانسیسی اساتذہ کا تقرر کیا، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے طلبار کو یورپی ممالک بھیجا۔ اس طرح نیپولین کی کوششوں سے مشرق ومغرب کے درمیان اشتراک کی شکلیں ابھرنے لگیں، یورپ اور مصر کے درمیان فاصلے برابر کم ہوتے گئے۔ نہ صرف سائنسی علوم وفنون کے میدان میں بلکہ تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی شعبوں میں بھی مغربیت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

نیپولین کا یہ حملہ اگرچہ ایک طرف مصریوں کے لئے غلامی کا پھندا تھا تو دوسری جانب عربی ادب کے جسم ناتواں کے لئے نئی روح کا پیغام بھی، یہی وہ پہلا موقع تھا جب مصری عوام یوروپین تہذیب کے قریب آئے اور انہیں علم وفن میں ہوئی جدید پیش رفت سے واقفیت حاصل ہوئی۔ نیپولین کے بعد محمد علی نے مصر میں سائنسی اور فنی علوم کا جال بچھا دیا، اس نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے طلبار کو بیرون ملک بھیجا، اس سلسلے میں طلبار کا جو گروپ فرانس گیا تھا

اس میں مصری فلاح رافع رفاعہ الطہطاوی بھی تھے جنھوں نے فرانسیسی افسانوں کا عربی میں ترجمہ کرکے واقعتاً عربی قصہ کو مغربی رنگ سے قریب تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مصر میں افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۰۷ میں محمد مویلحی کی "حدیث عیسیٰ بن ہشام" کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد حافظ ابراہیم کی "لیالی سطیح" علی مبارک کی "علم الدین" اور المنفلوطی کی "العبرات والنظرات" نے افسانہ نگاری کو مزید آگے بڑھایا، ان ادبا کو اگرچہ افسانہ نگاری کے بنیادی اصولوں سے آگہی نہ تھی تاہم ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے عربی افسانہ گوئی کو افسانہ نگاری کے جدید اصولوں کے مبہم تصور کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اس کے لئے ایک مناسب زمین تیار کی، ان لوگوں نے اگرچہ تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے یورپ سے کچھ فائدہ ضرور اٹھایا تھا لیکن جہاں تک ان کے اسلوب، اسٹائل اور زبان کا تعلق ہے تو وہ قدیم ادب کے مقلد نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "حدیث عیسیٰ بن ہشام" میں ہمدانی کے مقامات کی جھلک ملتی ہے۔ منفلوطی نے ہمدانی اور حریری کے اسٹائل سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کی لیکن اس پر المعری کی "رسالۃ الغفران" کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ منفلوطی کے یہاں موضوعیت اور معنویت کا تقریباً فقدان ہے صرف جذبات کا مدو جزر ہے جو مرصع جملوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن جب مصر میں فرانسیسی طرز نگارش متعارف ہوا اور جدید افسانہ نگاری کا وہ بیج جو فرانس سے آیا تھا پروان چڑھنے لگا تو مصری ادبا نے اپنے قدیم سرمایہ کی طرف دیکھا تو انہیں کافی مایوسی ہوئی کیونکہ ان کے قدیم سرمایہ میں کوئی ایسا قیمتی افسانوی اثاثہ نہ تھا جو مستقبل کے لئے راہ متعین کرسکتا چنانچہ وہ ادبا جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے اور کسی حد تک یورپ کے افسانوی ادب سے واقف ہوچکے تھے انہوں نے عربی افسانہ اور ناول کو یوروپی طرز نگارش سے متعارف کرانے کا ارادہ کیا چنانچہ محمد حسین ہیکل کا ناول "زینب" جدید افسانہ نگاری کا پیغامبر بن کر آیا۔[1] اس میں شاعرانہ تخیلات سے ہٹکر مصری سماج کو صحیح انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

"زینب" ایک نوخیز دوشیزہ کے معصوم احساسات کی کہانی ہے جسکو سماج کے فرسودہ مراسم اور بے جان بندشیں گھلا گھلا کر مار دیتی ہیں۔ اسی طرح اس ناول کا دوسرا کردار حامد

[1] THE ARABIC NOVEL, AN HISTORICAL AND CRITICAL INTRODUCTION, ROGER ALLEN P, 31-32

خلاصہ کچھ یوں ہے: "زینب ایک دیہاتی دوشیزہ ہے قدرت نے اسے جہاں [illegible]

عطا کیا وہیں اس کی قسمت میں غریبی کی لکیر بھی کھینچ دی تھی۔ وہ پیٹ کی آگ بجھانے

کے لئے دن بھر حامد کے والد محمود کے کھیتوں میں کام کرتی ہے اور حامد ہی کی

[illegible] بچپن میں اس کی چچا زاد بہن سے کر دی جاتی ہے، چھٹیاں گذارنے گھر آتا ہے تو اس کی

ملاقات زینب سے ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھتے ہیں۔ لیکن جب زینب

اپنی محبت کا انجام سوچتا تو وہ اس نتیجے پر پہونچی کہ حامد سے قطع تعلق کر لینا ہی بہتر ہے کیونکہ

سماج و معاشرہ کسی بھی صورت میں انہیں شادی کے بندھن میں بندھنے کی اجازت نہیں

دے گا۔ چنانچہ وہ حامد سے قطع تعلق کر لیتی ہے اور اپنے ایک مزدور ساتھی ابراہیم سے پیار

کرنے لگتی ہے، ابراہیم بھی خود اس کا دیوانہ تھا۔ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن کسی

طرح کی خبر زینب کے والدین کو ہو جاتی ہے تو وہ غصے سے تلملا اٹھتے ہیں کیونکہ انہیں سماجی رسم

و رواج سے انحراف بالکل برداشت نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے زبردستی اس کی شادی حسن نامی

شخص سے کر دی۔ مگر زینب نے کبھی بھی حسن کو اپنا مجازی خدا نہیں سمجھا اور نہ ہی دل سے اس سے

محبت کی۔ وہ تو ہر وقت ابراہیم کی یادوں میں کھوئی رہتی ہے جو غریبی کی لعنت سے چھٹکارہ پانے

اور زینب کے باپ کی شرط پورا کرنے کے لئے سوڈان چلا جاتا ہے اور وہ اس بات سے

بے خبر کہ زینب کی شادی ہو گئی ہے اپنے کام میں معروف رہتا ہے۔ "زینب" ابراہیم کی یاد

اور محبت کو بھلا نہ سکی اور اس کی یاد میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اور ادھر حامد بھی زینب

کی جدائی سے بڑا افسردہ اور بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ زینب کے بغیر زندگی کی تمام خوشیاں اس کے

لئے بیکار تھیں بالآخر وہ بھی چپکے سے ایک روز گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ ادھر ابراہیم شادی کا

خواب سجائے وطن واپس آتا ہے اور اسے سارے واقعات کا علم ہوتا ہے تو وہ بھی شدت

غم سے نڈھال ہو جاتا ہے"۔ —————— (باقی آئندہ)

✽ ✽ ✽ ✽ ✽ ✽ ✽ ✽ ✽

برہان

جلد ۱۱۲ — ستمبر ۱۹۹۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ — شمارہ ۳

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دھلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

۱۵/ اگست کا دن تمام ہندوستانیوں کے لئے فخر و مسرت کا دن ہے کہ اس دن ہندوستانیوں کی عظیم جدوجہد اور قربانیوں کی بدولت ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی تھی۔

۱۸۵۷ء میں انگریز سامراج نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی آڑ میں بالآخر ہندوستان پر ہی اپنا قبضہ کرلیا تھا اور اپنے اس قبضہ کو بنائے رکھنے کے لئے وہ مختلف پینترے بازی کرتے رہے۔ ہندو مسلمان کے درمیان میں تفریق پیدا کی اور جو تاریخ مغلیہ سلطنت کی ہندوستان میں رواداری محبت و شرافت اور سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کی تھی، اسے اُلٹ کر ایک دوسری ہی تاریخ گھڑدی گئی جس میں مغلیہ سلطنت کے مغل حکمرانوں کی رواداری، وسیع النظری، فراخدلی کو بے انصافی اور دوسرے مذاہب کے ساتھ ناروا سلوک میں بدل دیا گیا، جن مغل حکمرانوں نے تمام رعایا کے ساتھ انصاف کا دامن تھامے رکھا انھیں ظالم حکمراں کے نام سے تاریخ میں لکھوا دیا گیا۔ جن مغل حکمرانوں نے اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق دوسرے مذاہب کے احترام کو ہمیشہ فوقیت دی اور ہر سہولت انھیں بہم پہنچائی۔ اگر انھیں اپنی عبادت گاہوں، پوجا پاٹھوں، مندروں شوالوں، گوردواروں اور مٹھوں کی تعمیر کی ضرورت پیش آئی تو سرکاری خزانوں سے انھیں تمام مال و اسباب کے ساتھ زمین و جگہ بھی ان کے حسب خواہش و ضرورت مہیا کئے گئے، ان کی اس نیکی و فراخدلی کو انگریز سامراج نے ہندوستان پر اپنے قبضہ و اقتدار کو ایک طویل مدت تک برقرار رکھنے کے لئے، بڑی ہی تیاری کے ساتھ اس کے علی الرغم تاریخ میں مذکور کرا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھولے بھالے اور

سادہ لوح عوام نے مغل حکمرانوں کے خلاف اپنے دل و دماغ میں ظالم و جابر اور ناانصاف ہونے کا تصور بٹھا لیا، جس سے ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور وہ انگریز حکمرانوں کو اسی ایک وجہ سے کسی حد تک برداشت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ظلم و عیاری اور مکاری کی مدت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی۔ ہندوستانی دانش مندوں کا طبقہ اٹھا اور اس نے انگریز سامراج کی مکاری سے عوام الناس کو آگاہ کیا دیکھتے ہی دیکھتے عوام الناس کا بہت بڑا اجماع انگریز سامراج کے خلاف اور اپنے ملک کی آزادی کے لئے میدان عمل میں کود پڑا کچھ عرصہ بعد موہن چند کرم گاندھی نام کے ایک انسان نے ہندوستان کی آزادی کے لئے تحریک آزادی کے رُخ کو اس خوشگوار طریقہ سے موڑا کہ جہاں انگریزوں نے من گھڑت باتوں سے ہندو مسلم منافرت کی فضا پیدا کی تھی وہاں ہندو مسلم اتحاد کی وہ بے نظیر مشعل دیکھنے کو ملی جس کو دیکھ کر ہر ہندوستانی نے راحت و سکون کی سانس لی، انگریز سامراج دہل گیا۔ اور اسے اپنا بستر گول ہوتا ہوا صاف دکھائی دینے لگا۔

آزادی کے پروانوں کی لمبی قطاریں کھڑی ہو گئیں۔ اور اسی طرح قائدین آزادی کی بھی کثیر تعداد میدان عمل میں مستعد و متحرک نظر آنے لگی۔

مولانا محمد علی جوہرؒ، حکیم اجمل خانؒ، موہن چند کرم چند گاندھی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزادؒ، سردار ولبھ بھائی پٹیل مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ ڈاکٹر سید محمودؒ، مولانا سید محمد میاںؒ، ڈاکٹر پرشوتم داس ٹنڈن وغیرہ نام کہاں تک گنائے جائیں یہ سب نام نمایاں تھے اس وقت بھی جب آزادی کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور آج؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج جب ہمارا ملک آزاد ہے تو قائدین آزادی تحریک میں چند ہی نام نمایاں رہ پائے ہیں باقی سب نام اسی طرح حذف کر دیئے گئے یا بھلا دیئے گئے جس طرح ایک ناشکر گذار انسان اپنے محسن کی احسان مندیاں فراموش کر دیتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں کون یہ باور کر سکتا تھا کہ جب ہم آزادی کی ۴۶ ویں سالگرہ منا رہے ہوں گے تو قائدین آزادی کے یہ نمایاں نام سب بھلا دیئے جائیں گے۔ ایک دو نام صرف اسی لئے یاد رکھے جائیں گے کہ اس سے کچھ لوگوں کے اپنے اپنے مفاد وابستہ ہونگے ملک کی خدمت کے جذبہ میں جنھوں نے اپنی جانیں تک قربان کردیں وہ تاریخ میں بھی مشکل ہی سے جگہ پانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ اسے ہم تاریخ آزادی کا المیہ ہی کہیں گے۔

۱۵ اگست ۱۹۹۳ء کو لال قلعہ میں جھنڈا سلامی کے موقع پر وزیراعظم جناب پی وی نرسمہاراؤ نے قوم کے نام جو پیغام دیا ہے اس میں انہوں نے آزادیٔ ہند کے بنیادی ڈھانچہ سیکولرزم کو بنائے رکھنے کے عزم کا اظہار کیا ہے اور ایسی شر پسند اور ملک دشمن طاقتوں کے خلاف ملک و قوم کے مفاد میں اپنے جذبات کا جسطرح اظہار کیا ہے وہ ستائش کے قابل ہے۔ اور اس سے ہر ہندوستانی کے مزاج کا پتہ چلتا ہے دراصل پچھلے کچھ عرصہ میں ہندوستان میں فرقہ پرستی کا جو زہر پھیلایا جارہا ہے اور جس کی وجہ سے انگریز سامراج کے بوئے ہوئے بیج کی آبیاری کرنے کی ایک خطرناک اور شرمناک سازش کی جارہی ہے اس پر وزیراعظم نے جس زوردار ڈھنگ سے وار کیا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں ہندوستان میں فرقہ پرستی کو پنپنے کے مواقع مسدود ہوں گے اور جس طرح ۶ دسمبر ۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت ہوئی اور جس کو ہندوستان کی اکثریت نے کسی بھی طرح اچھی نظر سے نہیں دیکھا وہ ہندوستان کے سنہری مستقبل کے لئے خوش آئند ہی ہے۔

وزیراعظم ہند نے خود بابری مسجد کی شہادت کو ہندوستان کے لئے شرمناک بات کہی ہے۔ ہندوستان کی رواداری، وسیع النظری، تہذیب و تمدن اور ہزاروں برسوں سے چلی آرہی ہندو مسلم ایکتا پر دھبہ بتایا ہے۔ اور جس کی وجہ سے تمام دنیا میں عظیم ہندوستان کا سر شرم سے جھک گیا ہے کہکر صحیح معنوں میں انہوں نے ہندوستان کی ہزار سالہ روایات و تاریخ کی ترجمانی کی ہے۔ اسے فرقہ پرست طاقتیں اپنے لئے

وار تنگ سمجھیں گی یا کچھ اور؟ یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن وزیر اعظم جناب پی وی نرسمہاراؤ نے ۱۵ اگست ۹۳ء کو جھنڈا اسلامی پر لال قلعہ پر قوم کو خطاب کرتے ہوئے جس مضبوطی و عزم کے ساتھ فرقہ پرستی کے خلاف لڑنے اور ہندوستان کے سیکولر کردار کو قائم رکھنے کی بات کہتے ہوئے اقلیتوں کے حقوق و تحفظ کی جسطرح یقین دہانی کی ہے ہم یہاں اسکا خیر مقدم کرتے ہیں اور بارگاہ عالی میں دُعاگو ہیں ہندوستان کی آن و بقا اور تحفظ کے لئے۔ اور ساتھ ہی اس کے بنیادی ڈھانچہ سیکولرزم و ہندو مسلم سکھ عیسائی اتحاد و بھائی چارہ اور سب کے ساتھ مساویانہ سلوک و سب کی خوشحالی و ترقی کے لئے۔

بقیہ : وفیات

اور پھر مسلمانانِ ہند کے نئے نئے قائدین پیدا ہونے شروع ہوئے۔ انہوں نے جسطرح مسلمانوں کی قیادت کی اس سے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے مسلمانانِ ہند کوئی قوم نہیں بلکہ فروخت ہونے والی کوئی شئے ہے لیڈری کی دوکانیں سجائی گئیں اور بالآخر جس کا انجام بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں ہوا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے۔

مرحوم جناب شمس الرحمٰن تنویر عثمانی برہان کے نظرات بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ قبلہ ابّا جان حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کے انتقال کے بعد ان کے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان کے کام کو جس لگن محنت اور کامیابی کے ساتھ مفتی صاحبؒ کے پروگرام کے مطابق جاری و ساری رکھا اسے دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتے تھے اور شاباشی کے ساتھ بارگاہِ عالی میں احقر کے لئے دعاگو رہتے تھے۔ گذشتہ جون جولائی ۹۳ء کے نظرات میں جو حاجی احمد اللہ مرحوم کا واقعہ حسب روایت مرحوم احمد اللہ کے صاحبزادہ حشمت اللہ شائع ہوا تھا اسے پڑھکر تعریفی خط لکھا کئی کشمیری حضرات کے تعریفی جملے سنائے۔ حاجی احمد اللہ مرحوم کشمیری کے لئے کہا کہ ایسے ہی لوگ اسلام کے مبلغ ہیں جو دین کیساتھ بنی نوع انسانی کی خدمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بندے پر عائد حقوق العباد کو بجالانے کا حق ادا کرتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

امام ابوحنیفہؒ اور علم حدیث

احسان اللہ فہد فلاحی، ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے "حکمت ولی اللہی کا اجمالی تعارف" میں ایک جگہ شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ ہندوستان میں جو کوئی مجدد بھی پیدا ہوگا اسے اصلاح و تجدید کی خدمات انجام دیتے وقت فقہ حنفی کی رعایت کرنی ہوگی۔ یہ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی فقہی وابستگی اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں اسے ہمیشہ ذہن میں ملحوظ رکھنے کی طرف واضح اشارہ تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے مبلغین اور مصلحین کو اس حقیقت سے روشناس کرایا تھا کہ اس ملک میں تجدید کا کام کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ فقہ حنفی کا عمیق مطالعہ کریں اور دعوتی و تبلیغی مسائل میں اسے ملحوظ خاطر رکھیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج عوام و خواص کی اکثریت امام ابوحنیفہؒ کی حیات و خدمات سے ناواقف ہوتی جارہی ہے اور یہ دراصل نتیجہ ہے اسلامی ورثہ سے غفلت اور تاریخ اسلام کی نامور شخصیات سے کنارہ کشی کا۔ ذیل کے مختصر مضمون میں امام اعظم کی حیات و خدمات پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ تاریخ اسلام کی یہ تابندہ نقوش ہمیشہ نظروں کے سامنے رہیں۔

امام اعظمؒ کا نام نعمان، کنیت ابوحنیفہ اور لقب امام اعظم ہے والد محترم کا نام ثابت بن زوطی بن ماہ ہے۔ آپ کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ آپؒ کے دادا حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں دارالخلافۃ کوفہ تشریف لائے اور وہیں سکونت پذیر ہوگئے۔ آپؒ ۸۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اس وقت عبدالملک بن مروان مسند آرائے خلافت تھا۔ یہ وہ مبارک عہد تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال مبارک سے جن لوگوں کی آنکھیں روشن ہوئیں تھیں ان میں سے چند بزرگ موجود تھے۔ انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ اور ابوطفیل عامر بن واثلہؓ تو ابوحنیفہ کے آغاز شباب تک زندہ رہے۔ لیکن تعجب ہے کہ امام صاحب نے ان سے کوئی حدیث روایت

نہیں کی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک آپ ان پڑھ تھے اور اپنے باپ کے ساتھ تجارت کے کاموں میں مشغول تھے۔ ۹۴ھ میں ولید کے انتقال کے بعد جب سلیمان بن عبدالملک نے مسند خلافت کو زینت بخشی تو اس نے اپنے عہد میں درس وتدریس کو عام کر دیا۔ اسوقت آپکے دل میں بھی علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ حسن اتفاق سے ایک دن بازار جارہے تھے۔ امام شعبیؒ جو کوفہ کے مشہور امام تھے ان کا مکان راہ میں تھا۔ سامنے سے نکلے تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ کوئی نوجوان طالب علم ہے پاس بلا لیا اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو۔ انھوں نے ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبیؒ نے کہا کہ میرا مطلب یہ نہ تھا تم پڑھتے کس سے ہو۔ انہوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کسی سے نہیں۔ امام شعبیؒ نے کہا کہ مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو (۱) اس نصیحت نے آپ کے دل میں گھر کرلیا اور نہایت اہتمام سے تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے آپ نے علم کلام کی طرف توجہ کی۔ اسوقت تک علم کلام مدّون و مرتب ہوکر اکتسابی علوم میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کی تحصیل کے لئے مذہبی معلومات اور قدرتی ذہانت درکار تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کو دونوں خصوصیات دی تھیں۔ چنانچہ آپ نے علم کلام میں وہ کمال پیدا کرلیا کہ بڑے بڑے اساتذۂ فن بحث کرنے میں ان سے جی چراتے تھے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد علم فقہ کی طرف مائل ہوئے اور پوری زندگی علم فقہ کے نذر کردی۔ علم کلام سے بددل ہونے کے بعد آپ نے حمّاد کی شاگردی اختیار کرلی۔ حمّاد کوفہ کے مشہور امام اور استاذ تھے۔ حضرت انسؓ سے حدیث سنی تھی۔ بڑے بڑے تابعین کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے تھے اسوقت انہی کا مدرسہ مرجع عام سمجھا جاتا تھا۔ چند روز تک تو امام ابوحنیفہ رح پچھلی صفوں میں بیٹھتے رہے لیکن جب حمّاد کو معلوم ہوا کہ حافظہ اور ذہانت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے تو سب سے آگے بیٹھنے کا حکم دیا۔ دس سال تک آپ حمّاد کی درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے آپؒ کی غیر حاضری میں امام ابوحنیفہ آپ کے جانشین ہوا کرتے تھے اور سائلین کو جواب دیا کرتے تھے حمّادؒ کا ۱۲۰ھ میں انتقال ہوگیا۔ جبتک حمّاد زندہ رہے ابوحنیفہؒ آپ کی خدمت میں حاضر رہے اور علم فقہ کی تحصیل کی۔ حمّاد کے زمانہ ہی میں آپ نے حدیث کی طرف بھی توجہ کی کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ مسائل فقہ کی مجتہدانہ تحقیق بغیر حدیث کی تکمیل کے ممکن نہیں ہے اسوقت امام صاحب کے وطن

کوفہ کا ایک ایک گھر حدیث و روایت کی درسگاہ بنا ہوا تھا۔ بصرہ بھی وسعتِ علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے کوفہ کا ہمسر تھا۔ یہ دونوں شہر اسلامی علوم کے دارالعلوم خیال کئے جاتے تھے۔ کوفہ کا کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں۔ شیوخ کوفہ میں خاص کر امام شعبیؒ، سلمہ بن کہیلؒ، محارب بن وثارؒ ابواسحاق سبیعیؒ، عون بن عبداللہؒ، اعمشؒ، عطار بن سائبؒ، موسیٰ ابن ابی عائشہؒ، علقمہ بن مرثدؒ بہت بڑے محدث اور مسند روایت کے مرجع عام تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے کوفہ اور بصرہ کی درسگاہوں سے حدیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ حاصل کرنے کے بعد مزید حصول علم کے لئے حرمین کا رخ کیا۔ اور استفادہ کی غرض سے عطار بن رباحؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۱۱۵ھ تک آپ کی خدمت میں رہ کر مستفید ہوتے رہے۔ عطار بن رباح کے علاوہ آپ نے حضرت عکرمہؒ کی بھی شاگردی اختیار کی اور ان سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ آپ جب مدینہ پہونچے تو اس وقت فقہائے سبعہ میں سے حضرت سلیمانؒ اور سالم بن عبداللہؒ زندہ تھے۔ آپ ان دونوں بزرگوں کی بھی خدمت میں پہونچے اور ان سے حدیثیں روایت کیں۔ امام اوزاعیؒ اور مکحول شامیؒ جو شام کے امام المذہب کہلاتے تھے۔ امام صاحب نے مکہ ہی میں ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور حدیث کی سند لی۔ ان بزرگوں کے علاوہ آپ حضرت امام باقرؒ کی بھی خدمت میں حاضر ہوئے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں آپ نے ان سے حاصل کیں۔ ان کے علاوہ حضرت باقرؒ کے فرزند رشید حضرت جعفر صادق کی [illegible] صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ غرضیکہ امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ حدیث کی تعداد [illegible] [illegible] امام صاحب نے چار ہزار لوگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں [illegible] [illegible] کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ نے حضرت [illegible] عہد [illegible] پا لیا تھا لیکن استاد کے احترام [illegible]

[illegible]

کوفہ کی اکثر درس گاہیں ٹوٹ کر ان کے حلقہ میں آ ملیں۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ خود آپ
کے اساتذہ مثلاً امام اعمشؒ مسعر بن کدامؒ وغیرہ آپ سے استفادہ کرنے لگے اور دوسروں
کو آپ سے استفادہ کی ترغیب دلانے لگے۔ اسپین کے علاوہ ساری دنیا کے لوگ آپ کی خدمت
میں حاضر ہو کر آپ سے مستفید ہونے لگے۔ اسلامی دنیا میں آپ کی عزت و شہرت کی وجہ سے خلیفۂ وقت
کو آپ سے خطرہ محسوس ہونے لگا اور ملک کے مختلف انقلابات میں آپ کا نام سرفہرست رکھا
جانے لگا۔ چنانچہ آپ کی عزت و شہرت کو اسلامی دنیا میں کم کرنے کے لئے آپ کے سامنے منصب
قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے نہایت بے باکی سے اس کا انکار کر دیا چنانچہ آپ کو
قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ خلیفۂ وقت نے آپ کو روزانہ دس درّے لگانے
کا حکم دیا۔ لیکن آپ نے منصب قضاء کو قبول نہیں کیا۔ آخر کار خلیفہ نے مجبور ہو کر آپ کو رہا کر دیا
۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آل عباس تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ آل
عباس نے بنو امیہ کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کروا دیا۔ خلفائے بنو امیہ کی قبریں اکھڑوا کر
ان کی ہڈیاں جلا دیں اور اس قدر ظلم کیا کہ ہر طرف سے بغاوت کے آثار نظر آنے لگے۔ محمد نفس ذکیہ
اور ابراہیم نے آل عباس کے خلیفہ منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ
نے ان بغاوتوں کی حمایت کی۔ خلیفہ منصور بغاوتوں کو کچلنے میں کامیاب ہو گیا اور امام صاحب کو
دار الخلافہ بغداد میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ منصور آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لئے
بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے امام صاحب کے سامنے عہدۂ قضاء پیش کیا آپ نے اسکو قبول کرنے سے
معذرت کر لی۔ اس کی وجہ سے آپ کو پھر قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ منصور نے آپ کو
۱۴۶ھ میں قید کروا دیا لیکن اس حالت میں بھی اسکو ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا چنانچہ ۱۵۰ھ میں
امام صاحب کو بے خبری میں زہر دے دیا۔ جب آپ کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی
حالت میں انتقال [illegible]۔ إنا لله وإنا إليه راجعون۔

امام ابو حنیفہؒ سے صحاح ستہ میں حدیثیں بہت کم مروی ہیں باوجود اس کے کہ آپ
[illegible] تھے اور بڑے بڑے اساتذۂ حدیث سے حدیث کی سند میں حاصل

کوفہ کا ایک ایک گھر حدیث و روایت کی درسگاہ بنا ہوا تھا۔ بصرہ بھی وسعتِ علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے کوفہ کا ہمسر تھا۔ یہ دونوں شہر اسلامی علوم کے دار العلوم خیال کئے جاتے تھے۔ کوفہ کا کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں۔ شیوخِ کوفہ میں خاص کر امام شعبیؒ، سلمہ بن کھیلؒ، محارب بن دثارؒ ابو اسحاق سبیعیؒ، عون بن عبد اللہؒ، اعمشؒ، عطار بن سائبؒ، موسٰی ابن ابی عائشہؒ، علقمہ بن مرثدؒ بہت بڑے محدث اور مسند روایت کے مرجع عام تھے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کوفہ اور بصرہ کی درسگاہوں سے حدیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ حاصل کرنے کے بعد مزید حصول علم کے لئے حرمین کا رخ کیا۔ اور استفادہ کی غرض سے عطار بن رباحؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۱۱۵ھ تک آپ کی خدمت میں رہ کر مستفید ہوتے رہے۔ عطار بن رباح کے علاوہ آپ نے حضرت عکرمہؒ کی بھی شاگردی اختیار کی اور ان سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ آپ جب مدینہ پہونچے تو اس وقت فقہائے سبعہ میں سے حضرت سلیمانؒ اور سالم بن عبد اللہؒ زندہ تھے۔ آپ ان دونوں بزرگوں کی بھی خدمت میں پہونچے اور ان سے حدیثیں روایت کیں۔ امام اوزاعیؒ اور مکحول شامیؒ جو شام کے امام المذہب کہلاتے تھے۔ امام صاحب نے مکہ ہی میں ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور حدیث کی سند لی۔ ان بزرگوں کے علاوہ آپ حضرت امام باقرؒ کی بھی خدمت میں حاضر ہوئے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں آپ نے ان سے حاصل کیں۔ ان کے علاوہ حضرت باقرؒ کے فرزند رشید حضرت جعفر صادق کی فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ غرضیکہ امام ابو حنیفہؒ کے شیوخ حدیث کی تعداد بے شمار ہے۔ ابو حفص کبیر کے مطابق امام صاحب نے چار ہزار لوگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ اپنے اساتذہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ نے حضرت حمادؒ کے زمانے ہی میں اجتہاد کا رتبہ حاصل کر لیا تھا لیکن استاد کے احترام میں دوسرا مسند درس بچھانے کے لئے آمادہ نہ ہو سکے۔ اور استاد کی خدمت میں ہی رہ کر علم کی خدمت کرتے رہے لیکن حضرت حمادؒ کے انتقال کے بعد لوگوں کے اصرار پر مسند درس پر بیٹھے۔ آغاز میں حمادؒ کے پرانے شاگرد ہی آپ کے حلقۂ درس میں بیٹھتے تھے لیکن چند روز میں وہ شہرت ہوئی کہ

کوڈکی اکثر درس گاہیں ٹوٹ کر ان کے حلقہ میں آملیں۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ خود آپ کے اساتذہ مثلاً امام اعمش، مسعر بن کدام وغیرہ آپ سے استفادہ کرنے لگے اور دوسروں کو آپ سے استفادہ کی ترغیب دلانے لگے۔ اسپین کے علاوہ ساری دنیا کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ سے مستفید ہونے لگے۔ اسلامی دنیا میں آپ کی عزت وشہرت کی وجہ سے خلیفۂ وقت کو آپ سے خطرہ محسوس ہونے لگا اور ملک کے مختلف انقلابات میں آپ کا نام سرفہرست رکھا جانے لگا۔ چنانچہ آپ کی عزت وشہرت کو اسلامی دنیا میں کم کرنے کے لئے آپ کے سامنے منصب قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے نہایت بے باکی سے اس کا انکار کر دیا چنانچہ آپ کو قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ خلیفۂ وقت نے آپ کو روزانہ دس درّے لگانے کا حکم دیا۔ لیکن آپ نے منصب قضاء کو قبول نہیں کیا۔ آخر کار خلیفہ نے مجبور ہوکر آپ کو رہا کر دیا۔ سنہ ۱۳۲ھ میں بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور آل عباس تخت وتاج کے مالک ہوئے۔ آل عباس نے بنوامیہ کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کروادیا۔ خلفائے بنوامیہ کی قبریں اکھڑوا کر ان کی ہڈیاں جلادیں اور اس قدر ظلم کیا کہ ہر طرف سے بغاوت کے آثار نظر آنے لگے۔ محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم نے آل عباس کے خلیفہ منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ نے ان بغاوتوں کی حمایت کی۔ خلیفہ منصور بغاوتوں کو کچلنے میں کامیاب ہوگیا اور امام صاحب کو دارالخلافۃ بغداد میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ منصور آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لئے وہ بہانہ تلاش کررہا تھا۔ اس نے امام صاحب کے سامنے عہدۂ قضاء پیش کیا آپ نے اسکو قبول کرنے سے معذرت کرلی۔ اس کی وجہ سے آپ کو پھر قید وبند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ منصور نے آپ کو سنہ ۱۴۶ھ میں قید کروادیا لیکن اس حالت میں بھی اسکو ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا چنانچہ سنہ ۱۵۰ھ میں امام صاحب کو بے خبری میں زہر دلوادیا۔ جب آپ کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں قضا کی۔ إنا للہ وانا الیہ راجعون۔

امام ابوحنیفہؒ سے صحاح ستہ میں حدیثیں بہت کم مروی ہیں باوجود اس کے کہ آپ اپنے وقت کے عظیم محدّث تھے اور بڑے بڑے اساتذۂ حدیث سے حدیث کی سندیں حاصل کی تھیں۔ اس کے چند اسباب ہیں۔

سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ محدث سے زیادہ فقیہ اور مجتہد تھے۔ مجتہد اور محدث کی حیثیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ محدث مواعظ، قصص، فضائل، سیر ہر قسم کی روایتوں کا استقصار کرتا ہے لیکن مجتہد کو صرف ان روایتوں سے بحث ہوتی ہے جس سے کوئی شرعی حکم مستنبط ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کی روایات احادیث کی کتابوں میں کم ہیں۔ یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ مغازی، قصص، سیر میں امام صاحب کی نظر وسیع نہ تھی لیکن احکام و عقائد کے متعلق آپ کو جو واقفیت اور تحقیق حاصل تھی اس سے انکار کرنا صرف کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کا خیال تھا کہ صحیح حدیثوں کی تعداد بہت کم ہے۔ امام شافعیؒ نے صاف لفظوں میں امام ابوحنیفہؒ کے خیالات ظاہر فرمائے ہیں امام بیہقیؒ نے روایت کی ہے ایک دن ہرم قرشی نے امام شافعیؒ سے کہا کہ آپ وہ حدیثیں لکھوائیے جو رسول اللہؐ سے ثابت ہیں انہوں نے جواب دیا کہ "ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں کم ہیں کیونکہ ابوبکر صدیقؓ نے جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں ان کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں ہے عمر بن الخطابؓ جو رسول اللہؐ کے بعد مدت تک زندہ رہے ان کی روایت سے پچاس حدیثیں بھی ثابت نہیں۔ حضرت عثمانؓ سے بھی ایسے ہی روایتیں مروی ہیں۔ حضرت علیؓ اگرچہ لوگوں کو حدیث سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے لیکن ان سے بھی کم حدیثیں مروی ہیں۔ کیونکہ وہ مطمئن نہیں رہے۔ ان سے جو حدیثیں مروی ہیں اکثر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کی ہیں۔ ان لوگوں کے سوا اور صحابہ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں لیکن اہل معرفت کے نزدیک وہ تمام روایتیں صحیح سند سے ثابت نہیں (۲)

علم حدیث میں امام صاحبؒ کی سب سے بڑی خدمت فن حدیث کے سلسلے میں ہے امام صاحب نے درایت (۳) کے اصول دریافت کئے اور ان کو احادیث کی تحقیق و تدقیق میں عملاً برت کے دکھایا۔ ہمارے علمار نے روایت پر جسقدر توجہ کی ہے اس کی نظیر دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن اصول درایت کو دریافت کرنے کا سہرا امام ابوحنیفہؒ کے سر ہے جنکی نگاہیں ان باریکیوں تک پہونچ گئیں جو صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ نظر آتے تھے۔ امام صاحب

نے درایت کے جو اصول دریافت کئے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں ایسی حدیثیں جنمیں ناممکن اور محال واقعات بیان کئے جاتے ہیں امام صاحب کے سامنے جب پیش کی جاتی تھیں تو آپ اسکا اسی اصول کی بنیاد پر انکار کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث امام صاحب کے سامنے پیش کی گئی کہ ایک روز حضرت علیؓ کی نماز عصر قضا ہو گئی تھی اس کے لئے آپؐ نے دعا فرمائی اور آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر طلوع ہو گیا اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھی۔ اس حدیث کو سن کر آپ نے اسکو حدیث رسول ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ ناممکن اور محال ہے۔

(۲) جو واقعات لوگوں کو دن ورات پیش آیا کرتے ہیں ان کے متعلق اگر رسول اللہؐ سے ایسی روایت منقول ہو جو اخبار آحاد کے درجہ سے زیادہ نہ ہو تو وہ روایت مشتبہ ہوگی امام ابو حنیفہؒ نے یہ اصول اس وجہ سے بنایا کہ جو واقعات تمام لوگوں کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں اس کے متعلق اگر رسول اللہؐ نے کچھ فرمایا ہوگا تو تمام لوگوں کو معلوم ہوگا۔ اس روایت کا ایک آدھ شخص تک محدود رہنا درایت کے خلاف ہے مثال کے طور پر جماعت سے نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے۔ اس حدیث کا راوی اگر صرف ایک شخص ہوتا تو یہ حدیث مشتبہ ہو جاتی کیونکہ یہ تمام لوگوں سے متعلق ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ حدیث کے مقابلے میں قیاس کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے امام محمدؒ اس بحث کے ذیل میں کہ جو شخص رمضان میں بھول کر کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور قضا لازم نہیں آتی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ آثار کے ہوتے ہوئے رائے کوئی چیز نہیں پھر امام ابو حنیفہؒ کا خاص قول نقل کرتے ہیں کہ "لَوْلَا مَا جَاءَ فِیْ هٰذَا مِنَ الْاٰثَارِ لَاَمَرْتُ بِالْقَضَاءِ" اگر اسکے بارے میں آثار موجود نہ ہوتے تو میں قضا کا حکم دیتا۔

تعلیقات وحواشی

(۱) محمد بن یوسف الدمشقی، عقود الجمان فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان، بحوالہ سیرۃ النعمان، علامہ

شبلی نعمانی، مکتبہ برہان اردو بازار دہلی، ۱۹۶۳ء ص ۲۳، ۲۴۔

(۲) رازی، فخرالدین، مناقب الشافعی، فصل ثامن، شرح مذہب الشافعی۔

(۳) درایت کا مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیتیں، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے اگر اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کی صحت بھی مشتبہ ہوگی یعنی یہ احتمال ہوگا کہ روایت کے تغیرات نے واقعہ کی صورت بدل دی ہے۔ اس قسم کے قواعد حدیث کی تحقیق و تنقید میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں انھیں کا نام اصول درایت ہے۔

بقیہ: وفیات

ادارہ ندوۃ المصنفین و ماہانہ "برہان" کو مولانا شمس الرحمٰن نوید عثمانی کی ناگہانی وفات پر بڑا دکھ و صدمہ ہوا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا مرحوم کو بال بال مغفرت فرما کر اپنی جوار رحمت میں مقام عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

راقم الحروف ادارہ ندوۃ المصنفین کی طرف سے خود اپنے آپ سے اور متعلقین سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔ بارگاہ رب العزت میں صبر جمیل کی استدعا ہے۔

(پہلی قسط)

خلیلؔ ابن احمد فراہیدیؔ

شاہد اسلم، ریسرچ اسکالر، علی گڑھ

مختصر تعارف: مشہور و معروف نحوی خلیل ابن احمد بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی عربی ادب کی تاریخ میں خلیل کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ خلیل ابن احمد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم عروض کو ایجاد کیا اور اسکی پندرہ بحریں نکالیں نیز شعر کے اوزان بحور اور اصطلاحات عروض معین کیے اور اس کا طریقہ رائج کیا جسکو عربی کے علاوہ فارسی، ترکی اور اردو میں بھی اختیار کیا گیا۔

اور وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے لغت کے اوپر کچھ لکھا حلقہ احباب علم و ادب میں موضوعات ریاضی علم وصفی کے مصنف کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

خلیل ابن احمد حدیث نبویہ اور فلسفہ کے جاننے والے ایک دیندار اور پرہیزگار آدمی تھے۔ خود داری، بلند اخلاقی، زندہ دلی، خوش خلقی اور دور بینی، پاکبازی، سخاوت، دریادلی خلیل احمد کے کردار کی چند اہم خصوصیات ہیں۔

خلیل ابن احمد نحوی کئی گراں قدر اعلیٰ و مفید کتابوں کے مصنف ہیں جنکو عربی ادب کا قیمتی [illegible] تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی لیے خلیل کا نام بھی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

[illegible]

[illegible]

اس کی نسبت میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے راویوں نے مختلف طریقے سے اس کی نسبت بیان کی ہے۔ یوسف ابن احمد نے اپنی کتاب نور القبس میں لکھا ہے کہ خلیل ابن احمد کے نسب کے بارے میں ان کے والد کے نام کے علاوہ اور کسی کے صحیح نام کا پتہ نہیں چلتا خلیل کی نسبت کے سلسلے میں ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں خلیل کو "فراہیدی" ویقال "الباھلی" لکھا ہے اور ابن قتیبہ نے فراہیدی الیحمدی لکھا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خلیل ان ابنائے ملوک عجم کی اولاد سے جنکو نوشیرواں عادل کے حکم سے یمن منتقل کر دیا گیا تھا۔

"الوفیات" میں اس کی نسبت کو "الفراہیدی" "الفرہودی" "الفرہود" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

خلیل ابن احمد بصرہ میں خلیفہ عمر ثانی کے عہد میں پیدا ہوا اور اسکی پیدائش ۱۰۰ھ بتائی جاتی ہے علمار نسب کا گمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کسی کا نام احمد رکھا گیا تو وہ خلیل کے والد ہیں اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کا نام احمد نہیں رکھا گیا یعنی ان کے والد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور کسی کا نام احمد نہیں پڑا اس کی تائید انباری ابن ندیم، ابن خلقان نے بھی کی ہے۔

الاعلام میں اس طرح مذکور ہے:

لم یسمّ احدٌ باحمد بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل والد الخلیل۔

حالات زندگی:

خلیل ابن احمد یہ اپنے زمانے کے بہت بڑے نحوی فقیہ اور لغوی گذرے ہیں اہل عمان سے تعلق رکھتے تھے؛ بہتر ۷۴ سال کی عمر میں بصرہ میں وفات پائی خلیل نے بلند پایہ علمار ایوب سختیانی عاصم الاحول، عوام بن حوشب سے فقہ ولغت وحدیث کی تعلیم حاصل کی پھر عرب کے دیہاتوں میں چلے گئے جہاں فصیح عربی اور غریب الفاظ کا ذخیرہ جمع کیا حتیٰ کہ علوم کی اس بلندی پر پہنچے کہ جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ خلیل ابن احمد شروع میں اباضی مذہب سے تعلق رکھتے تھے یہ فرقہ عبداللہ بن اباض کیطرف منسوب کیا جاتا ہے یہ خارجیوں کا ایک فرقہ ہے جو حضرت علیؓ کے مخالف ہوگیا تھا۔ افریقہ میں یہ مذہب بہت تیزی کے ساتھ پھیلا یہاں تک کہ دھیرے دھیرے

وہ ایک قومی مذہب بن گیا یہ فرقہ اہل سنت والجماعت کا شدید مخالف تھا یہاں تک کہ یہ لوگ گمان کرتے تھے کہ تہتر فرقوں میں صرف انہیں کا فرقہ ہے جو ہدایت یافتہ ہے جسے نجات ملے گی اور دوسرے فرقے والوں کو کافر سمجھتے تھے۔ لیکن بعد میں خلیل ابن احمد نے اپنے استاد ایوب کی نصیحت سے اس فرقہ کو چھوڑ دیا اور اہل سنت والجماعت کے مسلک کو اختیار کر لیا خلیل ابن احمد بہت ہی محتاط پرہیزگار اور متقی آدمی تھے گناہ و شبہات سے بہت زیادہ بچتے تھے اور بہت ہی سادہ فقیروں جیسی زندگی گذار رہے تھے وہ ہمیشہ مطالعہ میں مشغول رہتے ان کا زیادہ تر وقت گھر ہی میں گذرتا نہ کھانے کی فکر اور نہ پینے کی فکر وہ اس دنیا سے بالکل بے نیاز رہتے انھیں اس دنیا کی کوئی رغبت نہیں تھی ان کی بے رغبتی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار سلیمان بن علی (والی سندھ) نے اپنے ایک قاصد کو خلیل کے پاس بھیجا تاکہ وہ انکے لڑکے کو پڑھائیں خلیل نے قاصد کے سامنے اس وقت جو گھر میں موجود تھا پیش کر دیا اور فرمایا کہ جا کر سلیمان سے کہو کہ جب تک مجھے اس جیسی سوکھی روٹی ملتی رہے گی مجھے سلطان کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

خلیل نے اپنے پیچھے بہت سے یکتائے روزگار اور نامور شاگرد چھوڑے جنھوں نے آگے چل کر بہت بڑے بڑے کام انجام دیکر اپنے فن میں مہارت حاصل کی اور اپنے نام کے ساتھ خلیل کو بھی عزت و دوام بخشا اور نام کمایا۔ ان کے خاص شاگردوں میں سیبویہ، اصمعی نضر بن سہیل، لیث بن مظفر ہیں ابن سلام جمحی نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے۔ اور تقریباً سبھی لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ خلیل بن احمد عربی میں علم عروض اور اس کے قواعد کے واضع ہیں کہا جاتا ہے کہ خلیل نے مکہ میں دعا کی کہ اے اللہ مجھے ایسا علم عطا فرما کہ جس پر مجھ سے پہلے کسی نے سبقت نہ کی ہو چنانچہ اللہ نے انکی دعا قبول کر لی اور عروض کا علم عطا کیا۔

ابن خلقان لکھتے ہیں:

"قیل ان الخلیل دعا بمکۃ ان یرزق علما لم یسبقہ احد الیہ ولا یوخذ الا عنہ فلما رجع من حجہ فتح علیہ بعلم العروض ولہ معرفۃ بالایقاع والنغم وتلک المعرفۃ احدثت لہ علم العروض فانہما متقاربان فی الماخذ"

وہ یکسوئی سے علمی تحقیق وتصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں لگے رہے اور اسی راہ میں اپنی جان قربان کردی ان کی موت کے سبب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ میں حساب کا ایک ایسا آسان طریقہ ایجاد کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد ایک چھوٹا بچہ بھی حساب میں دھوکہ نہیں کھائے گا اسی فکر میں وہ مسجد میں داخل ہوئے اور بے خیالی میں ایک ستون سے زور سے ٹکرائے کہ ان کا بھیجا ہل گیا اور اسی میں موت واقع ہو گئی۔

خلیل بن احمد کا علمی مقام اور علمی خدمات :

تذکرہ نویسوں اور راویوں نے خلیل کے حالات بہت کم بیان کئے ہیں چند اقوال وحکایتوں پر اکتفا کیا ہے کہ اس جیسا جلیل القدر فاضل شخص کسی قوم میں صدہا سال کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

خلیل کو صحت قیاس نحوی مسائل کے استنباط اور ان کی توجیہہ وتعلیل میں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ عربی نحو، لغت، عروض کی بنیاد اس شخص نے رکھی۔

تہذیب التہذیب میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے جس سے خلیل کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اس کی عبارت اس طرح ہے۔

یروی من سفیان انہ قال من احب ان ینظر الی رجل خلق من الذھب فلینظر الی خلیل بن احمد۔

علامہ سیوطی ایک جگہ فرماتے ہیں : "کان الناس یقولون لم یکن من العربیۃ بعد الصحابۃ ازکی منہ" یعنی خلیل سے زیادہ عابد، زاہد، پاکباز صحابہ کے بعد کوئی نہیں ہے۔ اور نحو وعروض میں اپنی مثال آپ ہیں۔

عربی کی پہلی لغت جس میں عربی کے مادے محصور ہیں "کتاب العین" وہ خلیل ہی کیطرف منسوب ہے فقہاء کا کہنا ہے کہ خلیل کی جلالت وبزرگی اپنی جگہ پر ثابت ہے اور اسی طرح لغت نحو تعریف اور عروض میں اس کے بلند وبالا ہونے پر متفق ہیں۔ علم عروض کے وہ موجد ہیں اور رسم علم انہیں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

بقول حمزہ بن الحسن اصبہانی کے "دولت اسلام نے خلیل سے بہتر ان علوم کا ایجاد کرنے والا

پیدا نہیں کیا جن کا علم ان کے پاس نہیں تھا اور اس دعوے کی دلیل علم عروض سے واضح ہوتی ہے۔
یہ پہلا شخص ہے جس نے غیر زبان سیکھے بغیر اور آلات موسیقی کا علم رکھے بغیر اس موضوع پر پہلی کتاب تصنیف کی اور انہوں نے شاعری کے پندرہ اوزان مقرر کئے اور انھیں پانچ پانچ دائروں میں تقسیم کیا وہ انھیں حرکات وسکنات کے اعتبار سے الگ الگ کرتے اس خدمت کو انجام دینے میں وہ اپنی تمام تر توجہات مبذول کر دیتے تھے اور گھنٹوں اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں اور سر کو جنبش دیتے تھے ایک بار اس حالت میں ان کے لڑکے نے انھیں دیکھ لیا کہ عجیب عجیب حرکتیں کر رہے ہیں تو اس نے سمجھا کہ میرا باپ پاگل ہو گیا ہے فوراً وہ لڑکا کمرے سے باہر نکل آیا اور لوگوں کو بلا کر لایا جب لوگوں نے خلیل سے کہا کہ تمہارا لڑکا اس طرح کہہ رہا ہے تو خلیل نے یہ اشعار پڑھے۔

لو کنت تعلم ما اقول عذرتنی　　او کنت تعلم ما تقول عذلتکا
لکن جهلت مقالتی فعذلتنی　　علمت انک جاهل معذرتکا

ابن معتز نے روایت کیا ہے کہ یہ علم اس نے صرف اس طرح اختراع کیا ہے کہ وہ ٹھٹھوں اور بازاروں سے گزر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ہتھوڑے کے گرنے کیوجہ سے طشت پر ایک آواز پہونچی جسکو سنکر اس نے یہ علم نکالا اگرچہ ہتھوڑے اور طشت میں نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی بیان جن سے ان چیزوں کی بناوٹ کے سوا کوئی اور بات ذہن میں آئے۔

انھوں نے مذکورہ بالا علم کو اختراع کر کے وہ چیز وجود میں لائی جو خلق عالم سے لیکر اس زمانے تک کسی کے بھی ذہن میں نہیں آئی تھی۔

خلیل وہ پہلا شخص ہے جس نے عربی زبان کو باقاعدہ ضبط کیا اور تدوین لغت کی طرح عربی رسم الخط کو موجودہ شکل بخشی۔

چنانچہ اس سلسلہ میں جرجی زیدان لکھتے ہیں: "الخلیل اسبق العرب الی تدوین اللغة وترتیب الفاظها علی حروف المعجم قبل الاصمعی وسیبویه وسواهما من الادباء والنحاة۔"

اس فن کے سلسلہ میں خلیل کی ایک کتاب جو کتاب العین کے نام سے جانی جاتی ہے اس میں خلیل نے لغت کے ان احکام الفاظ و قواعد اور اس کی شرطوں کو جمع کیا ہے جو کہ اس زمانہ میں معروف و مشہور تھے اور اسکو حروف ہجار پر مرتب کیا اس کتاب کی خالص بات یہ ہے کہ انہوں نے حروف کی ترتیب میں اس کے مخارج کا خیال رکھا اور اسی اعتبار سے اس کی ترتیب دی حروف حلقیہ سے شروع کیا پھر حروف لسانیہ پھر حروف سنانیہ اس کے بعد آخر میں حروف شفویہ کو لکھا ابتدا ر حرف عین سے کی اور انتہا حروف علت سے کی۔

خلیل ابن احمد غضب کا عالم ذکی اور زود فہم انسان تھا اس زمانہ میں لوگ یہ کہتے تھے کہ عرب میں صحابہ کے بعد خلیل سے زیادہ ذکی اور زود رفہم انسان نہیں پیدا ہوا۔ اسکی ذکاوت کے سلسلے میں علامہ سیوطی نے اپنی کتاب "جفیۃ الوعاۃ" میں ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کی انکی ذکاوت پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں " دیقال انہ کان عند رجل دواءٌ لظلمۃ العین ینتفع بہ الناس فمات واحتاج الناس الیہ، فقال الخلیل ان نسخۃ معروفہ قالوا لا قال فھل لہ آنیہ کان یعملہ فیھا قالوا نعم قال جئونی بھا نجا ؤوہ فجعل یشم الاناء ویخرج نوعاً نوعاً حتی اخرج خمسہ عشر نوعاً ثم سئل عن جمعھا ومقدارھا فعرف ذالک فعملہ واعطاہ الناس فانتفعوا بہ، ثم وجدت النسخہ فی کتب الرجل فوجد والاخلاط ستہ عشر خلطا کما ذکر الخلیل لم یفتہ منھا الا خلط واحد"

خلیل آخری عمر تک بڑی لگن اور محبت اور یکسو رتن ہو کر تصنیف و تالیف، درس و تدریس میں لگا رہا اور بہت سے نامور و مشہور شاگردوں کو پیدا کیا جنھوں نے آگے چلکر خلیل کا نام بھی روشن کیا۔ خلیل نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں جن میں "کتاب العین" سب سے زیادہ معروف و مشہور ہے۔

خلیل ابن احمد کے قدیم ترین تراجم :

ابن خلقان کے قول کے مطابق خلیل ابن احمد قبیلہ ازد میں یحمد کیطرف منسوب ہے خلیل ابن احمد جلیل القدر، تیز طبع اور ذہین ہونے کے ساتھ شاعر اور نحو کا امام تھا۔ اپنی اکھیں

خداداد صلاحیتوں کیوجہ سے خلیل نے علم عروض کو ایجاد کیا اور اسکو پانچ قسموں میں محصور کرکے اس کی پندرہ بحریں نکالیں۔

نضر ابن شمیل فرماتے ہیں کہ شعراء جب خلیل کے پاس سے گذرتے تو نحو میں گفتگو کرتے تھے خلیل نے سوچا کہ ان کے لئے ایک اصل کی ضرورت ہے اس کے بعد وہ اس سلسلہ میں سوچتا رہا غور و فکر کرتا رہا یہانتک کہ اس نے عروض کو وضع کیا وہ اپنے گھر کے ایک کمرہ میں تنہا گھس گیا اور ایک طشت کو سامنے رکھ کر اسے لکڑی سے پیٹنا شروع کردیا تو اس سے جو آواز نکلتی تو خلیل اسی کے ساتھ اپنی آواز کو ملاتا اور یہ کہتا۔ فاعلن، مستفعلنُ۔ فعولن چنانچہ اس کی اس عجیب وغریب حرکتوں کو ان کے بھائی نے دیکھ لیا اور سمجھا کہ خلیل پاگل ہوگیا ہے۔ اور بقول ابن معتز اسکے اختراع کا سبب یہ تھا کہ خلیل بصرہ کے دھوبی محلہ میں گیا تو وہاں اس نے کپڑے پیٹتے وقت مختلف قسم کی آوازیں اٹھتی سنیں اس کے سننے کے بعد اس علم میں غور کیا اور کہا کہ میں اس سے ایک ایسا اصول علم وضع کروں گا جسکو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں وضع کیا ہوگا چنانچہ انھوں نے اسی آواز کی بنیاد پر علم عروض وضع کیا نیز خلیل ذہین اور تیز طبع شاعر تھا۔ الحان ونغمہ میں ایک مشہور مستند کتاب "کتاب العین" کا مصنف تھا جس میں انہوں نے کلام عرب کے تمام مادے جمع کردیئے اور اسی کے ساتھ وہ اپنی ذکاوت وفہم کیوجہ سے عربی کے ذریعہ اور زبانوں کا مطلب بھی نکال لیا کرتا تھا۔

ابن معتز نے ابو عباس سے روایت کی ہے کہ ایک بار لیث جو کہ اپنے زمانہ کا بے مثل کاتب نحو اور شعروادب میں صاحب بصیرت تھا خلیل ابن احمد سے ملا تو اس نے خلیل کو علم وادب کا سمندر پاکر اسکو انعام واکرام دیا۔ خلیل ابن احمد نے چاہا کہ لیث کی حیثیت کے مطابق کوئی ہدیہ پیش کرے۔ اس نے دیکھا کہ لیث کے یہاں مال و دولت کی فراوانی ہے مال کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں اس لئے اس کی خدمت میں کوئی لطیف تحفہ پیش کیا جائے اور ایسی ہی چیز اسکی خوشنودی اور رضا کا باعث ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر انہوں نے "کتاب العین" جیسی اعلیٰ کتاب کی تصنیف کی زحمت اٹھائی اور اسکو آراستہ و پیراستہ کرکے اعلیٰ ہیئت اور بہترین خط سے مزین کرکے لیث کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کی تو لیث اس ہدیہ سے بہت خوش ہوا۔ اور

خلیل کی خدمت میں ایک لاکھ درہم کا ہدیہ پیش کیا اور اس کے باوجود معذرت چاہی۔ لیث کو یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ وہ دن رات اس کے مطالعہ میں مصروف رہنے لگا وہ نہ تو اس مطالعہ سے گھبراتا اور نہ ہی اس کے مطالعے سے تھکتا یہاں تک کہ اس نے نصف کتاب زبانی یاد کرلی۔

لیث اس کتاب کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا وہ کسی بھی حال میں اس کتاب سے غافل نہیں ہوتا تھا اس کے دل میں اس کتاب کی قدر و منزلت کتنی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بحسن و خوبی ہوجائے گا۔ (بقیہ: آئندہ)

ترجمہ "تذکرہ علمائے ہند" پر ایک نظر

آخری قسط

ڈاکٹر غلام یحیٰی انجم، استاد، شعبۂ تقابل ادیان، ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۲

وحاشیہ بر دوحہ "شمس بازغہ" از تصانیف اوست" (۱)

مترجم نے اس کا ترجمہ" دوحۂ شمس بازغہ" کے نام سے کیا ہے حالانکہ دنیا میں اس نام کی کوئی کتاب ظہور میں نہیں آئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملا محمود جونپوری نے جو "شمس بازغہ" کے مصنف ہیں مادہ کی حقیقت کے باب میں ایک کتاب بعنوان" دوحۃ المیادۃ فی حقیقۃ المادۃ" لکھی تھی جس پر بہت سے علماء نے حواشی لکھے اس میں مولوی ظہور اللہ بھی تھے مگر پروفیسر موصوف نے حاشیہ بر دوحۃ المیادہ مصنفہ صاحب شمس بازغہ کو دوحہ شمس بازغہ بنا دیا۔

پروفیسر موصوف نے علامہ فضل حق خیرآبادی کی تصنیفات میں" الروض کو بھی شمار کرایا ہے۔ (۲)

الروض بالکل مبہم لفظ ہے اس کے معنی باغ ہیں بہت سے علماء نے الروض کی ترکیب سے اپنی اپنی مصنفات کے نام رکھے ہیں جیسے الروض الانیف للحکمی، الروض الانیق للبکری الروض الباسم للخربی، الروض البھیج لحفید ابن مرزوق، الروض الوائض للبکری اور الروض لمعطار للبرزنجی وغیرہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے مسئلہ حقیقت وجود پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام" الروض المجود" تھا پروفیسر موصوف نے اس میں سے المجود نظر انداز کر کے محض" الروض" رہنے دیا اس میں پروفیسر صاحب کی کیا حکمت پنہاں تھی کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

میر محمد زاہد ہروی کی اعلیٰ تصانیف میں جن کتابوں کو شامل کیا ہے ان میں" شرح مواقف" کو بھی نام لیا ہے (۳) حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ" شرح مواقف" میر سید شریف کی تصنیف ہے جس کے

موقف دوم "امورِ عامہ" پر میرزاہد ہروی نے حاشیہ لکھا تھا۔ اسی وجہ سے یہ حاشیہ کبھی میرزاہد امور عامہ، کبھی میرزاہد شرح مواقف، اور کبھی حاشیہ زاہدیہ علی شرح المواقف" کہلاتا ہے۔

یہ ایک علمی تحقیق تھی اس میں لغزش کیلئے پروفیسر مترجم تو مرفوع القلم ہیں البتہ یہ ناقابل معافی کوتاہی ہے جو جناب مولانا مصحح صاحب سے سرزد ہوئی ہے نام نہاد "تصحیح" کا معاوضہ طلب کرنے کی جلدی میں انہوں نے اس فاحش غلطی کی نشاندہی کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون۔

مترجم موصوف نے شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کی تصانیف میں چند کتابوں کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔

(۹) رسالہ (۱۰) تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیہ۔

" رسالہ" انتہائی مبہم لفظ ہے" ہر چھوٹی کتاب رسالہ کہلاتی ہے۔ سوال یہ ہے اس رسالہ کا نام کیا تھا؟ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیہ" کسی مطبوعہ کتاب کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اگر واقعتاً شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے "تشریح الافلاک عاملی پر حاشیہ لکھا تھا تو لکھنا چاہیئے تھا "حاشیہ (فارسی) بر تشریح الافلاک عاملی" ویسے شیخ بہاء الدین عاملی نے ہیئت میں ایک رسالہ بعنوان "تشریح الافلاک" لکھا تھا جس پر شاہ کلیم اللہ کے برادر زادہ مولانا امام الدین ریاضی نے "التصریح" کے نام شرح لکھی تھی اور یہ کتاب ان کے زمانہ سے تا ایں دم عربی مدارس کے درس میں داخل ہے اور بہت سے علماء نے اس پر حواشی لکھے ہیں۔ متن پر عموماً حاشیہ نہیں لکھا جاتا اس کی توضیح طلب مقامات کی تشریح کے لئے شرح لکھی جاتی ہے البتہ شرح پر حاشیہ لکھا جاتا ہے۔

مترجم موصوف نے شیخ امان اللہ بانی پتی کی تصانیف میں "شرح لوائح جامی" گنائی ہے (۴) ان حاجی صاحب کا نام کیا تھا؟ مزید تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

ظاہر ہے جو "عقل کل" درس میں متداول کتابوں کے صحیح نام سے واقف نہ ہو اس سے یہ توقع کرنا کہ مشہور مصنف کتاب سے جو تسامحات ہوئے تھے ان کی تصحیح کرے یا جو باتیں مصنف کے زمانہ

میں مشہور و معروف تھیں مگر آج جن کی نوعیت بدل گئی ہے، اسے شرح وبسط کے ساتھ متعارف کراتے ایسی ہی غیر دانشمندانہ توقع ہوگی جس طرح کوئی بھینس کے آگے بین بجانے کے بجائے خود اس سے بین بجانے کی آس لگائے۔ بہر حال اس قسم کا کام کرنے والوں کے لئے بطور نمونہ دو ایک مثالیں دیدی جائیں تو شائد بیجا نہ ہوگا۔

(۵) پروفیسر موصوف نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصانیف کے ضمن میں لکھا ہے" الدرۃ الثمینۃ فی اثبات الواجب تعالیٰ۔ خود مصنف (رحمٰن علی) نے صفحہ ۱۱ پر لکھا تھا الدرۃ الثمینۃ فی اثبات الواجب تعالیٰ۔

" الدرۃ الثمینۃ "، جسے رسالہ خاقانیہ بھی کہا جاتا ہے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی ہی کا نہیں بلکہ ہندوستانی عبقریت کا ایک قابل فخر شاہکار ہے جس نے ایران کے اندر ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کو بحال کردیا تھا۔ مگر اس کا موضوع اثبات واجب (یا خدا کے وجود کا ثبوت) نہیں ہے۔ اس مسئلہ سے تو اس رسالہ میں قطعاً تعرض نہیں کیا گیا اس کا موضوع ہے "مسئلہ علم باری" (یا زیادہ واضح لفظوں میں اس بات کا ثبوت کہ باری تعالیٰ کو کلیات کے ساتھ ساتھ جزئیات متغیرہ مادیہ کا بھی علم ہے) اور یہ ان تین مسئلوں میں سے ایک مسئلہ ہے جس کا انحصار حسب تصریح امام غزالی کفر ہے۔

(۶) مترجم موصوف نے مولوی ببر دہلوی کے تذکرے کے ضمن میں لکھا ہے۔ سائل نے ان سے پوچھا کہ سات ستاروں کے علاوہ جملہ کواکب فلک الافلاک پر ثبت ہیں" مصنف مولوی (رحمٰن علی) نے لکھا تھا۔

" پرسیدم ماسوائے سبعہ سیارہ جملہ کواکب بر فلک الافلاک ثبت اند"

حالانکہ ہیئت قدیمہ کے نزدیک فلک الافلاک یا نویں آسمان میں کوئی ستارہ ثبت نہیں ہے اسی وجہ سے اسے فلک اطلس کہتے ہیں جملہ کواکب آٹھویں آسمان میں مرکوز ہیں اسی لئے اسے فلک الثوابت یا فلک البروج کہتے ہیں۔ مزید تفصیل غیر ضروری ہے۔

(۷) بعض باتیں قدماء کے لئے معروف تھیں مگر آج نہ صرف تعلیم جدید کے فارغین کے لئے بلکہ قدیم مدارس عربیہ کے طالب علموں کے لئے بھی لاطینی و عبرانی بن گئی ہیں مثلاً

"وایشاں از ملازین الدین وایشاں از قاضی بیضاوی وایشاں را سند لیست تا ابوالحسن اشعری در کتب تواریخ مشہور و معروف" (۷)

پروفیسر مترجم نے اس کی ہندی کی چندی کر دی۔

"اور انہوں نے ملا زین الدین سے اور انہوں نے قاضی بیضاوی سے اور ان کی سند ابوالحسن اشعری تک پہونچتی ہے جو کتب تواریخ میں مشہور و معروف ہے"

مگر آج خود قاضی بیضاوی اور امام ابوالحسن اشعری کو ان کے اخلاف نہیں جانتے کہ نہ صرف اسلامی بلکہ عالمی فکر کی تاریخ میں ان کا کیا مقام ہے اور فکر انسانی کا دھارا جو اقدم عصور سے بہتا چلا آرہا ہے اور قیام قیامت تک بہتا چلا جائے گا یہ طویل دھارا امام ابوالحسن اشعری سے قاضی بیضاوی تک کن کن منزلوں میں ہوتا ہوا پہنچا۔

پروفیسر مترجم کا مبلغ علم اور جس ادارہ کے زیر سرپرستی انہوں نے علم و تحقیق کی ریڑھ ماری ہے۔ اس کی ذمہ داری تو کسی توضیح مزید کی مقتضی نہیں ہے البتہ آئندہ جو حضرات اس کڑی کمان کو زہ کرنے کی کوشش فرمائیں وہ ان کھانچوں کو بھرنے کے لئے ضرور کوشش کریں۔

۲۔ پروفیسر مترجم نے مفتی جمال خاں دہلوی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

"انہوں نے مفتاح کی دونوں شرحوں پر محاکمہ کیا ہے۔ چالیس مرتبہ کتاب عضدی کا اول سے آخر تک درس دیا" (۸)

اصل مصنف کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"بر شرحین مفتاح محاکمہ کردہ و کتاب عضدی را چہل مرتبہ از اول تا آخر درس دادہ" (۹)

ضرورت تھی کہ مفتاح۔ اس کی دونوں شرحوں اور کتاب عضدی کا اگر مبسوط نہیں تو مختصر ہی تعارف کرا دیا جاتا۔ مفتاح سکاکی کی مفتاح العلوم کا مختصر نام جو تلخیص المفتاح بالخصوص اس کی شرح مختصر المعانی اور مطول پہلے فنون بلاغت کے نصاب میں متداول تھی۔ بے شمار علماء نے اس کی شروح لکھیں جن میں سے نویں دسویں صدی میں دو شرحوں کا زیادہ رواج تھا۔ ایک علامہ سعدالدین تفتازانی کی دوسری میر سید شریف۔ یہ دونوں فاضل معاصر تھے اور دونوں میں معاصرانہ چشمک ہی نہیں بلکہ حریفانہ رقابت تھی اس لئے دونوں نے اپنی اپنی شرح میں

...تصنیف ہے کی تعلیق کی ہے۔ مفتی جمال خاں دہلوی نے ان دونوں کے اقوال پر محاکمہ لکھا۔
عضدی قاضی عضدالدین ایجی (م ۷۵۶ھ) کی اصول فقہ میں معیاری کتاب ہے اس کا متن
ابن حاجب مالکی نے لکھا تھا اور کسی زمانہ میں یہ اس فن کا شاہکار محسوب ہوتا تھا اس کے غوامض
کو حل کرنے کے لیے بہت سے علمائے کبار نے شروح لکھیں مگر

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

قبول عام کا شرف قاضی عضد کی شرح کو حاصل ہوا اور یہ بعد میں اسلامی دنیا بالخصوص
ہندوستان میں "عضدی" کے نام سے مدارس عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں شامل ہوئی۔

۳۔ مصنف رحمٰن علی نے حافظ امان اللہ بنارسی کی تصانیف کے ضمن میں لکھا تھا۔
"و بر حاشیہ میر باقر علی استرآبادی و ملا محمود جونپوری در مسئلہ حدوث دہری محاکمہ
تحریر کردہ" (۱۰)

پروفیسر مترجم نے اس کے ترجمہ میں لکھا ہے۔
"مباحثہ میر باقر علی استرآبادی اور ملا محمود جونپوری پر حواشی لکھے ہیں۔ مسئلہ حدوث دہر
کے متعلق ایک محاکمہ تحریر کیا ہے (۱۱)

اس ترجمہ سے ادارہ ہسٹاریکل سوسائٹی کے سربراہ اور دوسرے اہل الرائے کو اندازہ لگا لینا
چاہیے کہ اس وقت نہونا چاہیے کہ محض چاپلوسی کے بل بوتے پر خود کو کسی اہم فریضہ کی ادائیگی کا اہل ظاہر
کرنے والوں کے انتخاب کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

مصنف رحمان علی نے متعلقہ موضوع پر ایک کتاب بتائی تھی (اور واقعتاً ہے بھی ایک) یعنی محاکمہ
بر مباحثہ میر باقر داماد و ملا محمود جونپوری "مسئلہ حدوث دہری"
مگر پروفیسر صاحب نے اس ایک کے دو بتائے (کم از کم خالی الذہن قارئین و طلبہ تو دھوکا کھا جائیں
گے) یعنی۔

۱۔ مباحثہ میر باقر علی استرابادی اور ملا محمود جونپوری۔
۲۔ مسئلہ حدوث دہر کے متعلق ایک محاکمہ۔

اس موقع کے لیے کہا گیا تھا کہ "یک من علم را دہ من عقل می باید"

بہرحال مسئلہ حدوث دہر۔ ہمارے اسلاف کی ان جگر کاویوں میں سے ہے جن کے متعلق کسی کہنے والے نے کہا ہے۔

گہ ہے گہ ہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اور علامہ اقبال کی رائے میں تو مسئلہ زمان (جس کا مسئلہ حدوث دہر ایک حل ہے) ملت اسلامیہ کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آئندہ جو اہل قلم اس قسم کے موضوع پر قلم اٹھائیں انھیں چاہیئے کہ اس کتاب (محاکمہ برمسئلہ حدوث دہر) پر نوٹ دینے سے پیشتر اسلامی فکر میں مسئلہ زمان کے ارتقاء پر ایک مختصر جائزہ پیش کریں۔ میر باقر داماد نے "افق المبین" میں جو "حدوث دہر" کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اسے بالاختصار مگر واضح طور پر بیان کریں اس کے بعد ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں اس سے جو اختلاف کیا ہے۔ اسے اگر ہو سکے تو تفصیلی طور پر نقل فرمائیں صرف اسی طرح حافظ امان اللہ بنارسی کے اس رسالہ "محاکمہ برمباحثہ میر باقر داماد و ملا محمود جونپوری در مسئلہ حدوث دہر" کا تعارف باحسن وجوہ ممکن ہو سکے گا۔

یہ ایک مختصر خاکہ ہے (جناب پروفیسر صاحب کی گلفشانیوں کا نہیں بلکہ) ان احتیاطوں کا جو آئندہ اس قسم کا تحقیقی یا ترجمہ کا کام کرنے والوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئں۔ اسی طرح ہم اپنے اسلاف کی جگر کاویوں کا صحیح طور پر نئی نسل کے سامنے تعارف کرا سکیں گے۔

حواشی و حوالے

(۱) رحمن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۰ (۲) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴

(۳) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۹ (۴) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۰

(۵) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۱ (۶) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶

(۷) رحمن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۲ (۸) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۳

(۹) رحمن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۴۴ (۱۰) رحمن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷

(۱۱) محمد ایوب قادری: ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹

زینب ایک تجزیاتی مطالعہ

(آخری قسط)

ابوالنصر، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

اس ناول کے ذریعہ ڈاکٹر ہیکل نے مصری سماج وسوسائٹی بالخصوص مصری دیہاتوں کی معاشرتی زندگی کے خدوخال بیان کئے ہیں۔ ناول کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پورا مصری سماج غربت وجہالت، اخلاقی گراوٹ اور سماجی رسم ورواج کی اندھی تقلید میں ڈوبا ہوا ہے جہاں نہ نوجوانوں کے جذبات واحساسات کا کوئی لحاظ ہے اور نہ ہی عورت کو کوئی عزت کا مقام حاصل ہے اور اسکی آزادی کو اس حد تک سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی۔ ناول میں زینب کا کردار ایک متحرک اور جاندار کردار ہے جو عورت کی مجبوری، لاچاری اور بے بسی کا مظہر ہے۔ حامد کے کردار کے ذریعہ ڈاکٹر ہیکل نے پڑھے لکھے نوجوانوں کے مسائل ومشکلات کو پیش کیا ہے ایک پڑھا لکھا اور روشن خیال نوجوان بھی سماج کے سامنے اتنا بے بس اور لاچار ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق زندگی بھی نہیں گذار سکتا کیونکہ یہ سماج خرافات اور فرسودہ مراسم کا اس قدر غلام ہے کہ اسے نوجوانوں کے احساسات و جذبات کی فکر بھی نہیں ہوتی بلکہ اپنی مرضی اور خواہش کو زبردستی ان نوجوانوں پر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر ہیکل نے اس ناول کے ذریعہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور ایسی زندگی گذارنے کی دعوت دی ہے جو خود ان کی اپنی ہو، اس پر کسی دوسرے کی اجارہ داری نہ ہو کیونکہ یہی دن تو آزادی اور بے فکری کے ہوتے ہیں اگر اس عمر میں نوجوانوں پر بے جا سماجی پابندیاں عائد کر دی جائیں اور انکی آزادی سلب کر لی جائے تو ان کے چہروں کی شگفتگی ختم ہو جاتی ہے، اور وہ ہر وقت مضمحل اور اداس رہنے لگتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی وہ ان پابندیوں کے نتیجے میں سماج ومعاشرے میں فساد اور بگاڑ کا سبب بھی بن جاتا ہے اور ان پابندیوں میں وہ اتنا حبس محسوس کرتا ہے کہ اسے زندگی سے بھی نفرت ہونے لگتی ہے اور وہ موت کی تمنا کرنے لگتا ہے

چونکہ ڈاکٹر ہیکل کے سامنے مصری ادب کی تجدید کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح بھی پیش نظر تھی۔ زینب لکھ کر انہوں نے دونوں مقصد میں کامیابی حاصل کی۔ ایک طرف تو انھوں نے سماج ومعاشرے کی خرابیوں اور برائیوں پر انگلی رکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی تو دوسری جانب فکر وفن کی نئی راہوں سے عرب ادبا کو روشناس بھی کرایا۔[۲]

زینب عربی زبان وادب کا وہ پہلا ناول ہے جسمیں مصر کے دیہاتوں اور کسانوں کی زندگی کا نقشہ بڑے خوبصورت انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس میں دیہاتوں کے پرسکون ماحول اور فطری حسن کی عکاسی کے ساتھ ساتھ کسانوں کے مسائل ومشکلات اور ان کی شرافت، مہمان نوازی اور انسان دوستی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ہیکل اہل مصر کے اجتماعی ومعاشرتی مسائل کے حل اور ان کے تصفیئے کے متعلق کافی فکر مند تھے، سماج وسوسائٹی پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ وہ اپنے مقالات کی طرح اپنے افسانوں میں بھی سماج وسوسائٹی میں پھیلی ہوئی برائیوں اور خرابیوں کی طرف نہ صرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ ان کی اصلاح اور ازالے کے لئے ہر ممکن راہ بھی دکھلاتے ہیں، انہوں نے اپنے افسانوں میں خاصکر صنف نازک کی بے لبسی، لاچاری اور مجبوری کا نقشہ کھینچا ہے اور ان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ قاسم آمین کی طرح ڈاکٹر ہیکل بھی حریت نسواں کے پرزور حامی تھے اور زینب میں انہوں نے بڑے کھلے انداز میں اسکی تبلیغ کی۔ لیکن جب انہوں نے حریت نسواں کی تحریک کا یہ دردناک انجام دیکھا کہ مصری عورتیں آزادی کے نام پر عریانیت اور فحاشیت کا مظاہرہ کرنے لگیں تو "ھکذا خلقت" لکھ کر اس کی تردید کردی۔[۳]

"زینب" ڈاکٹر ہیکل کا ایک لافانی شاہکار ہے اس ناول کو "ام الروایۃ" کہا گیا ہے اسے جدید مصری ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ بقول پروفیسر محمد راشد ندوی "جدید عربی ناول نگاری میں "زینب" پہلی معلم کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ حقیقتاً عربی ناول نگاری کی عمارت اسی پر کھڑی ہے"۔[۴]

اہل مصر کو ناول نگاری کے فن سے متعارف کرانے کا سہرا "زینب" کے سر ہے، مصری ادبا "زینب" کے توسط سے ہی افسانہ نگاری کے جدید اور بنیادی اصولوں سے واقف ہوئے۔[۵]

یہ رومانی و معاشرتی ناول کا وہ پہلا فن پارہ ہے جس پر عرب دنیا ناز کرتی ہے[۷] اور جدید عربی افسانہ کو موجودہ مقام تک پہونچانے میں "زینب" سب سے اہم کڑی ثابت ہوئی ہے[۸]

"زینب" ۱۹۱۴ء میں مصنف کے اصلی نام کے بجائے اس کے قلمی نام "الفلاح المصری" (مصری کسان) سے منظر عام پر آیا لیکن ۱۹۲۹ء میں جب طہ حسین نے "الایام" لکھکر خود نوشت سوانح حیات کی ابتدا کی تو ہیکل کو بھی اپنا نام ظاہر کر دینے کی جرأت ہوئی اور ۱۹۲۹ء میں اس ناول کا نیا ایڈیشن ان کے نام کے ساتھ شائع ہوا۔ ہیکل نے "زینب" کے مقدمے میں خود اسکی صراحت کر دی ہے:۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ مصری عوام میری اس نئی کوشش کو قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے تو اس کتاب کا نام "الروایۃ" یا "القصہ" نہیں رکھا بلکہ "مناظر واخلاق ریفیہ" کے نام سے شائع کیا اور اپنا نام بھی ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور مصری فلاح پر اکتفا کیا۔ لیکن بعد میں ۱۹۲۹ء میں میرے اصلی نام کے ساتھ اس کی دوبارہ اشاعت عمل میں آئی[۸] یحیٰی حنفی کا کہنا ہے کہ "زینب" کو ڈاکٹر ہیکل نے اپنے نام کے بجائے اپنے قلمی نام مصری فلاح سے اسی وجہ سے شائع کرایا کیونکہ عوام کا تعلق دیہاتوں سے زیادہ ہوتا ہے اور وہ ان تحریروں کو پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں جن کا خالق کوئی دیہاتی ہو اور پھر دوسرے ڈاکٹر ہیکل کا تعلق عوام سے بھی زیادہ نہ تھا اور اکثر لوگ ان کے نام سے ناواقف تھے۔ لیکن جب یہ کتاب مقبول ہوئی اور دوبارہ اس کی اشاعت عمل میں آئی تو اس پر ڈاکٹر ہیکل کا نام لکھ دیا گیا:[۹]

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے "زینب" سے پہلے عربی کے ناول موجود تھے مثلاً محمد مویلحی کی "حدیث عیسیٰ بن ہشام" طاہر حقی کی "عذراء دنشواي" اور محمود خیرت کی "الفتی الریفی والفتاۃ الریفیہ" وغیرہ تھیں لیکن مقفیٰ و مسجع عبارتوں، کردار نگاری میں کمزوری اور واقعات میں عدم تسلسل اور پھر اپنے مقامی حیثیت کی بنا پر وہ زیادہ مقبول نہ ہو سکے۔ اگر ہم "زینب" کا موازنہ "حدیث عیسیٰ بن ہشام" سے کریں تو اگرچہ دونوں میں ہمیں پیار و محبت، سماجی و معاشرتی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔ حدیث عیسیٰ بن ہشام مصری سماج کی انیسویں صدی کی تصویر ہے تو زینب بیسویں صدی کے ابتدائی ایام کی سماجی و معاشرتی کیفیات کی عکاس ہے۔ لیکن "زینب"

کو جدید نظریات وافکار اور جدید طرز نگارش کی بنا پر زیادہ مقبولیت ملی کیونکہ اس میں فن ناول کی تمام بنیادی خصوصیتیں (قصہ، کردار، پلاٹ، تخلیل وتجزیہ) موجود تھیں، جبکہ "حدیث عیسیٰ بن ہشام" اور دوسرے ناول مقفیٰ اور مسجع عبارتوں اور توضیحی پیراگراف کی بنا پر زیادہ مقبول نہ ہوسکے "حدیث عیسیٰ بن ہشام" کے متعلق عبداللطیف حمزہ کا خیال ہے" اگرچہ یہ ناول مصر کے دیہاتوں اور وہاں کے باشندوں کے خدوخال پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ ناول مقفیٰ اور مسجع عبارتوں سے آراستہ ہے اس میں کنایہ واستعارہ کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے اس کے علاوہ کہیں کہیں قرآن وحدیث اور جاہلی اشعار سے استشہاد بھی ملتا ہے جس کی وجہ سے یہ ناول زیادہ مقبول نہ ہوسکا"۔ [۱۰] حامد محمود شوکت نے "زینب" کا موازنہ انگریزی کے مشہور ناول نگار THOMSS HARDEY (تھامس ہاردی) کے ناول "TESS" سے کیا ہے Thomas Hardy نے اپنے ناول میں انگلستان کے دیہاتوں کی معاشرتی زندگی سے پردہ اٹھایا ہے اور نوجوانوں کو بے جا سماجی پابندیوں اور فرسودہ رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کرنے کی دعوت دی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہیکل نے "زینب" میں مصر کے دیہاتوں اور وہاں کے باشندوں کی طرز معاشرت کی عکاسی کی ہے۔[۱۱]

ڈاکٹر ہیکل نے "زینب" میں عامیہ اور دارجہ الفاظ کا استعمال بکثرت کیا ہے جس سے ناول کی تفہیم اور مفہوم کو سمجھنے میں کافی دشواری ہوتی ہے لیکن ہیکل نے ان کا استعمال بے موقع اور بے محل نہیں کیا ہے بلکہ موقع ومحل اور ضرورت کے مطابق ہی ان کا استعمال کیا ہے۔ چونکہ ناول کی تخلیق کا مقصد ہی گاؤں کے باشندوں کی معاشرتی زندگی کو پیش کرنا تھا اور گاؤں کے باشندوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لئے ان عامیہ ودارجہ الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا اور مقصد تخلیق کو مدنظر رکھتے ہوئے ادب میں ان کا استعمال کوئی معیوب فعل نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس سے ادب میں نکھار اور حسن پیدا ہوتا ہے۔[۱۲]

زینب میں کچھ فنی اور تکنیکی خامیاں بھی ہیں مثلاً توضیحی پیراگراف کی بھرمار ہے اور کہیں کہیں کردار نگاری میں بھی جھول ہے۔ اور وصف نگاری اور منظر کشی میں غلو سے کام لیا گیا ہے جس کے نتیجے میں ایسے Sentiments ابھر کر سامنے آتے ہیں جو ہمارے موجودہ ذوق کے بالکل برعکس اور غیر رومانی ہیں [۱۳] لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس ناول میں مصر کی بیسویں صدی

کی حقیقی تصویر موجود ہے۔ اسمیں سماجی ومعاشرتی مسائل کو بڑی شدت کے ساتھ اٹھایا گیا ہے۔ اس ناول کو اتنی زیادہ مقبولیت ملی کہ مصر کے ہر نوجوان کو اس میں اپنے دل کی دھڑکن سنائی دینے لگی یہ ناول مصری عوام کے جذبات واحساسات کا ترجمان تھا۔ اس کے علاوہ ادیبوں کے لئے سنگ میل اور مشعل راہ ثابت ہوا جس کے سہارے انہوں نے عربی افسانہ اور ناول کو موجودہ مقام تک پہونچایا ——— ختم شد

مراجع ومصادر

۱۔ زینب۔ الطبعة الثانیه ص ۱۷۹

۲۔ القصة المصریة بعد ثورة عرابی وثورة ۱۹۱۹ء۔ عبدالعزیز الدسوقی۔ ص ۴۶

۳۔ تطور الروایة العربیة الحدیثة۔ طہ عمران ص ۹۱

۴۔ اسلام اور عصر جدید ج ۱۳، اکتوبر ۱۹۸۱ء

۵۔ Hamid Sakkut, The Egyptian novel and its main trends 1913-52 — P, 12 -

۶۔ الدکتور محمد حسین ہیکل۔ اعداد لطفی السید۔ مقال عبدالرحمان الشرقاوی ص ۱۱۴

۷۔ الادب العربی المعاصر فی مصر۔ شوقی ضیف ص ۲۷۷

۸۔ مقدمہ زینب ص س

۹۔ فی القصة المصریة۔ یحیٰی حقی ص ۴۴

۱۰۔ مستقبل الصحافة فی مصر۔ عبداللطیف حمزہ ص ۶۵

۱۱۔ الفن القصصی فی الادب العربی الحدیث۔ حامد محمود شوکت ص ۲۲۸

۱۲۔ القصة العربية المعاصرة۔ انور الجندی ص ۳۸

۱۳۔ The Arabic novel, An Historical And critical Introduction Roger Allen, P. 34 -

وفیات

آہ! مولانا شمس الرحمٰن نوید عثمانی

۷ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۹۳ء بروز جمعرات کو نیک و برگزیدہ عالم دین، اسلامی مصنف اور ملت اسلامیہ کے ہمدرد و غمخوار جناب شمس الرحمٰن نوید عثمانی یوپی کے نوابی شہر رامپور میں اچانک انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مولانا شمس الرحمٰن نوید عثمانی حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے چچیرے چھوٹے بھائی تھے اور راقم الحروف کی والدہ مرحومہ سے بھی ان کی قریبی رشتے داری تھی گویا ان سے راقم کے کئی رشتے تھے وہ راقم کے چچا بھی، بھائی بھی، ماموں بھی اور پھوپھا بھی تھے۔ بڑے ہی جید عالم تھے، اسلامی مسائل پر انھیں بلا کا عبور حاصل تھا جدید علوم کے شناسا و ماہر تھے سائنس اور قرآن پر ان کی معرکۃ الآرا کتاب علم داں طبقہ میں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی گئی اور پسند کی گئی۔ وید اور قرآن پر بھی انہوں نے ٹھوس علمی کام کیا ہے۔ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے ترجمان "برہان" میں ان کے علمی و ادبی و تحقیقی اور پُر از معلومات مضامین ہر خاص و عام سے داد تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ مرحوم نوید عثمانی جماعت اسلامی ہند کے رکن خاص تھے۔

حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کا بڑا ہی ادب و احترام کرتے تھے اور جب حضرت مفتی صاحبؒ کے انتقال کی خبر سنی تو آہ کے ساتھ ان کے منہ سے بیساختہ جملہ نکلا "آج ملت اسلامیہ یتیم ہو گئی" "مسلمانان ہند کا سچا قائد رہبر و غمخوار" وہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کو کہا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اب دیکھنا ملت اسلامیہ ہند کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ان کا یہ اندیشہ و خیال آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کا انتقال مئی ۱۹۸۴ء میں ہوا اس کے بعد اکتوبر ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی آنجہانی ہوئیں، راجیو گاندھی وزیر اعظم ہوئے ان کے دور وزارت عظمیٰ ۱۹۸۶ء میں بابری مسجد کا تالا کھلا اس میں کھلم کھلا پوجا پاٹ شروع ہوئی۔

(باقی صفحہ ...)

بُرہان

جلد ۱۱۲ | اکتوبر ۱۹۹۳ء مطابق جمادی الاول | شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

طویل خونریز جدوجہد اور ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی قتل و غارتگری اور تباہی و بربادی کے بعد بالآخر ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء کو فلسطینی تحریک کے سربراہ جناب یاسر عرفات اور صیہونی ریاست اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر رابن نے اس مسودۂ سمجھوتہ پر دستخط کرکے دوستی کا آغاز فرمایا ہے۔ جس کے تحت مقبوضہ علاقے کے فلسطینیوں کو محدود خود مختاری مل گئی ہے یعنی فلسطینی باشندے اپنے علاقوں میں اندرونی طور پر خود مختار ہوں گے، (انکی اپنی پولیس وغیرہ نہیں) ہوگی۔ لیکن خارجی معاملات میں وہ اسرائیل ہی کے ماتحت ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سمجھوتہ کے لئے عرصہ سے ناروے میں فلسطین اور اسرائیل حکومت کے نمائندوں کے درمیان میں خفیہ طور پر بات چیت ہوتی رہی۔ کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہونے پائی کہ امریکہ کے اشارے و تعاون بلکہ ہدایت پر ناروے میں اسرائیل اور فلسطین آپس میں ایک دوسرے کے نزدیک آنے کے لئے کئی حلقوں میں بات چیت میں مشغول ہیں، ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان میں ایسے موقع پر خوب اختلاف بھی پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن چونکہ امریکہ کی منشاء و رضا تھی کہ فلسطین اور اسرائیل آپسی اختلافات اب ختم کرکے مل بیٹھیں۔ امریکہ کی منشاء و رضا کے آگے کسی بھی ملک کے مفاد یا کسی قوم کی عزت و عظمت کی کہاں کچھ ہو سکتی ہے؟ چنانچہ امریکی دباؤ کے تحت دونوں دشمن، دوست بن گئے۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ اسرائیل اور فلسطین میں دوستی سے امریکہ کو کیا مفاد حاصل ہو سکتا ہے؟ اس دور میں سب کے نزدیک اوّل اور مقدم اپنا اپنا مفاد ہی ہے۔ امریکہ کا جو مفاد ہے اسرائیل اور فلسطین کی دوستی میں اس کا ذکر اس وقت لاحاصل ہے۔ جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل اور فلسطین کی آپسی چپقلش برسوں جو جاری رہی وہ بھی امریکہ، برطانیہ اور فرانس جیسی بڑی طاقتوں ہی کی مرہونِ منت تھی۔ اسرائیل نام کے ملک کو وجود میں لانے والی بھی یہی

طاقتیں ہیں اور اسرائیل کو ہر لحاظ سے مضبوط سے مضبوط تر کر کے اس کے ذریعہ فلسطینیوں پر ظلم و جبر کا بازار گرم رکھنے والی بھی یہی تینوں بڑی طاقتیں تھیں یہاں روس کا نام لیا جا سکتا ہے اس لئے کہ روس اب خود بکھر چکا ہے اس نے [illegible] رکھنے کے لئے جو پاپڑ بیلے تھے کتنے ہی ملکوں کو توڑا یا تڑوایا کتنوں کو تباہ و برباد کیا مگر انجام اس کا بھی عبرت ناک ہوا۔ روس اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا ہے اس لئے اس کے نام کا یہاں ذکر کرنا غیر اہم لگتا ہے۔ مگر آج پوری دنیا پر جس زور و شور اور مضبوطی کے ساتھ یہ تینوں طاقتیں امریکہ، برطانیہ اور فرانس بغیر حکمرانی نام کے حکمرانی و تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ اس کے پیش نظر ہر ملک کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی زاویہ سے ان طاقتوں کے رعب و دبدبہ میں ہے اس لئے امریکہ کی منشاء و رضا کے بغیر اگر کوئی ملک کچھ حاصل کرنا چاہے تو وہ آج کے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد مستبعد ہی نظر آئے گا۔

بہر حال اسرائیل اور فلسطین کے درمیان میں سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں کو اس سمجھوتہ سے حاصل کیا ہوا ہے۔ اور فائدہ میں زیادہ کون رہا ہے سرسری سا ہی جائزہ لینے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس سمجھوتہ سے اسرائیل اپنے اس بنیادی مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے جسکے تحت اس نے اپنا ملک فلسطینی باشندوں کو در بدر کرکے قائم کیا تھا۔ اور فلسطینی آج بھی اس مقام پر ہیں جہاں وہ اس وقت تھے جب ان کے وطن سے انہیں بے دخل کرکے ان کی زمین پر اسرائیل نام کے ملک کو قائم کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس درمیان میں اپنی جانوں کی جو قربانی دی تھی اپنے معصوم بچوں کو ظالم و جابر ملکوں کی فوجوں سے بربریت اور وحشت ناک طریقہ سے قتل کرایا شہید کرایا اپنی عورتوں کو بے عزت کرایا۔ اپنے بوڑھوں کو پریشان و اذیت ناک انداز میں ختم کرایا وہ سب ان کے نقصان میں گن کر ایک طرف کر دیا گیا ہے۔

اس موجودہ صورتحال میں فلسطین اور اسرائیل کے درمیان سمجھوتہ کے مسودہ پر نگاہ ڈال کر ملت اسلام کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہمیں اس پر فخر و مباہات اور خوشی و مسرت کا اظہار کرنا چاہیئے یا پھر اس پر آنسو بہانے چاہئیں۔ یہ اہم سوال دماغ میں کوند رہا ہے یقیناً تمام

حالات پر غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ یہ موقع نہ تو فخر و مباحات ہی کا ہے اور نہ ہی غم و غصّہ یا آنسو بہانے کا۔ اسے تو ہم وقت و حالات کا تقاضہ ہی کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ملّت اسلامیہ کی قربانیوں کو رائیگاں بھی نہیں کہا جائے گا بس قدرت کا جو فیصلہ ہوا وہ ہوگیا۔

لیکن ــــ یہ لیکن کیا؟ بس اسے نہ پوچھئے کہ اس لیکن میں ملّت اسلامیہ کے لئے عبرت ناک واقعات دردناک پہلو پوشیدہ ہے۔ آج بیسویں صدی میں ہم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ یا خالد بن ولیدؓ کی شجاعت و بہادری، پارسائی و نیکی اور اولوالعزمی کیسے تلاش کرسکتے ہیں۔ یاسر عرفات نے جب اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی ہوگی تو انھیں اس سمجھوتہ ہی میں عافیت نظر آئی ہوگی ایسا ہمارا خیال ہے

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عرب مسلمانوں میں اور اسرائیلی یہودیوں میں پچھلے ایک سو سال سے جو خونی کشمکش چل رہی تھی وہ ختم ہوگئی ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے۔
دراصل ہزار سو سال سے جو یہودیت اور عیسائیت عالم اسلام کے خلاف نبرد آزما ہے اسی نظریہ کے تحت اسرائیل قائم ہوا اور اسکو بنائے رکھنے کے لئے عیسائیت نے یہودیت سے اشتراک کیا انہوں نے اپنے اختلافات کو سمیٹا اور یہودیت کو عالم اسلام کے مدمقابل لاکھڑا کیا۔ صلیبی جنگوں سے عیسائیت کو جو نہ حاصل ہوسکا اسے انہوں نے یہودی ملک قائم کرکے جسطرح حاصل کیا ہے وہ حیرت و استعجاب کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ عالم اسلام کے موجودہ رہنماؤں نے اسطرف توجہ نہیں دی اور وہ اپنی اپنی ڈگر پر ہی چلتے رہے۔ یہاں ہمیں اس بات کا اعتراف کرلینا چاہیئے کہ فلسطین اور اسرائیل کے درمیان میں جو ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء کو جو سمجھوتہ ہوا ہے وہ عیسائیت اور یہودیت کی فتح ہے اور عالم اسلام کے رہنماؤں کی مکمل پسپائی و شکست ہے۔

ابھی فلسطین ملک دنیا کے نقشہ پر نہیں بنا ہے یہ بات سمجھ لینا چاہیئے۔ جبکہ اسرائیل نقشہ پر موجود رہے۔ موجودہ سمجھوتہ کے تحت اسرائیلی فوجی فلسطینی علاقوں سے ہٹنے شروع ہوجائیں گے۔ اور ایک سال کے اندر ان کی مکمل واپسی ہوگی ۱۳ جولائی ۱۹۹۴ء تک فلسطینی کونسل کے

انتخاب ہوجائیں گے تاکہ وہاں یہودی پناہ گزینوں کی حفاظت ہوسکے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۹۵ء سے بات چیت شروع ہوگی ۱۳ دسمبر ۱۹۹۸ء تک مکمل سمجھوتہ ہوجائے گا۔ یعنی دنیا کے نقشہ پر فلسطین نام کے ملک کو دیکھنے کے لئے ابھی پانچ سال اور انتظار کرنا ہوگا وہ بھی اس صورت میں جبکہ اسرائیل کو یہ یقین ہوجائے گا کہ اب اسے کوئی خطرہ نہیں ہے اور عرب فلسطین اس کے ساتھ امن کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ گویا کہ سب کچھ اسرائیل کے رحم وکرم پر ہوگا جو بات عربوں کو بغیر کسی قربانی کے آج سے تیس چالیس سال پہلے مل رہی تھی اور اس میں عرب فلسطین کی مرضی و منشا مقدم تھی اب وہ سب معدوم ہے۔ عرب فلسطینیوں کی مرضی کی اب کوئی وقعت نہیں ہے جو اسرائیل، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی ہدایت پر انھیں دینا چاہے گا دے دیگا۔ اسے ہم کیا کہیں؟ عرب قیادت کی ناعاقبت اندیشی سے ہی مجبوراً ہمیں تعبیر کرنا پڑے گا۔ عرب فلسطینیوں کے بلند بانگ دعوے تھے کہ ہم اسرائیل کو نیست ونابود کرکے ہی دم لیں گے وہ سب کھوکھلے ہی ثابت ہوئے اور جس کو وہ نیست ونابود کرنے پر تلے ہوئے تھے اسی سے اپنے وجود کو قائم کرنے کے لئے اب پر تول رہے ہیں۔ اسے مقام عبرت ہی کہا جائے گا۔

مذکورہ بالا اسرائیل اور فلسطین کے درمیان میں سمجھوتہ کا عرب فلسطین کے بعض طبقات نے مخالفت کرنی شروع کردی ہے وہ اپنے رہنماؤں سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا ان کے تمام مطالبات کا۔ کہاں گئے وہ مکمل آزادی کے دعوے! تھوڑی بہت مخالفت اسرائیل میں بھی ہوئی ہے مگر وہ ایسی ہے جسے نظر انداز ہی کیا جائے تو بہتر ہے جلد یا بدیر ہر یہودی اس بات کو سمجھ جائے گا کہ ہم کسی بھی گھاٹے میں نہیں رہے ہیں۔ لیکن فلسطین میں جو اسکی مخالفت ہورہی ہے اس سے یہ اندیشہ و خدشہ لاحق ہے کہ کہیں وہ آپسی خون ریزی میں نہ بدل جائے۔ اسرائیل سے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ کے عوض مصر کے صدر انور السادات کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا تھا اس وقت پوری عرب دنیا میں مصر کی مخالفت کی گئی تھی۔ خبر ہے کہ فلسطین میں کئی گروپ ایسے ہیں جنھوں نے یاسر عرفات کی مخالفت شروع کردی ہے۔ کاش مخالفت کرنے والے فلسطینی یہ سمجھ جائیں کہ اس سائنسی و مشینی دور میں یاسر عرفات نے مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے بیچ میں جو حاصل کیا ہے غنیمت ہے اسی پر اس وقت تک اکتفا کرنے میں کوئی حرج نہیں جبتک طاقت کے توازن کا رخ نہ بدل جائے۔ ہم فلسطین کے روشن مستقبل اور یاسر عرفات کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

■

الشریف الادریسی ـــــ چھٹی صدی ہجری کے اندلس کا ایک عبقری

حکیم وسیم احمد اعظمی ۔ لکھنؤ

ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الشریف الادریسی کا شمار چھٹی صدی ہجری/ بارہویں صدی عیسوی کے نامور اندلسی جغرافیہ دانوں، نقشہ نویسوں اور ماہرین نباتات میں ہوتا ہے۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے عہد کے اس عبقری کی ولادت ۴۹۳ھ/۱۰۹۹ء[1] میں سبتہ (CEUTA) میں ہوئی اور تعلیم و تربیت اندلس کے مشہور علمی شہر قرطبہ میں حاصل کی۔ اندلس میں طویل عرصہ تک قیام پذیر رہا، اس کے بعد صقلیہ (سسلی) چلا گیا اور وہاں کے حکمراں راجہ دوم (عہد حکومت ۵۶۲ھ ۱۱۶۶ء ـــ ۵۸۵ھ/۱۱۸۶ء) سے وابستہ ہو گیا اور ۵۶۰ھ/۱۱۶۰ء[2] یا ۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء میں فوت ہوا[3]۔

شریف ادریسی کو جغرافیہ اور نقشہ نویسی میں غیر معمولی درک حاصل تھا، ان میدانوں میں اس کی خدمات اور فنی اختراعات نے صدیوں تک علمی دنیا کی رہنمائی کی تھی۔ راجہ دوم کے ایماء پر اس نے چاندی کا ایک کرۂ فلکی اور ایک کرۂ ارض تیار کیا اور اس پر دنیا کے دریافت شدہ تمام ملکوں کے علاوہ دریائے نیل کا وہ منبع بھی دکھایا جسے اہل یورپ نے انیسویں صدی عیسوی میں دریافت کیا۔ ـــــ بقول ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی "یورپی جغرافیہ دانوں نے ساڑھے تین سو سال تک اپنے نقشوں وغیرہ کی تیاری میں ادریسی کی تقلید کی"[4]

۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء میں وہی نقشہ بیانیہ قالب اختیار کرکے کتابی شکل میں "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" کے نام سے وجود میں آیا[5] جس کو بعد میں علم جغرافیہ کی انسائیکلوپیڈیا کا مرتبہ حاصل ہوا[6]

شریف ادریسی نے اپنی اس کتاب میں اسلامی ملکوں کے علاوہ بہت سے عیسائی ملکوں کے حالات بھی شامل کئے۔ متقدمین کی تحقیقات کے تناظر میں بعض اضافات بھی کئے، سیاحوں

کے حوالے سے متعدد واقعات اور نقشے بھی شامل کئے تھے ۸؎ اور اس عہد کے دستور کے مطابق نباتاتی اور معدنی ادویات پر بھی خاصا مواد یکجا کر دیا تھا، ادویات سے متعلق یہ تمام معلومات، مشاہدات اور حقائق پر قائم ہیں ۸؎

ادریسی کی دوسری شہرۂ آفاق کتاب روضۃ الانس و نزہۃ النفس ۹؎ ہے ادریسی نے اسکو ۱۱۶۱ء میں ولیم اول (عہد حکومت ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء ـــــ ۵۵۵ھ/۱۱۶۱ء) کے لئے تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے ۱۰؎

شریف ادریسی کی تیسری اہم کتاب "المفردات" ہے ۱۱؎ عمر فرخ نے اس کا تفصیلی نام "الجامع لصفات اشتات النبات وضروب انواع المفردات من الاشجار والاثمار والحشائش والازہار والحیوانات والمعادن وتفسیر اسمائہا بالسریانیہ والیونانیہ واللاطینیہ والبربریہ" تحریر کیا ہے ۱۲؎ ـــــ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اس کی ایک مستقل تالیف ہے اور اسکے ادویاتی مباحث، نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق سے مختلف ہیں، اس طرح گویا ادویہ کے مباحث کے لئے نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق ایک علیحدہ اور مستقل ذریعہ معلومات ہے ـــــ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ مورخین نے اس کی جغرافیائی کتاب کے ادویاتی مباحث کو ایک مستقل تالیف تصور کر لیا ہو ـــــ اس عہد کے سفرناموں میں ذیلی طور پر ادویہ وغیرہ کی معلومات فراہم کرنے کا ایک عام رواج بھی تھا ۱۳؎۔ یقینی طور پر کسی نتیجہ تک نہ پہونچ سکنے کی وجہ دراصل راقم الحروف کے پاس نزہۃ المشتاق اور کتاب المفردات کا نہ ہونا ہے۔ ورنہ تقابلی مطالعہ سے یہ تشکیکی انداز تحریر در نہ آتا۔

شریف ادریسی کی کتاب المفردات کا ایک خطی نسخہ قسطنطنیہ میں دریافت ہوا ہے اس میں ۳۶۰ مفرد دواؤں کا تذکرہ ہے، مخطوطہ کا آغاز افسنتین نامی دوا سے ہوتا ہے، اس میں دواؤں کے مختلف اسمار تحریر ہیں ۱۴؎۔ ادریسی نے اپنی اس کتاب میں موسموں اور دواؤں پر مرتب ہونے والے ان کے اثرات پر ارسطو کی طرز میں تمہید بھی لکھی ہے ۱۵؎

علم الادویہ کا مشہور عالم ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ابن بیطار (وفات ۶۴۸ھ/۱۲۴۸ء) نے اپنی کتاب الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ میں ۱۹۶ دوائیں شریف ادریسی کے حوالے

سے نقل کی ہیں، اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دیسقوریدوس، جالینوس اور ابن وحشیہ کو ادویاتی تحقیقات میں نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ جا بجا ان کے حوالے بھی دیتا ہے
خود ابن بیطار الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ میں ادریسی کے اقوال کو اہمیت کے ساتھ نقل کرتا ہے بالخصوص شناخت ادویہ اور افعال وخواص کے ذیل میں وہ اس کی تحقیق اہمیت اور قطعیت سے نقل کرتا ہے تاہم یہاں وہ اس کی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہو پاتا یا تحقیق میں کوئی غلطی دیکھتا ہے تو اس کی نشاندہی بھی کرتا ہے، اس مرحلے میں ابن بیطار کا لب ولہجہ بھی بدل جاتا ہے، اس طرح کے اختلافات آطریلال، اکلیل الجبل اور دلفین وغیرہ دواؤں کے ذیل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

بطور مثال چند اقتباسات پیش ہیں۔

ابن بیطار آطریلال کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"شریف کا خیال ہے کہ تخم آطریلال، یونانی زبان کے" دوقس" نامی پودوں میں سے کسی ایک پودے کا تخم (بیج) ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال درست نہیں ہے۔" [۱۶]

اکلیل الجبل نامی دوا کے تذکرہ میں شریف ادریسی کے بارے میں ابن بیطار کا لب ولہجہ کچھ تنقیدی ہو جاتا ہے ـــــ لکھتے ہیں۔

"شریف نے اپنی کتاب المفردات میں اکلیل الجبل کے بیان میں ایک دوسری دوا کا بھی تذکرہ کر دیا ہے جو دراصل دیسقوریدوس کی کتاب الحشائش کے تیسرے مقالے کی" شابوطس" نامی دوا ہے، اکلیل الجبل نہیں ہے، دراصل غلطی شریف کی ہے کیونکہ دیسقوریدوس اور جالینوس دونوں ہی نے اکلیل الجبل کا قطعی طور پر کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔" [۱۷]

دلفین کے ذیل میں ابن بیطار لکھتے ہیں۔

"شریف کا خیال ہے کہ یہ" اورطارحسن" نامی مچھلی ہے، لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔" [۱۸]

ابن بیطار نے اپنی کتاب الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ کی جلد اول میں ۵۷، جلد دوم میں ۴۴، جلد سوم میں ۶۹ اور جلد چہارم میں ۳۶ دواؤں کے ذیل میں شریف

کا حوالہ دیا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان محولہ دواؤں کی ایک فہرست نقل کر رہے ہیں ممکن ہے شریف ادریسی پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس میں مزید کوئی نکتہ مل جائے۔

الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ جلد اول :

آاطریلال، آآکثار، ابہل، اسارون، اثل، آذان العنز، ارنب بحری، اسطوطودوس اسنافاخ، اشنہ، افیمون، اقسنتین، اقحوان، اکلیل الجبل، اشکت، اللبنی، املج، انجرہ، اناغالس النفس النفس، اورو بقجی، باذروج، باذنجان، بزرالکتان، بقس، بقلۃ ارمل، بلیلج، بلوط الارض، بلح بنفسج، بنتومہ، بزرق، بول، تانبول، تانیغیت، تبن، ترمس، ترنجبین، تفاح، تمساح، تن، توث تین، ثعلب، ثلب، جراد البحر، جفت افرید، جیسز، جمل، جناح ابیش، جوز القی، جوز الشرک جوز الکوثل، جوز ابقم، جوشیمعا، جیدار۔

الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ جلد دوم :

حب الزلم، حباری، حجر الکلب، حجر النار، حلفا، حلاب، حمام، حنا، خروع، خرم، خراطین خطمی، خفاش، خمیر، خنزیر، دارشیشعان، دجاج، دفلی، دفلین، ذہن التبت، دہن الجوز دود الترابل، دود الحریر، ذراریح، رثم، رخمہ، رخام، رمان، رماد، ریباس، ریش، زباد زفت، زمج۔

الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ جلد سوم :

ساج، سبج، سرخس، سرطان نہری، سراج القطرب، سعور، سفاویکس، سقمونیا، سکر سکر العشر، سنت، سلیخ الجبہ، سلدانیون، سلحفاۃ، سماق، سمسم، سمانی، سنی، سنور، شقائق النعمان شفنین بحری، شلجم، شمع، شونیز، شیلم، شیخ البنز، صابون، صبر، صحنا، صعتر، صفینہ، صقر صمغ، صنوبر، صندل، صوف، صمغ عربیار، ضرب، ضرع، طاؤس۔ طرفار، طرفہ، ظفر قطورا ظفر القط، ظلیم، عاقر قرحا، عدس نبطی، عسل، عصفر، عظام، عقرب، عقاب، علیق، علک، عنبا

عنب الثعلب، عنصل، عنکبوت، عوسج، عود الحیہ، عود النسر، غجل، فراسیون، فروفودیلدون
فر　، فسراغ الطام، نسستق، فیل

کتاب الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ جلد چہارم:

قثاء الحمار، قرع، قرصعنہ، قرمز، قصب، قطن، قطرات کوثی، قلف، قمل، کبابہ
کرفس، کرکی، کمادرپوس، کوارع، لبان، لوف، لشیابوطس، ماعز، مشتان آخر، ملطاہ، میس
نارنج، نارکیو، نار، نرجس، نسر، نعنع، نمل، نمر، نوشادر، نیلج، ورل، وسیج، ہاسیمو نیا، یحیند
یمنہ۔

اس مختصر جائزہ کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے اندلس میں ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الشریف الادریسی کا مقام بہت بلند تھا، جغرافیہ، نقشہ نویسی اور ادویات کے بارے میں اس کی آراء استناد کا درجہ رکھتی تھیں۔ صدیوں تک اس کی ان خدمات کو سنگ میل کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس عہد میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں!!!

تشریحات وکتابیات

۱ھ　اسپین میں عرب کلچر ۲۳۷، ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی، نظامی پریس، لکھنؤ سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء
۲ھ　تاریخ العلوم عند العرب ۲۰۶، عمر فروخ۔
دارالعلم للملایئن ـــ بیروت سنہ اشاعت ۱۹۸۰ء؟ ـــ واضح رہے کہ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ دوم کا عہد حکومت ۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء ـــ ۵۸۵ھ/۱۱۸۶ء ہے خود عمر فروخ نے بھی راجہ دوم کا یہی عہد تحریر کیا ہے۔ اور وہ راجہ دوم سے شریف ادریسی کی وابستگی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اس لئے یہ سنہ وفات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شریف ادریسی راجہ دوم کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی سے اس سے وابستہ رہا ہو۔
۳ھ　اسپین میں عرب کلچر ۲۳۶ ـــ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ۲/۱۲۳، مولوی

عبدالرحمن خاں، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی سنہ اشاعت ۱۹۵۰ء

سے۴ اسپین میں عرب کلچر ۲۳۷۔

سے۵ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ۲/۱۲۴ ۔۔۔ راجہ دوم کے ایما پر اس کتاب کے لکھے جانے کیوجہ سے اس کو کتاب ردجار اور کتاب الرجاری وغیرہ کہتے ہیں۔

سے۶ اسپین میں عرب کلچر ۲۳۷۔

سے۷ ایضاً ۲۳۷

سے۸ ایضاً ۲۳۷

سے۹ اس کا دوسرا نام کتاب المسالک المہالک ہے تمام کتاب اب ناپید ہے، مولوی عبدالرحمن خاں کے بقول روضۃ الفرج کے نام سے کسی غیر مشہور مصنف کی ایک کتاب ۱۱۹۲ء کی لکھی ہوئی ملتی ہے، ممکن ہے وہ روضۃ الانس کا خلاصہ یا جزوی نقل ہو ۔۔۔ لیکن مولوی عبدالرحمن خاں نے اپنے اس قیاس کے قرائن پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔۔۔ نام کا جزوی اشتراک ۔۔۔ راقم الحروف کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا (وسیم احمد اعظمی)

سے۱۰ ضیاء الدین ابن بیطار نے اپنی کتاب الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ میں شریف ادریسی کے اقتباسات نقل کرتے وقت "کتاب المفردات" مفردات شریف، الشریف فی مفرداتہ وغیرہ لکھتے ہیں اور بعض اوقات صرف شریف ادریسی یا صرف شریف پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

سے۱۱ تاریخ العلوم عند العرب ۲۶۹-۲۶۸۔

سے۱۲ مثال کے طور پر ابو العباس ابن امرومیہ کی کتاب الرحلہ الی المشرقیہ، جو سفر نامہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادویات پر زبردست معلومات فراہم کرتی ہے۔۔۔ ابن بیطار نے اپنی الجامع میں اس کا متعدد بار حوالہ دیا ہے۔ (وسیم احمد اعظمی)

سے۱۳ اسپین میں عرب کلچر

سے۱۴ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ۲/۲۸

سے۱۵ الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ ۱/۵، ضیاء الدین ابن بیطار، مطبوعہ قاہرہ، سنہ اشاعت ۱۸ھ

سے۱۶ ایضاً ۱/۵۱۔ سے۱۷ ایضاً ۲/۹۶۔

قسط نمبر ۲

خلیل ابن احمد فراہیدی

(شاہد اسلم، ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ایک بار لیث نے ایک حسین وجمیل خوبصورت باندی بہت ہی زیادہ قیمت میں خریدی اور اسکو اپنے ایک دوست کے گھر میں لونڈی بنا کر رکھا جبکہ اس کی بیوی ایک خاندانی شریف مالدار اور نہایت ہی حسین اپنے شوہر کی پوجا کرنے والی اس کی بنت عم تھی۔ جب اسے معلوم ہوا تو وہ رقابت کی آگ میں جلنے لگی اور اسے اس بات پر بہت زیادہ رنج وغم ہوا اور اس نے کہا کہ بخدا میں لیث کو ضرور غیظ میں مبتلا کروں گی۔ چنانچہ وہ اب اسکو غیظ میں ڈالنے کی فکر میں لگی رہتی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ لیث "کتاب العین" سے کتنا زیادہ پیار کرتا ہے اور اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ لہٰذا اسے اس کے ضائع ہونے سے جو غم ہوگا وہ کسی دوسری چیز سے نہیں ہوگا کیونکہ اس کے نزدیک مال و دولت کی کوئی وقعت نہیں تھی چنانچہ اس نے ایک روز کتاب العین کو جلا کر اپنے منصوبہ کو تکمیل تک پہونچا دیا۔ جب لیث دار براکہ جہاں اسے صبح وشام جانا پڑتا تھا واپس آیا تو حسب عادت اس نے کتاب کو دیکھنا چاہا غلام کو آواز دیا اور کہا کہ جا کر کتاب کو لائے لیکن کتاب نہ ملی لیث اس بات سے بہت ناراض ہوا اور اس نے سوچا کہ کتاب کسی نے چرالی ہے تمام غلاموں کو اکٹھا کیا اور سب سے اس کے متعلق سوال وجواب کرنے لگا اور خوب ڈرایا دھمکایا تو آخر ڈر کر ایک غلام بول پڑا کہ کتاب بیگم صاحبہ لے گئی ہیں لیث اصل حقیقت کو سمجھ گیا اور بیگم کے پاس پہونچا اور منانے لگا اس نے قسم کھائی کہ اب باندی مجھ پر حرام ہے۔ بیوی اسکو اس کمرے میں لے گئی جہاں کتاب جلکر راکھ ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر لیث کو بہت رنج وافسوس ہوا اس کے

حواس باختہ ہوگئے اب خلیل ابن احمد نحوی بھی عالم جاودانی کو کوچ کرگئے تھے اور دنیا میں اس کا کوئی دوسرا نسخہ بھی موجود نہ تھا اب لیث کیا کرسکتا تھا لیکن چونکہ اس نے کتاب کا آدھا حصہ یاد کرلیا تھا لہٰذا اس نے اس وقت کے تمام بڑے بڑے علمار کو جمع کیا اور ان کے سامنے اس کا نصف حصہ پیش کیا اور ان سے کہا کہ اس کے معیار کے مطابق بقیہ حصہ تیار کرو علمار نے اپنی پوری جدوجہد اور صلاحیت کو صرف کردی اور کتاب تو کافی کوششوں کے بعد لکھ ڈالی لیکن اس کے معیار کے مطابق نہیں لکھ پائے اس لئے کتاب کے دو حصے نظر آتے ہیں پہلا حصہ تو بہت ہی مضبوط اور اعلیٰ و محکم ہے لیکن دوسرا اس جیسا نظر نہیں آتا۔

خلیل دنیا سے بے رغبتی اور اس سے اعراض کرنے والوں میں سے تھا وہ بہت ہی خوددار آدمی تھا وہ کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا اور نہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا چاہتا تھا، خلیل کی خودداری، پرہیزگاری اور اس کے زہد و ورع کی فطرت خاصہ تھی کہ انھوں نے مال و دولت اور دنیاوی عیش و آرام کے لئے باوجود ایک منفرد عالم اور علم و فن کے موجد ہونے کے کبھی دست سوال دراز نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے سامنے سر جھکایا بلکہ بسبب زہد و تقویٰ وہ اپنی جھونپڑی ہی کو اعلیٰ و ارفع سمجھتا تھا۔

سفیان ثوری خلیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ جو شخص کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا ہو کہ جو مشک اور سونے کا بنا ہوا ہو تو اسے چاہیئے کہ خلیل ابن احمد کو دیکھ لے۔

اس کے زہد و عبادت کے سلسلہ میں نضر بن شمیل کہتے ہیں:

کنا نمثل بین ابن عون وخلیل بن احمد ایھما تقدم فی الذھب والعبادۃ فلا ندری ایھما نقدم۔

اور آگے کہتے ہیں کہ ما رایت رجلاً اعلم بالسنۃ بعد ابن عون من خلیل بن احمد وکان یقول اکلت الدنیا بعلم الخلیل وکتبہ۔

"نزھۃ الالباء فی طبقات الادباء" میں ابن الانباری نے خلیل کے علم و ادب اور فضل کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے شخصی پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ خلیل زہد و علم میں تمام اہل ادب کا سردار اور تصحیح قیاس مسائل نحو کے استخراج اور تعلیل

میں کامل تھا وہ عمرو ابن العلاء کے شاگردوں میں سے تھا اور اس کے شاگردوں میں سے سیبویہ جیسا نحوی تھا سیبویہ کی کتاب میں زیادہ تر روایتیں خلیل کی ہیں اور جہاں بھی سیبویہ نے لکھا ہے " سألتہ " یا یہ کہ قائل کا ذکر ہی نہیں کیا تو اس سے خلیل ہی مراد ہے۔

خلیل کے بہت بڑے بڑے علم کے اعتبار سے شاگرد ہوئے جنھوں نے بہت ہی اہم اہم کام انجام دیئے ان کے خاص شاگردوں میں سیبویہ، اصمعی، نضر بن شمیل، لیث بن مظفر وغیرہ ہیں۔

ایک ماہر فن استاد کی سب سے بڑی خوبی اور اس کی عظیم شخصیت کی دلیل ہے کہ زمانہ کے مشہور و معروف ویکتائے روزگار اور علم وادب میں ماہر فن ہستیوں کو جنم دیا۔

خلیل وہ پہلا شخص ہے جس نے ایجاد علم عروض کے ساتھ ساتھ لغت کو ضبط کیا اشعار عرب کا احاطہ کیا اور ادب سے متعلق دو دو تین تین اشعار بھی کہے۔

خلیل ابن احمد کے مقولات و مرویات:

خلیل ابن علم وادب، نحو، لغت، عروض اور علم سنت میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے بلند پایہ علمار عربی اور اعلیٰ طبقہ کے رواۃ سے انہوں نے نحو، قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں ختم کر دیا ان کی زندگی کے حالات کا بنظر غایت مطالعہ کرنے سے ہمیں بہت سی نصیحت آموز باتیں نظر آتیں ہیں۔

وہ اپنے تلامذہ کے سامنے درس کے درمیان ذکر و نصیحت کی باتیں بھی بیان کیا کرتے تھے جو بہت ہی مفید اور سودمند ہوتی تھیں ہم ان کے چند ارشادات کو نقل کر رہے ہیں۔

درمیان درس ایک مرتبہ خلیل نے کہا کہ علم حاصل کرتے رہو اور دوسروں تک علم پہنچانے کی کوشش کرو اور اس چیز سے مت گھبراؤ کہ کہیں تم سے کوئی سوال نہ کرے اس لئے کہ اگر تم کسی بات کو نہیں جانتے ہو تو اسے جاننے کی کوشش کروگے اور تمہیں ایک نئی بات معلوم ہو جائے گی۔ علم تالا کے مشابہ ہے اور سوالات اس کی چابی۔

اسی طرح ایک بار اور خلیل نے درس کے دوران کہا کہ آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں۔

رجل يدري ويدري انه يدري فهو عالم فاتبعوه. ورجل يدري ولا يدري انه يدري فذالك ناسٍ فاذكروه، ورجل لا يدري ويدري انه لا يدري فذالك جاهل فعلّموه، ورجل لا يدري ولا يدري انه لا يدري فذالك مائق فاحذروه۔

قال الخليل: الزاهد من لا يطلب المفقود حتى يفقد الموجود وقال: الجود بذل الموجود وقال: الايام ثلاثه: معهود، مشهود وموعود، فالمعهود الامس والمشهود اليوم والموعود غداً۔

پھر اس کے بعد اس نے یہ شعر پڑھا:

غرّ جهولاً امله!	حتى يؤافي اجله!
من دني من حتفه!	لم تغن عنه حيلهُ
لا يصحب الانسان من	دنياه الا عمله

وقال: اذا افتقرت الى الذخائر لم تجد ذخراً يكون كصالح الاعمال۔

خلیل ابن احمد دوستی کو استوار رکھنے اور تعلقات بڑھانے کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان بغیر دوست کے ایسا ہی ہے جیسا کہ داہنا ہاتھ بغیر بائیں ہاتھ کے اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

تكثّر من الاخوان ما استطعت انهم	بطونٌ اذا استنجدتهم وظهور
وما بكثير الف خلٍّ لعاقل	وانّ عدواً واحداً لكثير

وقال: اذا اخبرك بعيبك صديق قبل ان يخبرله به عدوٌ فاحسن شكره واقبل نُصحه فانّك ان قبلته لم ينفعه وان رددته لم تضُرّ الا نفسك ومن اظهر له عيوباً وكشف لك عن مكروه قناعاً فقس ما غاب عنك بما ظهر لك من فعله۔

ويحكى عنه انه قال ان لم تكن هذه الطائفه (اهل العلم) اولياء الله فليس لله تعالى ولي

سمعانی نے لکھا ہے کہ خلیل احادیث میں مقاطیع روایت کرتا ہے اور علامہ سیوطیؒ نے بھی اسکی تصدیق کی ہے اور طبقات الکبریٰ میں انکی روایت کردہ حدیثیں دی ہیں۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ خلیل ایوب سختیانی، عاصم الاحول، عثمان بن حاضر العوام بن حوشب اور غالب القطان سے راوی تھا اور حماد بن زید، سیبویہ، اصمعی، ہارون بن موسیٰ وغیرہ ان سے روایت کرتے تھے۔

خلیل ابن احمد کے اساتذہ وتلامذہ !

ابوعبدالرحمٰن خلیل بن احمد فراہیدی بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی بلندپایہ علمار قابل رواۃ سے انھوں نے نحو قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی ان کے اساتذہ میں ایوب سختیانی، عاصم الاحول، ابوعمرو بن العلار، عیسیٰ بن عمر، غالب القطان، العوام بن حوشب وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے جن سے انہوں نے حدیث نبوی اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور اس درجہ پر پہونچے کہ دنیا ان کے علم و فضل کا لوہا مانتی ہے اور ان کے شاگردوں میں اصمعی سیبویہ، نضر بن شمیل، لیث بن مظفر بن نصر، ابوعبید، مورج السدوسی جیسے قابل اور ذی علم لوگوں کا نام لیا جاتا ہے جنھوں نے آگے چل کر بہت بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

ابن الانباری ان کے چار شاگردوں کے بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فن میں مہارت حاصل کی اور اپنے نام کے ساتھ خلیل کو بھی عزت و دوام بخشا اور ان کا نام روشن کیا ان میں ایک سیبویہ بھی ہے جو نحو میں فائق تھا دوسرا نضر بن شمیل جس پر لغت غالب آئی اور تیسرا مورج السدوسی جس پر شعر و لغت بھاری ہیں اور چوتھا جہضمی ہے جس نے فن حدیث میں کمال حاصل کیا۔

خلیل ابن احمد کے معاصرین !

خلیل ابن احمد کے معاصرین میں ایک نام یونس بن حبیب کا بھی آتا ہے۔ جو خلیل سے عروض سیکھنے ان کے گھر آیا کرتا تھا لیکن اسے عروض سیکھنے میں کافی مشکلات کا سامنا

کرنا پڑتا تھا بہت سی چیزیں سمجھنے میں اسے کافی وقت لگ جاتا ایک دن جب یہ خلیل کے پاس عروض سیکھنے آیا تو خلیل نے اس کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

اذا لم تستطع شیئاً فدعه

وجاوز الی ما تستطیع

اور پوچھا کہ شاعر کا یہ شعر کس بحر میں ہے یونس بھی چونکہ خلیل کی صحبت میں رہتا تھا اور اس کے مزاج سے واقف ہو گیا تھا فوراً خلیل کا مطلب سمجھ گیا اور اس کے بعد سے عروض کا سیکھنا بند کر دیا۔

کتاب الاغانی میں ابو محمد الیزیدی سے مروی ہے کہ وہ جب بھی خلیل سے ملتا تو خلیل کہتا کہ مجھے کوئی عبداللہ ابن مقفع سے ملائے اور جب ابن مقفع سے ملتا تو وہ کہتا کہ مجھے کوئی خلیل ابن احمد سے ملائے چنانچہ ایک دن میں نے دونوں کو ملایا اور ان دونوں میں خوب علمی گفتگو ہوئی جب دونوں جدا ہوئے تو میں نے ابن المقفع سے خلیل کے بارے میں رائے معلوم کی کہ تم نے خلیل کو کیا پایا تو اس نے جواب دیا" رأیت رجلا عقله اکثر من علمه" اور اسی طرح ایک دن خلیل سے ابن مقفع کے بارے میں سوال کیا کہ تم نے ابن مقفع کو کیسا پایا اے خلیل تو اس نے جواب دیا" رأیت رجلا علمه اکثر من عقله"

تو اس پر مغیرہ بن محمد نے کہا کہ دونوں نے سچ کہا خلیل کی عقل نے اسکو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ وہ ایک زاہد ہو کر اس دنیائے فانی سے کوچ کیا اور ابن المقفع کے علم نے اس کو یہاں تک پہونچایا کہ وہ قتل کر دیا گیا۔

ابن المقفع کے قتل کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار اس نے عبداللہ بن علی کے لئے منصور کے پاس ایک خط لکھا جسمیں کچھ ایسی نامعقول باتیں بھی لکھ دی جو منصور کو بہت ناگوار گذری چنانچہ منصور نے سفیان بن معاویہ (جو اس وقت بصرہ کے امیر تھے) کے پاس یہ پیغام لکھا کہ ابن المقفع کو قتل کر ڈالو چنانچہ اس نے ابن المقفع کو قتل کر ڈالا۔

محاضرات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیل بن احمد اور نظام المعتزلی میں معاصرانہ چشمک تھی الغرض دونوں کے تعلقات آپس میں استوار نہ تھے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر نظام نے

خلیل کی مذمت کی اور کہا کہ خلیل نے اس کام کے کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے جس کے کرنے کی صلاحیت وہ نہیں رکھتا ہے۔ وہ عروض کے جال میں پھنس کر رہ گیا جس کی سوائے اس کے اور کسی کو ضرورت نہیں۔ نظام خلیل کے علم وفن سے جلتا تھا اور طرح طرح کے جملے کسا کرتا تھا۔

خلیل ابن احمد بحیثیت عالم وفاضل :

خلیل بن احمد کے علم وفضل کا اندازہ نضر بن شمیل کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے وہ کہتا ہے "ماراٴیت رجلاً اعلم بالسنة بعد ابن عون من الخلیل وکان یقول اکلت الدنیا بعلم الخلیل وکتبه۔

خلیل، نحو، لغت، علم عروض، ادب اور علم سنت میں اونچا مقام رکھتا تھا۔ اور ساتھ ہی روایت شعر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا ابن حجر نے ایک روایت نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل کتنا ذہین اور ماہر علم وفن تھا انہوں نے بیان کیا ہے کہ ایک بار سیبویہ سے دریافت کیا گیا کہ خلیل کے پاس کوئی ایسا مسودہ موجود تھا جسکو دیکھ کر خلیل تم لوگوں کو پڑھاتا تھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے ان کے پاس کوئی مسودہ نہیں دیکھا ہاں ایک باریک خط کی بیس رطل تحریریں تھیں جن میں لغات عرب درج تھے جو میں نے ان سے سنے اور نحو کے متعلق جو کچھ میں نے ان سے سنا ان سب کو انہوں نے زبانی سنایا اور لکھایا۔ لغت میں اور اسی طرح نحو کے اندر وہ بصرے کے دبستان کے مسلمہ رئیس الاساتذہ ہیں انھوں نے ریاضی موسیقی اور عروض پر بھی کتابیں لکھیں وہ کسی چیز کو کہنے سے پہلے اس میں غور وفکر کرتے بغیر سوچے سمجھے کبھی نہیں بولتے۔

صاحب معجم الادبار بیان کرتے ہیں کہ وہ سوال وجواب میں کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے ان کے غور وفکر اور تدبر کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے ابن شمیل سے مروی ہے کہ اصحاب یونس نحوی میں سے ایک نے خلیل کے پاس آکر ایک سوال کیا خلیل سوچنے لگا اور اتنی دیر تک سوچتا رہا کہ سائل اٹھ کر چلا گیا نضر وغیرہ نے خلیل سے ناراضگی کا اظہار کیا تو خلیل نے ان سے پوچھا کہ اگر میری جگہ تم لوگ ہوتے تو اس کا کیا جواب دیتے تو ان لوگوں

نے کہا کہ ہم فلاں فلاں جواب دیتے پھر خلیل نے ان سے کہا کہ تمہارے اس جواب پر یہ اعتراض پڑتا ہے اور اس جواب پر یہ اعتراض پڑتا ہے اگر وہ تم سے یہ اعتراض کرلیتا تو اس کا کیا جواب دیتے تو ان لوگوں سے صحیح جواب نہ بن پڑا اور الٹا سیدھا جواب دینا شروع کیا تو خلیل نے کہا کہ ہم پر لازم ہے کہ کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے خوب سوچیں سمجھیں اور جب تک اس کا صحیح جواب نہ معلوم ہو جائے اس وقت تک جواب نہ دینا چاہیئے۔

نوویؒ نے لکھا ہے کہ صاحب ورع دنیا کے اسباب میں کم گیر اور منقطع الی العلوٰتھا وفیات میں مذکور ہے کہ خلیل مرد صالح۔ عاقل اور حلیم تھا اور کمال کی ذہانت رکھتا تھا۔

علامہ سیوطیؒ نے بغیۃ الوعاۃ میں اسطرح ذکر فرمایا ہے۔

"کان الناس یقولون لم یکن فی العربیۃ بعد الصحابۃ اذکی منہ"

ابن حجرؒ نے نضر بن شمیل کا ایک قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں میں نے کسی شخص کو جس کے علم سے استفادہ کیا جاتا ہے خلیل سے زیادہ متواضع نہیں دیکھا۔ علامہ سیوطی نے ان کو زاہد، متواضع، رحمدل جیسے الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ بصرہ میں ایک بار وہ عمر بن العلاء سے مناظرہ کرنے کے لئے آئے تو مجلس میں چھپ کر بیٹھ گئے اور مناظرہ کے لئے سامنے نہیں آئے جب لوگوں کو معلوم ہوا تو اس کی وجہ دریافت کی تو خلیل نے کہا

"نظرت فاذا ھو رئیس منذ خمسین سنۃ فخفت ان ینقطع فیفیضح فی البلد"

خلیل بن احمد کی فطرت اس کی خوبی اور بڑائی یہ تھی کہ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا و برتر نہیں سمجھا۔ ان کے نزدیک علم کی سب سے زیادہ اہمیت تھی وہ عالم کی بہت قدر کرتے تھے اور ہر ایک کے علم کو تسلیم کرتے تھے کبھی ان کے اندر تعصب، رقابت اور برائی اور غرور نہیں آیا۔

"المقتبس" میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ ایک بار سیار بن ہانی اپنے بیٹے کو خلیل کے پاس لے کر آیا اور خلیل سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا ابراہیم کچھ دنوں آپ کے خدمت میں رہکر علم حاصل کرے خلیل اس بچے سے کھیلنے کے انداز میں گفتگو کرنے لگے ان کے صحن میں ایک کھجور کا درخت تھا اسے دیکھ کر خلیل نے بچے سے کہا کہ اس کھجور کے درخت کا وصف بیان کرو تو اس

لڑکے نے خلیل سے کہا اَبجد ج ام بذم تو خلیل نے کہا بذم تو اس لڑکے نے اس کی برائی بیان کی اور کہا: "ھی صبغۃ المرتقی، خیشۃ المعتنی" اس کے بعد خلیل نے ایک شیشے کا پیالہ لیا اور اس سے کہا کہ میرے ہاتھ میں یہ جو پیالہ ہے اس کا وصف بیان کرو تو پھر اس لڑکے نے یہی سوال کیا اَبجد ج ام بذم تو خلیل نے کہا بذم تو اس لڑکے نے اس پیالے کی برائی بیان کی اور کہا ھی سریقۃ الانکسار بطیئۃ الانجبار، خلیل اس لڑکے کے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اس کی ذہانت و ذکاوت اور علم کا اندازہ لگا لیا اور اس کے علم کا اعتراف کیا اور سیّار سے کہا کہ تمہارا لڑکا تو بہت قابل ہے وہ مجھ سے کیا سیکھے گا اب تو میں خود ضرورت محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپکے لڑکے سے کچھ سیکھوں۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیل کے اندر بڑاپن اور غرور بالکل نہیں تھا اور یہ انسان کا سب سے بڑا کمال ہے جو کہ خلیل کے اندر بدرجہ انتہا پایا جاتا ہے۔

تاریخ وفات!

خلیل بن احمد کی تاریخ پیدائش میں تقریباً تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ ۱۰۰ھ میں پیدا ہوا لیکن ان کی تاریخ وفات میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے خلیل کی تاریخ وفات ۱۷۵ھ بتلایا ہے ان کے قول کے مطابق ۱۷۵ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا اور یہی قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ خلیل نے چوہتر سال کی عمر پائی اس لحاظ سے ۱۷۵ھ زیادہ قبولیت کے قریب ہے اس لئے کہ اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ خلیل کی پیدائش ۱۰۰ھ میں ہوئی ہے۔

ابن الانباری نے لکھا ہے کہ خلیل کی وفات ۱۶۰ھ میں ہوئی اور بقول ابن ندیم خلیل نے ۱۷۰ھ میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا۔

ابن حجرؒ نے خلیل کی تاریخ وفات ۱۷۵ھ بتایا ہے۔

ایسے ہی کچھ دوسرے لوگوں کا قول ۱۷۴ھ بھی ملتا ہے۔

ان تمام اقوال کی روشنی میں یہ کہا جائے کہ خلیل کی وفات ۱۷۵ھ میں ہوئی تو یہ حقیقت کے

زیادہ قریب ہوگا۔ اس لئے کہ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کی پیدائش ۱۰۰ھ میں ہوئی اور پھر ان میں سے اکثر کا کہنا ہے کہ اس نے چوہتر سال کی عمر پائی اس طرح اس کی وفات ۱۷۰ھ میں ہوئی ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کی موت کا سبب یہ بتلایا ہے کہ خلیل بن احمد نے یہ کہا تھا کہ میں حساب کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کرنا چاہتا ہوں کہ اس حساب کے وجود میں آجانے کے بعد کوئی بنیا کسی لڑکی کو بھی دھوکہ نہیں دے سکے گا۔ اسی غور و فکر میں وہ مسجد میں داخل ہوا اور بے خیالی میں ایک ستون سے ٹکرا کر گر پڑا کہتے ہیں کہ اس سے خلیل کے دماغ میں چوٹ آگئی اور بھیجا ہل گیا اور وہیں پر فوت ہوگیا۔ بعض لوگوں نے اس کے انہماک کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ وہ عروض کے ایک بحر کی تقطیع کر رہا تھا۔

بہرحال خلیل بن احمد قول راجح کی بنیاد پر ۱۷۵ھ میں بصرہ میں اس دار فانی سے کوچ کرگیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مالک حقیقی سے جا ملا اور اپنا نام ہمیشہ کے لئے اس دنیا میں چھوڑ گیا اس لئے کہ جبتک کسی کے علمی ذخائر باقی رہتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتا۔

تصانیف خلیل :

خلیل نے نحو، لغت، فلسفہ، عروض وغیرہ مختلف فنون پر بہت سی کتابیں لکھیں جن میں اکثر زمانہ کے حوادثات کی نذر ہوگئیں اور رہیں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا مندرجہ ذیل چند کتابوں کا ذکر تاریخ و سوانح کی کتابوں میں ملتا ہے جو خلیل کیطرف منسوب کی جاتی ہیں جرجی زیدان اور ابن ندیم نے بھی ان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) کتاب العین (۲) کتاب النغم (۳) کتاب العروض (۴) کتاب الشواہد (۵) کتاب الایقاع (۶) کتاب النوادر (۷) کتاب النقط والشکل (۸) کتاب فائت العین (۹) کتاب فی معنی الحروف (۱۰) کتاب شرح حروف الخلیل (۱۱) کتاب فیہ جملۃ آلات العرب (۱۲) قطعۃ من کلام عن اصل الفعل (۱۳) کتاب الجمل۔ (باقی آئندہ)

تیسری قسط

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء)

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

مضمون وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے تیسری قسط تاخیر سے شائع کیا جا رہا ہے (ادارہ)

رلف فچ (۱۵۸۳ء تا ۱۵۹۱ء)

سوانح عمری: ہندوستان میں آنے والے انگریز سیاحوں میں رلف فچ کو بجا طور پر پہلا رہنما سیاح کہا جا سکتا ہے۔ وہ پہلا انگلستانی باشندہ تھا جس نے اس ملک کی سیاحت کی۔ اس نے اس ملک کے باشندوں، ان کے ملبوس اور ان کے رسوم کو قلمبند کیا۔ ۱۵۸۰ء میں مشرقی سمندر پر بلا شرکت غیرے پرتگالیوں کا پوری طرح سے تسلط ہو گیا تھا۔ اس لئے ہندوستان آنے کا سمندری راستہ یورپی دوسری قوموں کے لئے بالکل بند ہو گیا تھا۔ چونکہ سمندری راستہ کو خطرناک سمجھا جاتا تھا اس لئے یہ طے کیا گیا کہ انگلستانی باشندے کو بری راستہ سے ہندوستان آنا چاہیئے۔

۱۵۸۳ء میں رلف فچ نیوز بری کے ساتھ ٹائی گر نامی بحری جہاز میں انگلستان سے روانہ ہوا اور وہ لوگ مئی کے مہینہ میں الیپو پہونچے۔ وہاں ایک مختصر قیام کے بعد بصرہ کے لئے روانہ ہوئے جہاں وہ ۶ راگست کو پہونچے۔ بصرہ کے نیوز بری، فچ اور اور لیڈس بحری جہاز سے ہرمذ کے لئے سوار ہوئے۔ اٹلی کے ایک تاجر کی رقابت کیوجہ سے انھیں پرتگالیوں نے حراست میں لے لیا۔ ان پر انہوں نے جاسوسی کا الزام عائد کیا اور قیدی کی حیثیت سے انہیں گوا لے آئے۔

گوا میں انہوں نے تھومس اسٹیون نامی ایک یسوعی اور ینوٹن نامی ایک ولندیزی

سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے۔ چونکہ انھوں نے اپنے کو راسخ العقیدہ ایک کیتھولک ثابت کیا تھا اس لئے انھیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ بعدازیں انھوں نے گوا ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ کرایہ پر ایک دوکان لے لی۔ اور انہوں نے اپنا پُرانا پیشہ شروع کر دیا انہیں سے ایک نے یسوعی عقیدہ اختیار کر لیا۔ لیکن حالات کے اچانک بدل جانے کیوجہ سے انھیں دوسرا ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک یسوعی نے انھیں اس بات سے باخبر کر دیا کہ ان کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ جہاز کے پہونچنے پر انھیں پرتگال میں جلاوطن کر دیا جائے گا۔ اس افواہ کو سن کر وہ بہت زیادہ دہشت زدہ ہو گئے۔ لیکن وہاں کے گورنر کے کڑے رویے نے ان کے اس شبہ کی توثیق کر دی۔ لہٰذا ماہ اپریل ۱۵۸۴ء میں ان میں سے تین افراد (فلچ، نیوز بری اور لیڈس) نے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ لوگ اپنے پکڑنے والوں کو اس طرح دھوکا دینے میں کامیاب ہوئے کہ سیر و تفریح کے بہانے سے نکل کر وہ بیجاپور کے علاقے میں پہونچ گئے۔ پرتگالیوں کے مقبوضات کے حدود سے باہر نکل کر انھوں نے آزادی کی سانس لی۔ اب وہ لوگ آزادی سے جہاں چاہیں جا سکتے تھے۔

وہاں سے وہ لوگ گولکنڈہ کے لئے روانہ ہوئے اور آخر کار بالاپور (ضلع اکولا میں یہ ایک گاؤں تھا) آکر وہ مغلوں کے مقبوضات میں داخل ہوئے، جہاں سے وہ برہان پور پہونچے۔ اس کے بعد انھوں نے فتح پور سیکری جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں پہونچکر مغل دارالخلافہ میں لیڈس نے بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ نیوز بری نے مغرب کی سمت جانا طے کیا اور اس نے فلچ سے یہ وعدہ کیا کہ دورانِ سال میں مغلیہ سلطنت کے مشرقی صوبے کے کسی مقام پر وہ اس سے آملے گا۔ اس کے علاوہ لیڈس اور نیوز بری کے بارے میں کسی اور بات کا علم حاصل نہ ہو سکا۔ اسی اثنار میں فلچ مشرقی صوبوں کے لئے روانہ ہوا۔ اس نے گنگا ندی میں کشتی کے ذریعہ اپنا سفر شروع کیا۔ اور دوران سفر میں اس نے الہ آباد بنارس، پٹنہ اور ہگلی شہر دیکھے۔ اس نے کچھ بہار کا سفر کیا اور چٹگاؤں میں پہونچا، جہاں اس نے پرتگال کے وہاں کے نوآباد باشندوں سے دوستی پیدا کر لی۔ بعدازیں وہ پیگو اور سیام گیا۔

وہ پھر کوچین واپس آیا۔ گوؔوا سے ہوتا ہوا وہ چاؤل گیا۔ وہاں سے وہ پانی کے جہاز سے ہرمزد کے لئے روانہ ہوا، وہ بخیر وعافیت منزل مقصود تک پہونچ گیا۔ الیپو سے اس نے اپنے وطن کا سفر اختیار کیا۔ اپریل ۱۵۹۱ء میں وہ انگلستان پہونچ گیا۔

رلف فچ نے ہندوستان کے علاوہ دوسرے مقامات کی بھی سیاحتیں کیں۔ لیکن ان کے بارے میں دستاویز پوری طرح سے محفوظ نہیں ہیں۔ فوسٹر نے لکھا ہے کہ رلف فچ کا تعلق سینٹ کیتھارائن کری سے تھا اور اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اُسے وہیں دفن کیا گیا۔ رلف فچ کا انتقال غالباً ۱۳ اور ۱۵ اکتوبر ۱۶۱۱ء کے درمیان میں ہوا تھا۔

مہارانی الزبتھ کا جو خط وہ انگریز مغل بادشاہ کے لئے لائے تھے، اس خط کو بادشاہ کی خدمت میں پیش نہ کیا گیا تھا۔ اگر وہ پیش کیا بھی گیا تھا تو اس بات کا حوالہ کہیں دستیاب نہیں ہوتا ہے۔

(الف) ان شہروں کا بیان۔ جو اس نے دیکھے تھے:

گوؔوا: رلف فچ نے گوؔوا کے بارے میں تفصیلی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس نے صرف پرتگالیوں کے قبضے کا ذکر کیا ہے جو اہم ہے۔ اگر کسی جہاز میں تجارتی سامان اور گھوڑے آتے تو صرف گھوڑوں پر محصول لیا جاتا جبکہ تجارتی سامان محصول سے بالکل مستثنیٰ تھا لیکن اگر اس جہاز میں گھوڑے نہ لدے ہوتے تو اس جہاز پر ۸ فیصد چنگی لی جاتی تھی۔

دِیُو: ہندوستانی بحری علاقے میں پرتگالیوں کا یہ مضبوط ترین مقبوضہ تھا۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن تجارتی اشیاء کا یہاں بڑا ذخیرہ تھا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے بحری جہاز مکّہ اور ہرمزد کے اس بندرگاہ میں آتے تھے۔ پرتگالیوں کے پروانۂ راہداری حاصل کئے بنا مسلمانوں کے بحری جہاز اس بندرگاہ سے ہرگز گذر نہیں سکتے تھے۔

کمبایت: رلف فچ نے اس مقام کو "کمیتا" کے نام سے یاد کیا ہے۔ گجرات صوبہ میں ایک خاص شہر تھا۔ یہ اچھا خاصا بنا ہوا تھا۔ اور بہت گنجان آباد تھا۔ رلف فچ نے لکھا ہے کہ قحط سالی کے زمانے میں یہاں کے لوگ معمولی سی رقم کے عوض اپنے بچّے فروخت کر دیا کرتے تھے۔ اس کے اندازے[۲۸] کے مطابق وہاں سے دلّی چالیس دنوں کے سفر کی دوری پر واقع تھی۔ یہاں اس

نے دیکھا کہ عورتیں اپنے بازوؤں پر ہاتھی دانت کی بے شمار چوڑیاں پہنتی تھیں۔ ان زیورات سے عورتوں کو اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ بازو بندوں کے مقابلے میں گوشت کے کھانے سے محروم رہنا پسند کرتی تھیں"۔ اس میں پرندوں، کتوں اور بلیوں کے علاج کے لئے بہت سے اسپتال تھے۔

چَول : ایک منزل وہاں کا گورنر تھا۔ ہر قسم کی مفرد دواؤں، گرم مسالوں، ریشم، صندل، ہاتھی دانت اور چینی کے برتنوں کا بھاری مقدار میں یہاں درآمد اور برآمد ہوتا تھا۔ رلف فچ نے یہاں کے ایک کھجور کے درخت کا ذکر کیا ہے۔" اس میں ہمیشہ پھل ہوتے ہیں، اور شراب، روغن، شکر، ڈوریاں، برکے، گو بھیاں، کرم کلا نکلتے ہیں۔ اس کے پتوں سے چھپر کے مکانات، بحری جہازوں کے بادبان، اور بیٹھنے کے لئے چٹائیاں بنائی جاتی ہیں۔ اس کی شاخوں سے وہاں کے لوگ گھر بناتے تھے۔ سینک کے جھاڑو اور اس درخت کی لکڑی سے بحری کشتیاں یا جہاز بنائے جاتے تھے"۔

اس کے بعد رلف فچ نے "تاڑی کھینچنے کا ذکر کیا ہے۔ کس طرح ایک درخت کو کاٹا جاتا تھا اور اس کے تنے سے ایک مٹی کا برتن لٹکا دیا جاتا تھا جس کو صبح و شام خالی کر دیا جاتا تھا۔ جب اس میں تھوڑی سی "سوکھی کشمش" ملا دی جاتی تو تھوڑے ہی وقفے میں وہ اشیائے نوش بہت تیز یا نشاط آور ہو جاتی تھی۔

بُرہان پور : سیاح نے اس شہر کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا ہے۔ اس نے محض اتنا ہی لکھا ہے کہ" پانی کے اخراج کی خرابی کی وجہ سے برسات کے دنوں میں یہاں کی گلیاں اس درجہ ناقابل عبور ہو جاتی تھیں کہ اس کے سوائے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ انھیں گھوڑے پر سوار ہو کر پار کیا جائے۔ اس شہر میں بڑی مقدار میں سوتی کپڑا بنا جاتا تھا، ساتھ ساتھ سوتی چھینٹ کے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ وہاں غلہ و چاول کثرت سے دستیاب تھا۔

آگرہ اور فتح پور سیکری : اس زمانے میں آگرہ بڑا گنجان آباد اور صاف ستھرا ایک شہر تھا۔ وہ پتھروں کا بنا ہوا تھا، اس کی گلیاں چوڑی تھیں۔ وہاں ایک خوشنما قلعہ تھا جس کے چاروں طرف مضبوط ایک خندق تھی۔

آگرہ کے مقابلے میں فتح پور سیکری ایک بڑا شہر تھا لیکن قدیم دار الخلافہ کے مقابلے میں اس کے مکانات اور گلیاں زیادہ خوشنما نہ تھیں۔ اس زمانے میں وہ دونوں شہر لندن کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے تھے۔ اور زیادہ آباد بھی تھے۔ رلف فچ کے اپنے اندازہ کے مطابق ان دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ ۱۲ کوس تھا۔" سارے راستے میں خورد و نوش اور دوسری چیزوں کا ایک بازار تھا۔ جہاں اتنی آمدورفت اور بھیڑ بھاڑ رہتی تھی کہ جیسے کوئی شخص اب بھی ایک قصبے میں ہے۔ اور اتنی بڑی تعداد میں لوگ ہوتے تھے جیسے کہ کوئی آدمی ایک بازار میں ہے۔"

پریاگ اور بنارس: پریاگ کے قریب شیر، تیتر اور جنگلی فاختے کثرت سے پائے جاتے تھے۔ رلف نے لکھا ہے کہ بنارس ایک بڑا قصبہ تھا۔ ندی کے کنارے خوشنما بہت سے مکانات بنے ہوئے تھے، ان میں سے زیادہ تر مندر تھے۔ لکڑیوں اور پتھروں کی بنی ہوئی مورتیاں ان مندروں میں رکھی ہوئی تھیں۔" ان میں سے بعض شیر نما، بعض چیتا نما، اور بعض بندر نما، بعض عورتوں، مردوں، طاؤسوں کی شکل کی، اور بعض شیطانوں کی طرح جن کے چار بازو اور ہاتھ ہوتے تھے۔ وہاں بہت سے زائرین آیا کرتے تھے۔ بڑی مقدار میں یہاں سوتی کپڑا بنا جاتا تھا۔ بنارس کمر کے پٹکوں کے بننے کے لئے مشہور تھا۔"

پٹنہ: یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ وہاں مٹی کے بنے ہوئے سارے مکانات تھے۔ اُن مکانوں پر چھپر پڑے ہوئے تھے۔ گلیاں چوڑی تھیں۔ وہاں کپاس، بنگالی شکر، اور افیون کا بازار تھا رلف نے یہ بھی لکھا ہے کہ پٹنہ کے قریب زمین سے سونا نکالا جاتا تھا۔ وہاں کے لوگ گہرے گڑھے کھودتے تھے۔ بڑے برتنوں میں اس مٹی کو صاف کرتے تھے اور اس میں انھیں سونا مل جاتا تھا۔ گول گڑھے بنائے جاتے تھے اور ان کے چاروں طرف اینٹوں کی دیوار چن دی جاتی تھی تاکہ اس میں کنارے کی مٹی نہ گرنے پائے۔"

(ب) بادشاہ

اکبر کی شخصیت، اس کی عظمت، اور اس کی شان و شوکت کے بارے میں رلف فچ

کا بیان بالکل مایوس کن ہے۔ فی الحقیقت یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اُس نے اکبر جیسے بادشاہ کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اکبر" قمیص نما ایک قبا پہنے ہوئے تھا۔ جس کے ایک طرف ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں، اور کپڑے کا ایک چھوٹا سا کپڑا سر پر باندھے ہوئے تھا، جس کا اکثر رنگ سُرخ اور زرد ہوا کرتا تھا۔"

رالف نے یہ بھی لکھا ہے کہ خواجہ سراؤں کے علاوہ اس کے حرم میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

(س) لوگ، ملبوس اور حلیہ

گولکنڈہ کے مرد اور عورتیں ایک دھوتی پہنا کرتے تھے" اس کے علاوہ ان کے تن پر دوسرا کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا۔

گنگا ندی کی وادی میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ" سوائے ایک دھوتی کے" وہ لوگ برہنہ رہا کرتے تھے۔ مرد داڑھی منڈوایا کرتے تھے اور ان کے سروں پر لمبے بال ہوتے تھے۔ بعض لوگ ایسے تھے جن کے سر کی چوٹی کے علاوہ سر کے بال منڈے ہوئے ہوتے تھے۔ بعض لوگ ایسے تھے کہ ان کے سر کے بال کناروں سے صاف ہوتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ اُن کے سروں پر تشتری رکھی ہو" پٹنہ کے لوگ قد آور اور نازک اندام ہوتے تھے لیکن ان میں بہت سے بوڑھے لوگ پائے جاتے تھے۔ بنارس کی عورتیں چاندی، تانبا اور ٹین کی چوڑیاں پہن کر اپنے پیروں اور بازوؤں کی تزئین کیا کرتی تھیں۔ چوڑیوں کے علاوہ کپڑے پہنتی تھیں جن پر پتھر یا عقیق جڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی مانگ میں سندور بھرا کرتی تھیں۔ اس طرح اس میں تین لکیریں بن جاتی تھیں۔ پٹنہ کے لوگ ننگے پیر چلا کرتے تھے۔ اور وہ لوگ چاندی اور تانبے کی چوڑیاں پہنتے تھے۔ موسم سرما میں مرد روئی کے لبادے اور ٹوپے پہنتے تھے۔ جن میں دیکھنے کے لئے جگہ چھوٹی ہوتی تھی۔ وہ ٹوپے ڈوریوں سے کان کے نیچے بندھے ہوتے تھے۔

جہاں تک سادھوؤں کا سوال تھا لوگ ان کے بارے میں" بڑی بڑی باتیں کیا کرتے تھے"

ان میں سے رلف نے ایک کا ذکر کیا ہے۔ رلف نے ننگ دھڑنگ پایا تھا اور اس کی داڑھی لمبی تھی۔ اس کے سر پر اتنی لمبی جٹا تھی کہ اس سے اس کے اعضائے چھپے ہوئے تھے۔ اس کے ناخن دو انچ لمبے تھے۔ وہ ہمیشہ مون (خاموش) رہتا تھا لیکن اس کے بعض ایسے چیلے تھے جو اس کی ترجمانی کیا کرتے تھے۔ جب کبھی کوئی شخص اس سے بات کرتا تو وہ اپنی چھاتی پر اپنا ہاتھ "رکھ لیتا" اور سر جھکا لیتا۔

(د) رسوم اور تہوار

بچپن کی شادی: بچپن کی شادی کا عام رواج تھا۔ ایسی ایک شادی کا منظر رلف فچ نے برہان پور میں دیکھا تھا۔ لڑکے کی عمر تقریباً نو سال اور لڑکی کی چھ سال تھی۔ ان کی نئی شادی ہوئی تھی اور دونوں گھوڑے پر سوار تھے۔ اعلیٰ پیمانے پر رقص و سرود کے ساتھ اسے شہر میں گشت کرایا جا رہا تھا۔ جب دولہا دلہن گھر آئے تو ساری رات بہت خوشیاں منائی گئیں۔ لیکن بڑے وثوق سے اس نے لکھا ہے کہ وہ "ہم بستری اس وقت تک نہیں کرتے تھے جبتک ان کی عمر دس سال نہ ہو جاتی۔"

اس قسم کی شادیوں کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ لوگ اپنی حیات میں اپنے بچوں کو شادی شدہ دیکھنے کے خواہاں ہوتے تھے۔

شادی کی رسم: بنارس میں ایک شادی کی رسموں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ جوڑا (دولہا دلہن) ندی کے کنارے لایا گیا جہاں ایک برہمن ایک گائے اور بچھڑا لئے ہوئے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ سب کے سب یعنی پجاری، گائے، بچھڑا، دولہا اور دلہن ندی میں اتر گئے۔ پجاری کو ایک سفید کپڑا اور ایک ٹوکری دی گئی تھی جس میں بہت سی چیزیں تھیں۔ پجاری نے وہ کپڑا گائے کی پیٹھ پر رکھ دیا، بچھڑے کو پکڑے رہا، اور منتر پڑھنے لگا۔ دولہا پجاری کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور وہ دلہن اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ اور سب لوگ گائے کی دُم پکڑے ہوئے تھے۔" اس کے بعد رلف نے تالی کے باندھنے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔" وہ گھڑے سے گائے کی دُم پر پانی ڈال رہے تھے اور وہ پانی ان کے

تمام ہاتھ سے بہہ رہا تھا۔ اس کے بعد اس بوڑھے آدمی نے اپنے ہاتھ سے ان کے کپڑوں سے ان کا "گٹھ بندھن کر دیا"۔ اس کے بعد انھوں نے گائے اور بچھڑے کے چاروں طرف کئی بار چکّر لگائے۔ پھر غریبوں میں خیرات تقسیم کی جو ایسے موقعوں پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اس گائے اور بچھڑے کو پجاری کو دان میں دیدیا گیا۔ جب تمام رسوم ادا ہو چکیں تو دولہا اور دلہن ایک مندر میں گئے اور اپنے معبود کی پوجا کی۔ آخر میں اپنی خوشی کے ساتھ وہ اپنے گھر لوٹ آئے۔

(ز) مذہبی عقائد اور توہمات

کمبیات کے ہندوؤں میں گائے پوجنے کی "حیرت انگیز" رسم پائی جاتی تھی وہ لوگ اس کے "گوبر" سے گھروں کی دیواریں لیپتے تھے۔ وہ لوگ گوشت سے پرہیز کرتے تھے، کسی جاندار کی ہتھیا نہیں کرتے تھے، اور سبزیوں، چاول اور دودھ پر زندگی گزارتے تھے۔

برہمن ؛ جب وہ لوگ ندی میں نہانے کے لئے جاتے تھے تو دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم پر پانی ڈالتے تھے۔ پہلے وہ جنیو کو دونوں ہاتھوں سے اندر ہی اندر گھماتے تھے اور اس کے بعد ایک حصہ ایک بازو کے اوپر اور دوسرا حصہ دوسرے بازو کے نیچے ڈال لیا کرتے تھے۔ پانی میں گھس کر وہ برہنہ ہو کر عبادت کیا کرتے تھے۔" زمین پر چت لیٹ کر، تیس سے چالیس مرتبے پلٹیاں کھا کر، سورج کی طرف ہاتھ اٹھا کر، اپنے ہاتھوں پیروں کو پھیلا کر، زمین کو چوم کر اور اپنے دائیں پیر کو ہمیشہ بائیں کے آگے رکھ کر وہ لوگ ریاضتِ شاقہ کیا کرتے تھے۔ جتنی مرتبہ وہ زمین پر پلٹی کھاتے تھے۔ اتنی ہی مرتبہ انگلیوں سے یہ جاننے کے لئے لکیریں بنا دیتے تھے کہ ان کا مقررہ کام کب ختم ہوگا۔ صبح سویرے روزانہ اپنے ہاتھوں، کانوں اور گلوں پر "زرد رنگ کے ساز و سامان" سے نشانات بنلتے تھے۔ یہ لوگ ان لوگوں کے سروں اور گلوں پر بھی "سفوف" لگاتے تھے جن سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ اپنے ہاتھوں کو سر تک اٹھا کر اور "رام رام" کہکر وہ ایک دوسرے سے سلام کرتے تھے۔ جب ان کی عورتیں ندی کے کنارے جایا کرتی تھیں تو وہ گانا گاتے ہوئے دس دس، بیس بیس یا تیس تیس کی ٹولیوں میں جایا کرتی تھیں، اور نہا کر لوٹ آتی تھیں۔ وہ اپنے چہروں اور ماتھوں پر زرد رنگ کا

سفوف لگایا کرتی تھیں۔

بنارس کے عابد، زاہد اور مرتاض اوران کی عبادتیں:

بنارس میں صبح سویرے ہونے والی عبادتوں کا بڑی بے ترتیبی سے ذکر کیا گیا ہے۔ پھر بھی ان کے بارے میں ایک غیر واضح تصویر پیش کی جاتی ہے۔ مرد اور عورتیں تڑکے نہانے کے لئے ندی کنارے جایا کرتے تھے۔ یہاں بہت سے بوڑھے لوگ بیٹھے رہا کرتے تھے جو نہانے والوں کو "دو یا تین تنکے" دیا کرتے تھے۔ نہاتے وقت وہ لوگ ان تنکوں کو اپنی انگلیوں کے بیچ میں دبا لیا کرتے تھے۔ نہانے آنے والے لوگ اپنے ساتھ کپڑے میں چاول اور جو وغیرہ باندھ کر لاتے تھے۔ نہانے کے بعد ان اناجوں کو وہ لوگ ان لوگوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے جو وہاں عبادت کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ اشنان کرنے کے بعد وہ لوگ مختلف مندروں میں جاتے اور وہاں نذریں پیش کیا کرتے تھے۔

بنارس کا آدنامی مندر:

وہاں ایک دیوتا کا مندر تھا جسے مقامی زبان میں آد کہتے تھے۔ پنجے نما اس کے چار ہاتھ تھے۔ اس مندر میں ایک کنواں تھا۔ پانی کی سطح تک پہونچنے کے لئے اس کے اندر پتھروں کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کنوے کا پانی ناپاک اور بدبو دار تھا کیونکہ بڑی تعداد میں اس میں پھول ڈالے جاتے تھے۔ لیکن اس مندر کے پجاری اس میں غسل کرتے تھے اور اس بات کا اعلان کرتے تھے کہ اس میں نہانے سے ان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس کنوے کی تہ سے بالو جمع کرتے اور یہ دعویٰ کرتے کہ وہ بالو متبرک ہے۔

یہاں رلف فچ نے لوگوں کو ایک مقام پر عبادت کرتے دیکھا تھا اور وہ زمین پر پوری طرح سے اپنے ہاتھ پیر پھیلا کر عبادت کرتے تھے۔ وہ کھڑے ہوتے اور زمین پر لیٹ جایا کرتے تھے۔ بیس یا تیس مرتبہ زمین کو چومتے تھے، لیکن وہ کسی طرح سے اپنا دایاں پیر ہلنے نہ دیتے تھے۔ رلف فچ نے دوسرے عبادت گذاروں کو دیکھا جو چھوٹے بڑے پندرہ سولہ گھڑوں میں بھرے پانی کے ارد گرد چکر لگایا کرتے تھے اور عبادت کیا کرتے تھے۔ گھڑوں میں پانی ڈالتے جاتے، گھنٹی بجاتے جاتے اور منتر پڑھتے رہتے تھے۔ اس عمل کو ختم کرنے کے بعد وہ لوگ

اپنے دیوتا کے سامنے حاضر ہوتے اور نذریں چڑھاتے تھے۔

بنارس کے بعض مندروں میں پجاری لوگ گرمیوں کے موسم میں مورتیوں کو پنکھا جھلا کرتے تھے۔

گھاٹوں کے کنارے لاشوں کو جلانا:

جلانے کے لئے بہت سی لاشوں کو وہاں لایا جاتا تھا۔ بعض کو آگ میں جلا دیا جاتا اور بعض کو پانی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ کتے اور لومڑیاں ان لاشوں کو کھا لیتی تھیں۔

آدمیوں کو زندہ پانی میں بہا دینا:

جو لوگ لاعلاج مرض میں مبتلا ہو جاتے تھے تو ان بیماروں کو مندر میں لے جاتے مورتیوں کے سامنے زمین پر لٹا دیتے جہاں وہ رات بھر لیٹے رہتے۔ اگر اس رات کو ان کی حالت بہتر نہ ہوتی تو دوسرے دن سویرے ان کے اعزا ان کے قریب جاکر "تھوڑی دیر بیٹھتے اور روتے چلاتے"؛ اس کے بعد ان بیماروں کو دریا کے کنارے لے جاتے اس کنڈے سے بنائے ہوئے ایک بیڑے میں انھیں لٹا دیتے اور بہا دیتے۔

لاشوں کو بہانے کا طریقہ:

پٹنہ میں جب لوگ ندی میں لاشوں کو بہاتے تو وہ لاشیں اس طرح بہتی تھیں کہ مردوں کے سر نیچے کی طرف اور عورتوں کے اوپر کی طرف ہوتے تھے۔

ستی کی رسم:

اگر کوئی عورت رضامند ہوتی تو گجرات میں اس کو شوہر کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا: لیکن اگر وہ انکار کرتی تو اسے جل جانے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا؛ بلکہ اس کے سر کو مونڈوا دیا جاتا تھا۔ بعد ازیں اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ بنارس میں بھی اس رسم پر عمل کیا جاتا ہے۔

پٹنہ میں ایک مسلمان پیر:

وہ پیر گھوڑے پر سوار تھا۔ رلف فچ نے جب اسے دیکھا تو وہ بازار سے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اونگھ رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے لوگ

اس کے قدموں کو چھو رہے تھے اور پھر وہ اپنے ہاتھوں کو چوم رہے تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں رلیف پرفم نے اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

" وہ لوگ اسے ایک بڑا آدمی سمجھتے تھے لیکن وہ ایک کاہل بے ڈھنگا آدمی تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ ان ملکوں کے لوگ ایسے بکواسی اور ریاکار لوگوں سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔"

حیات ذاکر حسین

(از خورشید مصطفیٰ رضوی)

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی خدمت علم اور ایثار و قربانی سے بھرپور زندگی کی کہانی جس میں اردو ماخذ اور ملکی و بیرونی اخبارات و رسائل کی چھان بین سے تمام حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

شروع میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا قیمتی پیش لفظ ہے

قیمت مجلد: ۲۵/ روپے

تین تذکرے

یہ کتاب ان تین کتابوں کی تلخیص ہے۔ "مجمع الانتخاب" "طبقات الشعراء" اور "گل رعنا" یہ تلخیص جن قلمی نسخوں سے مرتب کی گئی ہے وہ سب اپنے اپنے مؤلفین کی نظروں سے بھی گذر چکے ہیں اس لئے ان کا متن مستند ہے۔ ادبیات اردو کے سلسلے میں یہ تذکرے نہایت اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تلخیص نگار، نثار احمد فاروقی صاحب

مجموعی صفحات ۳۳۵

قیمت مجلد: ۳۰/ روپے

برہان

جلد ۱۱۲	دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق رجب المرجب ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۶

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

ذرا تصور کیجئے ۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہماچل پردیش (نشستیں ۶۸) راجستھان (نشستیں ۲۰۰) اور ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست یوپی اتر پردیش (نشستیں ۴۲۵) مدھیہ پردیش (نشستیں ۳۲۰) بی جے پی سرکار کو برطرف کرکے ان میں ۶ دسمبر ۱۹۹۳ء سے پہلے چناؤ نتائج اگر سیکولر جماعتوں و سیکولر عوام کی توقع کے خلاف اور بابری مسجد کی مسماری پر فخر و انبساط سے سر اونچا کرنے والی بی جے پی کی منشا و مرضی کے مطابق آگئے ہوتے تو ہندوستان کا سیاسی وسماجی ڈھانچہ کس طرح کا ہوجاتا۔ اور دسمبر ۱۹۹۳ء کا پورا ہی مہینہ بی جے پی اپنی کامیابی و فتحیابی کے غرور و تکبر میں مست جھومتی ناچتی اور یہ ڈھنڈورہ پیٹتی کہ "بھگوان رام نے اپنے مندر نرمان کے لئے بھاجپا کو اتر پردیش کے راج سنگھاسن پر براجمان کرادیا ہے اور اب دنیا کی کوئی بھی طاقت بی جے پی کو بھگوان رام کے آشیرواد سے مرکزی حکومت کی گدی سنبھالنے کے لئے روک نہیں سکتی ہے" اور اسی کے ساتھ تمام ہندوستان میں ۶ دسمبر جشن کے روپ میں ہلڑ بازی کرتے ہوئے جسطرح منایا جاتا اس پر دنیا بھر کے مسلمانوں کے ساتھ انصاف، انسانیت اور رواداری سے سرشار تمام غیر مسلم بھی اپنے اپنے گھروں میں بند رہ کر سینہ پیٹ پیٹ کر ہائے! ہائے کر رہے ہوتے۔ اور پھر ہندوستان کے مختلف شہروں، قصبوں، دیہاتوں، علاقوں، گلیوں میں مظلوم و بے گناہ انسانوں پر ظلم و جبر کا وہ پہاڑ ٹوٹ پڑتا جس کی نظیر تاریخ میں کہیں کہیں ہی نظر آئے گی، ہزاروں بچے یتیم ہوتے، ہزاروں عورتیں بیوہ ہو ہو جاتیں اور لاکھوں انسان خانماں برباد ہوکر رہ جاتے۔ فرقہ پرستی کا دیوتا پوری طاقت و قوت کے ساتھ اپنے شیطانی جوہر دکھائی دیتا ہی نظر آتا۔

---

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳ء کا ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہندی روزنامہ "نوبھارت ٹائمس" نئی دہلی کے صفحہ ۸ پر یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ اور سیکولر خیالات کے مالک جناب ملائم سنگھ یادو اور بی جے پی کے کٹر وادی سابق وزیر اعلیٰ یوپی جناب کلیان سنگھ کا ایک ایک انٹرویو شائع ہوا ہے ___ بی جے پی کے جناب کلیان سنگھ کہتے تھے موجودہ انتخابات کا اوّل مدعا مندر

نرمان ہی ہے اور اس کے ذیل میں ان کا کہنا تھا؛ "جہاں تک بی جے پی کا سوال ہے ہم ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے واقعہ کو انتخاب کے ذریعہ سے عوام کا استصواب رائے مانیں گے۔ میرا اعلان ہے کہ اگر انتخاب میں بی جے پی پچھلی اسمبلی کی اپنی ممبری تعداد ۲۲۲ سے کم سیٹ جیت پائی تو ہم مان لیں گے کہ لوگوں نے اس واقعہ (۶ دسمبر ۱۹۹۲ء) کے خلاف ووٹ دیا اور اگر بی جے پی نے زیادہ سیٹیں حاصل کیں تو ہمیں عوام کی حمایت حاصل ہوئی سمجھئے۔

جناب ملائم سنگھ یادو اور ان کے انتخابی ساتھی بہوجن سماج پارٹی کے لیڈر جناب کانشی رام کے متعلق جناب کلیان سنگھ کا کہنا تھا کہ ان دونوں کو زیادہ سے زیادہ ۵۵ سیٹیں ملیں گی۔ اور ۵۶ ویں سیٹ کے لئے یہ دونوں ترس جائیں گے۔ بی جے پی کو کم سے کم ۲۲۰ سیٹیں ملیں گی؛"

اس کے جواب میں جناب ملائم سنگھ کا کہنا تھا کہ اگر بی جے پی کو اتنا ہی یقین واعتماد و بھروسہ ہے تو گھر جاکر آرام کریں، کیونکہ ادھر ادھر مارے مارے گھوم رہے ہیں اور انتخاب کی تیاریوں میں جٹے ہوئے ہیں ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس بار بی جے پی کا "مندر مدعا" نہیں چلے گا۔"

اسی کے ساتھ بی جے پی کا یہ بھی نعرہ تھا "آج پانچ پردیش، کل سارا دیش؛" دوسرا ہم جو کہتے ہیں، سو کرتے ہیں؛" اب پانچ صوبوں کے اسمبلی انتخابات کے نتائج عوام کے سامنے آچکے ہیں۔ اگر ان نتائج کا گہرا تجزیہ کر کے ایک جملہ میں اس کا نچوڑ بیان کیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس اسمبلی انتخابات میں ہندوستانی عوام نے فرقہ پرست طاقتوں جماعتوں کو فرقہ وارانہ معاملات کے لئے بالکل ٹکا سا جواب دیدیا ہے اور کسی بھی حالت میں فرقہ واریت کی سیاست کو مات دیدی ہے ـــــ دہلی کو چھوڑ کر جہاں فرقہ واریت سے کوئی ٹکراؤ نہیں تھا صرف مقامی مسائل ہی کا بول بالا تھا اور جسے عوام نے اپنے اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے لئے صحیح سمجھا اسے منتخب کیا۔ باقی چاروں صوبوں راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش اور ہماچل پردیش میں بی جے پی کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے خلاف ہی عوام نے ان پارٹیوں جماعتوں کو منتخب کیا جو جذباتی سیاست سے بلند عوام کے سب طبقات کو ساتھ ملا کر چلنے کی صلاحیت واہلیت کی دعویدار تھیں چنانچہ اتر پردیش میں بی جے پی کی جو درگت ہوئی ہے ایمانداری کا تقاضہ ہے کہ بی جے پی والے کہنے اور اعلان کے مطابق اب فرقہ پرستی کی سیاست سے توبہ کریں۔ اور رام مندر نرمان کے لئے تاناشاہی ہٹ دھرمی

سے باز آئیں اور مندر زبان کے لئے آپسی بھائی چارہ، یا پھر عدالتی رائے و فیصلے کے آگے اپنا سر جھکا دیں اسی میں ملک و عوام کی بھلائی ہے۔ مدھیہ پردیش میں جو بی جے پی اکثریت کے ساتھ حکومت کر رہی تھی اور اس کے مدمقابل کانگریس ۵۶ سیٹیں ہی لے پائی تھی اس بار وہ بی جے پی سے پوری طرح سبقت لے چکی ہے اور اپنے اکیلے بوتے پر مدھیہ پردیش میں بی جے پی کی جگہ حکومت کی کرسی پر بیٹھ چکی ہے۔ وہاں نہ اسے رام مندر کا نعرہ کام آیا اور نہ ہی تیز طرار فرقہ وارانہ زہریلی تقریریں کرنے والی اوما بھارتی، سادھوی رتمبرا اور راج گھرانے کی قابل تنظیم شریمتی وجے راجے سندھیا ہی کی بھرپور مدد ہی کام و راس آئی۔ ہماچل میں بی جے پی کی عبرتناک شکست بی جے پی کو عرصہ دراز تک ماتم میں ڈبوئے رکھے گی۔ راجستھان میں اس کی کشتی ڈانواں ڈول ہی رہے گی اور یوپی میں اس کا سب سے بڑا حریف جناب ملائم سنگھ یادو اس کے منصوبوں کو ملیا میٹ کرنے کے لئے میدان عمل میں کمربستہ ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بی جے پی ان انتخابات سے کوئی سبق حاصل کرے گی؟ یا پھر وہ اسی چال بے ڈھنگی پر چلتی رہے گی جس کا انجام صرف ملک و قوم کی تباہی و تنزلی کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا ہے۔ تعمیر و فلاحی سیاست کے لئے ضروری ہے کہ ہر تخریبی راستے سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ فرقہ پرستی سے ملک کا بھلا نہیں ہو سکتا ہے اور آخر کار ان پارٹیوں کا بھی بُرا حشر ہے جو فرقہ پرستی کے راستے کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا آزاد ہندوستان میں اسی جماعت کی سلامتی و بقا رہے جو اپنے سیکولر کردار کے ساتھ ہر طبقہ کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملک کی فلاح و بہتری کے کاموں کو ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ۱۹۹۳ء کے اسمبلی انتخابات میں جہاں ملائم سنگھ یادو کی سیکولر شخصیت ابھر کر سامنے آئی ہے وہاں جنتا دل کا وہ چہرہ بھی صاف ہو گیا ہے جسے ایک نظر دیکھنے سے سیکولریت اور اقلیت کے تئیں ہمدردی کا احساس ہوتا ہے مگر اس اسمبلی انتخابات کا گہرا تجزیہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کا وجود فرقہ پرست طاقتوں کے وجود کو تقویت پہنچانے کا باعث ہے۔ دانستہ یا نادانستہ جو بھی سمجھ لیں پہلے بھی اور اب بھی اگر ہندوستان کی سیاست میں فرقہ پرست طاقتوں کو جس قدر بھی کامیابی نصیب ہوئی ہے اس میں بڑا دخل جنتا دل کے میدان میں آنے کا ہے۔ یہ بات بڑی ہی اطمینان کی ہے کہ سیکولر عوام کی اکثریت نے اس بات کو سمجھا ہے اور جہاں سمجھا ہے وہاں فرقہ

پرست پارٹی کو منہ کی کھانی پڑی ہے اور جہاں کے عوام بے خبر رہے ہیں اور سادہ لوح بنے رہے وہاں جنتادل کو انھوں نے اپنا مسیحا سمجھتے ہوئے اس کا دامن تھامے رکھا جسکے نتیجہ میں فرقہ پرست طاقتیں وہاں چٹان کی طرح مضبوط رہیں۔ چنانچہ اس اسمبلی انتخاب کا یہ پہلو بڑا ہی عبرت انگیز ہے کہ یوپی کے بیشتر مسلم اکثریتی علاقوں میں جنتادل کی موجودگی نے بی جے پی کے امیدواروں کو کامیاب کرایا سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، بلند شہر وغیرہ کے اکثر مسلم اکثریتی علاقوں میں بی جے پی امیدوار بڑی شان سے کامیاب ہوئے اگر خدانخواستہ جناب ملائم سنگھ یادو مسلم ووٹوں پر بھروسہ کرتے ان کے بکھرنے کا انھیں ڈر نہ ہوتا اور بہوجن سماج پارٹی سے انتخابی مفاہمت نہ کرتے اور انھیں سماج کے غیر مسلم کمزور طبقہ کا ووٹ نہ ملا ہوتا تو یوپی میں بی جے پی اپنے بل بوتے پر آج سرکار کی گدی پر براجمان ہوتی اور پھر اس کی اسی طرح کی حرکتیں ہوتیں جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء تک جاری تھیں!

اللہ پاک کا شکر و احسان ہے کہ ہندوستان کی بقاء و سلامتی کے لئے فرقہ پرست طاقتیں اس اسمبلی انتخاب میں زیادہ نہ ابھر سکیں اور دب گئیں، خدانخواستہ اگر نتیجہ الٹا ہوتا تو ہندوستان کا نقشہ ہر لحاظ سے ایسا ہوتا جسکا ہم دور دور تک تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں — اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے وہ اپنے بندوں کی خبر گیری رکھتا ہے اللہ سے زیادہ اپنے بندوں کی چاہ اور کس کو ہو سکتی ہے۔ ۱۹۹۳ء کے اسمبلی انتخابات ہر محب وطن ہندوستان کے لئے باعث اطمینان بخش ہیں۔ یہ فضل خداوندی ہے۔

راجستھان و گجرات میں سیرت طیبہ کے اثرات

عبدالرؤف خاں (ایم۔ اے) اودئی کلاں، راجستھان

جب آفتاب عالمتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی ضیاپاشیوں سے ایک عالم روشن ومنور ہوجاتا ہے اور شب دیجور کی دبیز تاریکیاں محو ہوجاتی ہیں۔ ٹھیک یہی کیفیت سارے جہان کی اس وقت ہوئی جب سرزمین عرب میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہوئی تو آپؐ کے نورِ نبوت سے تمام تاریکیاں کافور ہوگئیں۔ جب موسم بہار آتا ہے تو اس کے جانفزا اور حیات افروز اثرات کائنات کی تمام اشیاء پر مرتب ہونا فطری بات ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جن روح پرور اور حیات افزا ربانی تعلیمات کے ساتھ مبعوث فرمائے گئے ان کے فیوض و برکات سے کائناتِ عالم کا ہر گوشہ درخشاں ہوگیا۔ ناممکن تھا کہ ہندوستان جنت نشان جسے حضرت آدم علیہ السلام کا پہلا مسکنِ ارضی ہونے کا شرف حاصل ہے، آپؐ کی تعلیمات و ہدایات سے محروم رہتا۔ یہی وہ سرزمین ہے جس کے بارے میں آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے۔ جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں یوں کہا ہے:

ع میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

اثراتِ سیرۃ اور اثراتِ اسلام ایک ہی سکّے کے دو پہلو اور لازم و ملزوم چیز ہیں۔ چنانچہ جب ہم یہ عرض کریں کہ فلاں خطّہ پر اسلام کے فلاں فلاں اثرات مرتب ہوئے تو اس کا مفہوم ومنشا لازمی طور پر یہی ہوگا کہ سیرتِ طیبہ کے کسی مقام پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور ان اثرات کو کسی خطہ یا ملک میں پہنچانے کے کیا ذرائع اور عوامل تھے جن کے

سبب وہاں اسلامی تعلیمات پہونچیں۔

لیکن یہاں اس مختصر مضمون میں ہمارے ملک کے صرف دو خطوں گجرات اور خصوصاً راجستھان پر سیرتِ نبوی کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کے بارے میں مجملاً عرض کرنا ہے بعثتِ نبوی کے وقت ہندوستان کی جو حالت تھی اُسے عصرِ جدید کے مایۂ ناز مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظِ مستعار میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ مسلمانوں کی آمد کے سبب اسلامی تعلیمات نے یہاں کے معاشرہ کو کس طرح مستفیض اور مستفید کیا!

"ہندوستان کے مؤرخین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا (جو کسی زمانہ میں علم و تمدن اور اخلاقی تحریکات کا مرکز رہا ہے) پست ترین دور تھا۔ ہندوستان کے اردگرد دوسرے ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط رونما تھا، اُس میں یہ ملک کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات تھے جن میں اس ملک کو شانِ یکتائی حاصل تھی۔ ان خصوصیات کو تین عنوانات کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔ (۱) معبودوں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت (۲) جنسی خواہشات کی بحرانی کیفیت اور (۳) طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات[۱]"

دنیا کی دیگر اقوام کے حالات بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھے یعنی اس روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہ آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے دعوت و اصلاح کا کام اس کے صحیح راستے سے شروع کیا جو آپ کی حیاتِ مبارکہ میں جزیرہ نمائے عرب میں پوری طرح محیط ہو گیا اور اس کے بعد آپؐ کی تربیت یافتہ اس جماعت صحابہؓ (COMPANIANS) نے (جس کی نظیر و مثال، حضرت آدم سے لیکر نہ صرف ایں دم بلکہ قیامت تک آسمان کی آنکھوں اور زمین کی کوکھ (گود) نے نہ دیکھی اور نہ دیکھ سکے گی) دعوت و اصلاح کے کام کو تندہی، مستعدی اور سرعت کے ساتھ آگے

---

[۱] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۵۶، ۵۷۔

بڑھایا اور پھر اپنے اپنے دور میں تابعین و تبع تابعین، محدثین و فقہا اور علماء حقانی و صوفیاء کرام نے اشاعت اسلام کا بیڑا اٹھایا۔

ہندوستان، جس سے عربوں کے نہایت قدیم تجارتی، علمی، ثقافتی اور مذہبی روابط تھے، بعثت اسلام کے بعد ان روابط میں اور تیزی و سرگرمی آئی چنانچہ تاریخی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہد خلافت فاروقی ہی سے ہندوستان کی طرف صحابہ کرام کا رخ ہو گیا تھا اور حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت تک کم از کم پچیس صحابۂ کرام کے قدوم میمنت لزوم (آمد/تشریف آوری) سے سرزمین ہند مشرف ہوئی۔ تابعین و تبع تابعین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔[1] بہرحال ان تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ، گجرات، کارومنڈل اور ملیبار میں اسلام نے اپنے قدم آہستہ آہستہ بڑھانے شروع کئے۔ لیکن یہاں ہمیں موضوع کے مطابق صرف راجستھان اور گجرات کے علاقوں میں سیرت پاکؐ کے جو اثرات رونما ہوئے صرف انہی کا اجمالی خاکہ نذر قارئین کرنا ہے۔

ہندوستان کے مغربی ساحل پر ابتدا میں اسلامی تعلیمات کو پھیلانے والے عرب تاجر تھے۔ لیکن بعد میں بالعموم پورے براعظم (Indian subcontinent) ہند و پاک میں سیرت کا پیغام صوفیاء کرام کے ذریعہ پھیلا مگر راجستھان میں یہ پیغام صرف اور صرف صوفیائے عظام کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں برگ و بار لایا۔

اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے بارے میں اسلامی دنیا کے لئے ہندوستان کی دریافت دریافت "نئی دنیا" (امریکہ) کی دریافت سے کم انقلاب انگیز اور عہد آفریں واقعہ نہ تھا۔ گویا عرض کیا کہ ہمارے ملک میں اسلام کے حوصلہ مند دستے پہلی صدی ہجری یعنی خلافت فاروقی کے دور ہی سے آنا شروع ہو گئے تھے جنہوں نے سندھ اور گجرات کے بعض حصوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا اور یہ تسلط بعد میں بھی برقرار رہا لیکن راجستھان میں تعلیمات

---

[1] برائے تفصیل دیکھئے مقالہ "ہندوستان میں علماء و محدثین کی دینی خدمات" از مولانا غازی عزیز مشمولہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ ص ۵۵ تا ۹۵ مجریہ جولائی ستمبر ۱۹۹۲ء

نبوتؐ کی اشاعت کی سعادت صوفیائے کرام کے حصے میں آئی اور وہ بھی چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کے۔ جن میں اولیت کا شرف خواجۂ بزرگ شیخ الاسلام حضرت معین الدین حسن سجزیؒ (سنجری) متوفی ۶، رجب ۶۳۳ھ/۱۶، مارچ ۱۲۳۶ء) کو حاصل ہے گویا اس خطہ کی روحانی تسخیر (فتح) و اخلاقی اور ایمانی فتح خواجہ اجمیریؒ کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ جنھوں نے اجمیر کو اپنا مرکز بنا کر اپنی پاکیزہ زندگی اور داعیانہ و مصلحانہ کوششوں نیز روحانی عظمت سے راجستھان میں خصوصاً اور ملک کے دیگر صوبوں میں عموماً، اپنے خلفاء کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو عام کیا۔ جس کی وجہ سے آج راجستھان کی سرزمین کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہے۔ سیرتِ پاک کی تعلیمات کے عام ہونے سے یہاں مذہبی، معاشرتی اور سیاسی وسماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور جو سرزمین ہزاروں برس سے صحیح یقین و معرفت سے محروم اور توحید کی صدا سے ناآشنا تھی، اس کی فضائیں اذانوں اور دشت وجبل (جنگل اور پہاڑ) "اللہ اکبر" کی صداؤں سے گونج اٹھے۔ حضرتِ معین الملت والدین خواجہ اجمیریؒ سے لاکھوں باشندگانِ راجستھان کو بلا امتیازِ مذہب و ملت فیض پہنچا اور ہزاروں افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ راجستھان کی جسور وغیور راجپوت قوم کی حالت عرب کے دورِ جاہلیت سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ بچیوں کو زندہ درگور کرنا، ستی و جوہر کی قبیح رسم نیز باہمی لڑائی جھگڑا عام بات تھی لیکن اسلامی تعلیمات کے اثرات سے اس قوم نے ان افعال شنیعہ (برے کاموں) سے پرہیز کیا چاہے یہ داخل اسلام نہ ہو سکے۔ راجپوتوں کے شیخاوت قبیلہ کی وجہ تسمیہ ([illegible]) ہی یہ بتلائی جاتی ہے کہ کسی بزرگ صوفی "شیخ" کی دعا سے سردارِ قوم کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا چنانچہ اس وقت سے وہ شیخاوت کہلائے اور ان کا علاقہ (جھنجھنو اور سیکر) آج بھی شیخاواٹی کہلاتا ہے یہ برادری صرف ذبیحہ گوشت ہی استعمال کرتی ہے نہ کہ "جھٹکا" کیا ہوا۔

ہندوستانی فکر و فلسفہ میں روحانیت ([illegible]) کو ہمیشہ اعلا مقام حاصل رہا ہے اس لئے یہاں کی سرزمین میں اسی تحریک کا پودا برگ و بار لا سکتا ہے جس کا تعلق روحانیت سے ہو چنانچہ صوفیائے کرام بھی اسلامی تعلیمات کو یہاں اسی لئے مقبول بنا سکے کہ ہندوستان کے باشندوں کا رجحان روحانیت اور ماورائیت کی طرف پہلے سے موجود تھا اور آج کی مادّی

(Materialistic) ترقیوں کے زمانے میں بھی دوسرے ممالک کی بہ نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔

راجستھان میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں حضرت خواجہ کی کامیابی کا دوسرا راز خانقاہی اور جماعت خانوں کا نظام قائم کرنا تھا جہاں عوام الناس پر خلوص وایثار کے ساتھ خرچ کیا جاتا تھا اور آسان طریقہ پر ان کی اصلاح کی جاتی تھی جس سے مسلم وغیر مسلم یکساں طور پر فیضیاب ہوتے تھے۔ ڈاکٹر Z. A. Desai اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

"Their Khanqas" and the "Jamat Khanas" served as hospices for travellers and wayfarers and also as training centres for the novices, resounding with lessons and discussions on theology, mysticism, scholastic philosophy, ethics, morality etc, at which the Saint was the principal speaker."

افسوس کہ آج ہم نے خانقاہوں کا وہ Institution ختم کردیا جہاں سے اسلام کی ربانی ہدایات کی اشاعت وترویج ہوتی تھی اور اس کی جگہ درگاہی Institution رائج کرلیا جو شکم پروری اور اشاعت بدعات کا مرکز بن کر رہ گئی ہیں جہاں بجائے صرف کرنے کے آمدنی کا لالچ زیادہ ہے۔

بہرکیف اسلامی تعلیمات سے راجپوتانہ جیسے جاگیردارانہ نظام کے حامل صوبہ میں جو اثرات مرتب ہوئے ان اثرات نے سب سے پہلے اس جاگیردارانہ نظام کی جڑوں ہی پر تیشہ (کلہاڑا) چلایا۔ سماج کے پسماندہ طبقات جو صدیوں سے اس نظام کی چکی میں پس رہے تھے۔

دیکھیے مقالہ "Malfuz Literature As a Source of Political, Social and Cultural History of Gujrat and Rajasthan in 15th Century" Khudabakhsh Library Journal 53 P. 7.

انہیں پہلی دفعہ آزادی و مساوات اور اخوت و بھائی چارہ کا احساس ہوا اور وہ لوگ جوق در جوق مشرف با اسلام ہونے لگے اور ان میں احترام آدمیت اور عزتِ نفس بیدار ہوا۔ یہاں کے اکثریتی طبقہ (راجپوت) میں ستی جیسی قبیح رسم کے انسداد اور ہندو معاشرہ میں عورت کو باعزت مقام حاصل ہونے میں اسلامی تعلیمات کا اثر و نفوذ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ شاردا ایکٹ بھی جو ہرولاس شاردا اسکنہ اجمیر کے ذریعہ پاس کرایا گیا، ہندو عورتوں کے لئے اسلامی تعلیمات ہی کا تحفہ ہے۔ میرا بائی جیسی ہوشیار عورت نے بھگتی تحریک کے ذریعہ ہندو معاشرہ کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا وہ بھی سیرتِ نبویؐ کی تعلیمات ہی کا ردِ عمل تھا۔

آج اجمیر کے گرد و نواح میں چیتیہ اور میرات نام کی برادریوں نیز موہل چوہانوں (Mohel chauhans) میں از سرِ نو گروہی اور جماعتی عصبیت سے بالاتر ہو کر دعوت و اصلاح کے کام کو فروغ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ صاف گوئی کے لئے معاف رکھا جاؤں کہ آج وہاں کچھ لوگ صرف جماعتی نام و نمود کی خاطر کام ضرور کر رہے ہیں مگر وہ قطعی طور پر ایک بڑے سارے خطے کے لئے ناکافی ہے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ آج پھر ع آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے جیسے حالات پیدا ہو گئے ہیں، اس لئے اخلاص، ایثار اور خاموشی کے ساتھ پیکرِ عمل بن کر پھر اسی نہج (طریقہ) پر وہاں دعوت و اصلاح کا کام کرنے کی ضرورت ہے جس دردمندی اور دل سوزی سے لوجہ اللہ حضرت خواجہ اجمیریؒ، سلطان التارکین ابو احمد شیخ حمید الدین، صوفی السعیدی بن محمد سوالی ناگوری علیہ الرحمہ متوفی ۹ ربیع الآخر ۶۷۳ھ/ ۱۲ اکتوبر ۱۲۷۴ء نیز خواجہ نصیر الدین عرف شیخ احمد کھاٹو (کھٹو) متوفی ۲۹ شعبان ۸۱۹ھ/ ۲۲ اکتوبر ۱۴۱۶ء نے اپنے اپنے دور میں کیا تھا۔ جنہوں نے اجمیر، ناگور، ڈیڈوانہ، چتور گڈھ، سانبھر، کھاٹو، لاڈنوں، تلواڑا وغیرہ میں شمع اسلام روشن کی تھی۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ راجستھان کے مغربی علاقوں کے بارے میں تھا جو گجرات سے نسبتاً متصل ہیں۔ لہٰذا مشرقی راجستھان کے سلسلہ میں بھی چند باتیں عرض کرنا ضروری ہے کہ یہاں سیرتِ طیبہ کا پیغام صوفیائے کرام کے بجائے شاہی افواج میں شریک علماء و فضلاء کے ذریعہ پہنچا جس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ قلعہ رنتھبور (Ranthambhor) پر سلاطینِ دہلی کے

بار بار حملے ہوتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود سلطنت عہد کے اواخر اور مغل عہد کے اوائل میں پرگنہ بیانہ و ہنڈون اور ٹساور میں مہدوی تحریک نے نمایاں خدمات انجام دیں جو اس تحریک کے خاص مراکز (ـــــ) تھے۔ یہاں اس تحریک کے منفی پہلو سے سردست سروکار نہیں۔ اس تحریک کے مثبت اثرات کے لئے تذکرہ مولانا آزاد ملاحظہ کیا جائے۔ لیکن مشرقی راجستھان میں جس تحریک نے سب سے گہرے اثرات چھوڑے، وہ تحریک تھی سید احمد شہیدؒ کی۔ جو عرصہ تک نواب میر خاں والئی ٹونک کے ہمراہ اس علاقہ میں رہے۔ نیز حضرت سید شہیدؒ جب اپنے قافلہ کے ساتھ ترکِ وطن کرکے صوبہ سرحد کو تشریف لے گئے تب بھی آپ گوالیار سے قرولی (ضلع سوائی مادھوپور) پہنچے جہاں آپ نے ایک رات رئیس قرولی جلال الدین کے اصرار پر قیام فرمایا اور پھر خوشحال گڈھ (گنگا پور سٹی) ہوتے ہوئے آپ حیدرآباد سندھ پہنچے [1]
آپ جس منزل پر بھی قیام فرماتے سینکڑوں لوگ آپ کے دست مبارک پر تجدید ایمان کرتے حضرت سید بابا کا قافلہ چونکہ راقم الحروف کے گاؤں کے بالکل قریب سے گذرا تھا لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

ان پاک نفوس کی جماعت کے بارے میں مولانا مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے کہ حضرات صحابۂ کرام کے بعد اگر آسمان نے کوئی پاکیزہ جماعت دیکھی تو وہ صرف یہی جماعت تھی (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک) راقم کے خیالِ ناقص میں مغربی راجستھان کی نسبت آج بھی مشرقی راجستھان میں اسلامی اثرات نسبتاً بہتر پائے جاتے ہیں جو اسی تحریک کا سبب معلوم ہوتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ عہد صحابہؓ ہی سے شروع ہو گیا تھا اور بعد ازاں۔ تابعین و تبع تابعین یہاں تشریف لاتے رہے اور سیرتِ طیبہ کے اثرات کا دائرہ اپنے علم و عمل سے وسیع کرتے رہے لیکن ان حضرات کے فیوض و برکات سے سندھ و گجرات اور مغربی ساحل کا علاقہ ہی براہ راست متمتع ہوا۔ کہتے ہیں کہ گجرات میں سب سے

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی از مولانا سید محمد میاں صاحبؒ ۲: ۸۸۔ ۱۸۷ مطبوعہ ۱۹۸۵ء

پہلے دورِ فاروقی (۱۵ھ) میں والی بحرین و عمان حضرت عثمانؓ بن ابی العاص الثقفی نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص ثقفیؓ کو گجرات کے شہر بھڑوچ کی مہم پر روانہ کیا تھا چنانچہ یہ مقام اسلام کے زیرِ نگیں آگیا تھا اور آج وہاں مسلمانوں کی سب سے زیادہ دیہاتی آبادی اسی علاقے میں ہے۔ شاید یہ بات تعجب کے ساتھ پڑھی جائے کہ بھڑوچ کے مسلمانوں میں زیادہ تعداد سنی بوہروں کی ہے، جو کاشتکاری کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس علاقے میں تھوڑی تعداد اچھوت نومسلموں کی ہے جنہیں "موے سلام" کہتے ہیں۔

یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں عربوں کی نوآبادیاں قائم تھیں اور یہ آبادیاں تجارتی تعلق کی نوعیت سے آباد ہوئی تھیں یعنی مغربی ساحل پر اسلام براہِ راست عرب تاجروں کے ذریعہ پہنچا جو عجمی اثرات سے پاک تھا۔ ان عرب تاجروں کے اثرات سے، جو تاجر ہونے کے علاوہ، اسلام کے داعی اور مبلغ بھی تھے، نہ صرف یہ کہ باہر سے مسلمان آکر آباد ہوئے بلکہ مقامی باشندوں نے بھی، اُن کے اسلامی اصولِ تجارت حسنِ اخلاق اور عمدہ سیرت و کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ گجرات کا ایک راجہ اپنی اس مسلمان رعایا سے انتہائی متاثر تھا۔ عرب سیاح سلیمان سوداگر نے، جس نے اپنا سفرنامہ ۲۳۵ھ میں تمام (ختم) کیا۔ گجرات کے وَلّبھی (Vallabhi) راجہ کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کو اور اس کی ہندو رعایا کو عربوں اور مسلمانوں سے بڑی محبت ہے اور اس کی رعایا کا عقیدہ ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی لئے زیادہ بڑی ہوتی ہیں کہ وہ عربوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب آبادی اسلامی تعلیمات کا عمدہ نمونہ تھی۔ اور ان کے یہ اثرات جنوبی ہند کے ساحل پر آج بھی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

کھنبایت میں بھی تقریباً اسی زمانہ میں مسلمان آباد ہو گئے تھے جو بڑے خوش عقیدہ

---

[1] برائے تفصیل رجوع کنید عرب و ہند کے تعلقات از۔ مولانا سید سلیمان ندوی ص ۲۵۹ تا ۲۷۷ مطبوعہ ۱۹۸۴ء اعظم گڑھ۔

اور دیندار تھے۔ ان کی ایک جامع مسجد بھی تھی جس میں باقاعدہ خطیب و امام کا انتظام تھا۔ گجرات میں سردار کا راجہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت عدل و انصاف کے ساتھ پیش آتا تھا ساحلی مقامات کو چھوڑ کر گجرات کے جس شہر میں اسلامی مبلغ سب سے پہلے آئے وہ سردار یا انہلواڑا یعنی پٹن ہی تھا۔ جسے آج بھی اسلامی مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ شہر احمد آباد کی تعمیر سے پہلے بھی بڑا پُر رونق اور گجرات کے ہندو راجاؤں کا دار السلطنت تھا۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ مسلمان فاتحین کی آمد سے پہلے مسلمان تاجر اور مشائخ بحیثیت داعی دین کہاں کہاں جا پہونچے تھے۔ مسلم عہد حکومت میں صوفیائے کرام بھی گجرات پر خاص توجہ مرکوز کی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے تین خلفاء نے پٹن میں اشاعت و ترویج، اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔ ابن شیخ شرف الدین کو اولیت حاصل ہے جنہوں نے پٹن کو اپنا مرکز بنایا۔ گجرات ہی وہ مقام ہے جہاں سے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ متوفی کو ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۱ھ / ۲۰ جون ۱۶۴۱ء کو بوئے عشق آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حدیثِ پاک کے سلسلے میں گجرات میں بڑا کام ہوا۔ گجرات میں آج بھی تحریکِ دعوت و اصلاح کا کام الحمدللہ بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

الغرض گجرات و راجستھان اسلام کی آمد سے قبل جہالت و تاریکی کے قعرِ مذلت (ذلت کے غار) میں پڑے ہوئے تھے۔ ہندو بالخصوص راجپوت سوسائٹی میں انسانی حقوق بُری طرح پامال ہو رہے تھے۔ پورا معاشرہ، طبقاتی و نابرابری، چھوا چھوت قمار (جوا) و سودخوری اور غلامی وغیرہ کی لعنت میں مبتلا تھا۔ منو مہاراج کے قانون کے مطابق معاشرہ میں عورت کا کوئی درجہ اور حیثیت نہ تھی، اسے خاوند کی وفات پر اس کے لاش کے ساتھ زندہ جلنا پڑتا تھا۔ وہ بیک وقت کئی بھائیوں کی زوجہ ہوسکتی تھی (پانڈوؤں نے راجستھان کے بیراٹھ نامی قصبہ کے جنگلات میں اپنے ایام "بن باس" بسر کئے تھے اس لئے ان کا اثر پڑنا لازمی تھا) اسے جوئے میں ہارا جا سکتا تھا۔ کم سنی میں بیوہ ہونے پر اسے دوسری شادی کی اجازت نہ تھی۔ اچھی نسل لینے کے لئے اپنی بیوی کو دوسروں کے پاس بھی بھیجا جا سکتا تھا جسے [illegible] کہکر جائز ٹھہرالیا تھا۔ بہت سی لڑکیوں کو دیو داسی کا خوبصورت نام دے کر کسی مندر (مٹھ

کے "بھینٹ" کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ ایک ایک راجہ کے حرم میں سیکڑوں ہزاروں رانیوں اور داسیوں کی فوج ہوتی تھی جن پر سخت پہرہ رہتا تھا۔ جہیز کی لعنت عام تھی۔ لیکن اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو تخلیق میں مساوی حصہ دیا ہے گویا حقوق انسانی میں عورت و مرد کا درجہ برابر ہے۔

اسلامی نظریۂ مساوات کا اثر پہلے دن سے ہی اسلامی معاشرہ میں ظاہر ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت بلال کو حضرات شیخین (حضرت ابو بکر و عمر رضوان اللہ تعالیٰ) "سیدنا" ہمارے آقا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ سُود و جُوا جس میں ایک شخص کی دولت بلا استحقاق۔ دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اسلام نے سود اور جوا کی تمام اقسام کو حرام قرار دیا اسی طرح شراب اور دیگر منشیات کو بھی حرام بتلایا گیا ہے۔ چھوت چھات کا اسلام کی تعلیمات میں شائبہ بھی نہیں بلکہ پس خوردہ (جھوٹے) کھانے پینے میں شفا بتلائی گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے اثرات راجستھان و گجرات کی ہندو سوسائٹی پر بھی پڑے اور ان میں ان بُرائیوں کے انسداد کی طرف توجہ پیدا ہوئی۔ لہٰذا برادرانِ وطن میں اسلامی اثرات کے سبب (اور زیادہ اس خوف سے کہ ہندوؤں کی اکثریت مسلمان نہ ہو جائے) مختلف اصلاحی تحریکات کا جنم ہوا یعنی ؏

ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا

افسوس کہ آج ان بھائیوں کی تحریکات نے بجائے اصلاح کے ایذا رسانی اور حملہ آور رخ اختیار کر لیا ہے۔ جبکہ انھیں مسلمانوں اور اسلامی تعلیمات کا مرہون منت ہونا چاہیئے کہ ان کی قسمت میں اگر مشرف بہ اسلام ہونا مقدر نہ تھا تو کم از کم ان کی سماجی، معاشی، تمدنی اور علمی و روحانی اصلاح صرف سیرتِ مبارکہ کے اثرات کے سبب ہوئی ہے ورنہ اس گم کردہ راہ قوم کو یہاں اسلام کی آمد سے قبل کوئی ہوش نہ تھا ؎

بلبل کو ہوشِ گل تھا نہ قمری کو عشقِ سرو
یہ سارے گل کھلائے ہو باغباں کے ہیں

قسط ۲

علی محمود طٰہٰ — حسومات

ابوسفیان اصلاحی، علی گڑھ

علی محمود طٰہٰ کی تالیفات!

اس کے آٹھ دواوین ہیں۔ (۱) الملاح التائہ (۱۹۳۴ء) (۲) لیالی الملاح التائہ (۱۹۴۰ء) (۳) ارواح شاردۃ (۱۹۴۱ء) (۴) ارواح واشباح (۱۹۴۲ء) (۵) زھر وخمر (۱۹۴۳ء) (۶) اغنیۃ الریاح الاربع (۱۹۴۳ء) (۷) الشوق العائد (۱۹۴۵ء) (۸) شرق وغرب (۱۹۴۷ء)

ان میں سے بیشتر دواوین کئی بار شائع ہوئے۔ بعض پانچ پانچ، چھ چھ بار طباعت کے مرحلے سے گذرے۔ ان کے علاوہ اس کے بہت سے قصائد ادبی جرائد ورسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ (۱)

وہ حسین مناظر کا دلدادہ۔ لطیف جذبات اور سحر انگیز تخیلات کا مالک تھا۔ وہ حسن کا شیدائی اور متلاشی تھا۔ پیار ومحبت کے نغموں میں گم رہتا۔ آرام وآسائش اور تعیش پسندی اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس نے خود کو ایک الہامی نغمہ قرار دیا کہ جسے سارا زمانہ گنگناتا رہا اور اس کے ساز پر آسمان رقص کرتا رہا۔

علی محمود طٰہٰ کی خواہش تھی کہ کاش وہ ایک تتلی کے مانند ہوتا اور اِدھر سے اُدھر حسین اشیا اور خوبصورت پھولوں کی تلاش میں منڈلاتا رہتا، جس طرح کہ ایک تتلی ایک پھول سے دوسرے پھول پر پھدکتی رہتی ہے۔ پھول کا رس چوستی ہے، پانی پر اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی ہے۔ علی محمود طٰہٰ کی زندگی بھی تتلی ہی کے مانند ہے۔ حسن وجمال ہمیشہ

اس کا شعار تھا۔ ساری زندگی جشنِ طرب مناتا رہا اور یورپ کے محلوں میں دادِ عیش دیتا رہا۔(۲) جیسا کہ اس کے اشعار اس بات پر شہادت دیتے ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

یالیت لی کالفراش اجنحتہ　　اھفو بہا فی الفضاء ھیمانا

ارف للنور فی مشارقہ　　أ اغتدی من سناہ نشوانا

وارشف القطر بواکرہ　　فلا اروی القفاف ظمآنا (۳)

اس کے قصیدے "اللہ والشاعر" کا ذکر پیچھے آچکا ہے جو دیوان الملاح التائہ میں شامل ہے۔ یہ اس کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے اور اس سے اس کے فن کی وقعت و عظمت منظرِ عام پر آتی ہے۔ اس میں اس نے ایک ایسے انسان کی تصویر کشی کی ہے کہ جسے نہ تو مکمل طور سے شک ہے اور نہ ہی پورے طور سے یقین و اطمینان۔ اشعار کو پڑھنے سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ کرب و درد اور اضطراب سے دوچار ہے۔ کبھی وہ قضا و قدر پر ایمان لاتا ہے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قضا و قدر سے منحرف ہونے لگتا ہے۔ خداوند قدوس کے احکامات کی بجا آوری کرتا ہے اور کبھی شکایات۔ پورے قصیدہ سے یہی بات سامنے آئی کہ وہ متردد اور سرگرداں ہے۔ وہ جہاں پس و پیش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ وادیٔ تیہہ میں بھٹکنا ہی اس کا مقدر بن چکا ہے یہی چیز ایک شاعر کو بلند شاعر بنا دیتی ہے اور ایک عظیم شاعر تادمِ زیست موج حوادث سے مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر رہتا ہے (۴)

علی محمود طٰہٰ — شاعر

علی محمود طٰہٰ کا تعلق جدید شعراء کے اس مکتبِ فکر سے ہے جو مطران اور شکری کے نظریات کا حامل رہا۔ اس نے شعراء مہجر اور فرانس کے رومانی شعراء سے بھی استفادہ کیا مثلاً بودلیر اور فرینی سے وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ اپولو شعراء کے اسکول میں انفرادی شخصیت کا حامل ہے اس کے یہاں فنِ شاعری میں بڑا تنوع ہے۔ اس نے رمزیہ شاعری کی اور یونان کی ان داستانوں کو منظوم کیا جن میں جنگ و جدال اور خونریزیوں

حسن معانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ بعد کے آنے والے شعرا انھیں سے متأثر ہوئے۔ یہ جذبات اور مناظر فطرت کی نہایت حسین عکاسی کرتے۔ ان کا میلان جدیدیت کی طرف تھا۔ وہ اپنے احساسات کو آزادی کے ساتھ پیش کرتے۔ ان لوگوں نے ایک ایسے فن کی بنیاد ڈالی جس میں پوری طرح ادبی قدریں موجود ہیں۔

علی محمود طٰہٰ کا مطالعہ اور زبان وقواعد کے باب میں اس کی معلومات بہت محدود تھیں اس کے دواوین میں اکثر نحوی ولغوی غلطیاں مل جائیں گی۔ اپنے قصیدہ" علی الصخرۃ البیضاء" میں کہتا ہے۔

بحارۃ الوادی تلفع بالدجی   وتنشد الحان الربیع المباکر (۱۱)

یہاں مناسب تھا کہ وہ" تلفعوا اور" انشدوا" کہتا۔ یا" یتلفعون" اور" ینشدون" کہتا کیونکہ فعل شعر کا وزن بگاڑ دیتا ہے۔

ایسی ہی غلطی اس کے قصیدہ" الکرمۃ الاولیٰ" میں ہے۔

ھاتی اسقنی ھاتی   من دنّھا المحتوم

انس بھا الآسی   من عمری المحتوم (۱۲)

یہاں مناسب تھا کہ وہ" اسقینی ھاتی" کہتا کیونکہ مخاطب مونث ہے اور شعر کے وزن کو بگاڑ دیتا ہے۔

ایسے ہی اس کے قصیدہ" عام جدید" میں ہے۔

کن یشیر الحب والنور الی   نھج کلھی داکبا ودواھی (۱۳)

یہاں مناسب تھا کہ وہ" اکبار دوام" کہتا۔

اس طرح کی بے شمار غلطیاں علی محمود طٰہٰ کے یہاں ہیں۔ اس کی طرف طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب حدیث الاربعاء" میں اس کے دیوان" الملاح التائہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے (۱۴)

علی محمود طٰہٰ کے یہاں شاعر کا مقام:

علی محمود طٰہٰ کا خیال ہے کہ شاعر ایک نمایاں شخصیت کا مالک ہے۔ دار فانی اور دار باقی

دونوں ہی جگہوں پر وہ ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔ اس نے شعراء کے قصائد کو گرانقدر تصور کیا۔ وہ شاعر کی ولادت و عظمت۔ اس کی شراب اور اس کا بندہ و خدا سے کیا تعلق ہے۔ ان موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ دنیا میں اس کا کیا مقام ہے اور یہاں سے جانے کے بعد روزِ آخرت میں کیا ہوگا۔ اسے بھی زیرِ بحث لایا۔ شاعر اپنے انتقال کے بعد اپنی شاعری سے یاد کیا جاتا ہے اس پر روشنی ڈالی۔

شاعر دنیا میں روشنی کے ساتھ آتا ہے اسے عصا ساحرانہ اور قلب نبی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ وہ انسانی شکل میں روح کا ایک حصہ ہے۔ ایک شاعر کی ولادت سے ساری کائنات روشن ہو جاتی ہے۔ پورا گہوارۂ ارض خوشبوؤں سے معطر ہو جاتا ہے۔ زمین روشنیوں سے اس کا استقبال کرتی ہے۔ ہرے بھرے درخت اس کی آمد پر تالیاں بجاتے ہیں۔ چڑیا چہچہانے لگتی ہیں۔ دوشیزائیں صبح سویرے اٹھکر اپنے گھروں کے لان میں آجاتی ہیں۔ چاند و ستارے کی ضیاء پاشیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اہل زمانہ ایک شاعر کو اچھے القاب و آداب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اس کا نغموں سے استقبال کرتے ہیں۔ فرشتے بھی آپس میں خوشیاں مناتے ہیں اس کے پیدا ہوتے ہی سارا عالم کیف و انبساط میں کھو جاتا ہے۔ (۱۵)

هبط الارض کالشاعر السنی　　بعصا ساحر و قلب نبی
لمعة من اشعة الروح حلت　　فی تجالید هیکل بشری
رجبتہ البیان ریا من السحر　　بہ للعقول اعذب ری
الہمت اصفریہ من عالم الحکمة　　والنور کل معنی سری (۱۶)

شاعر نے زمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ خداوند قدوس نے دنیا کا سارا حسن و جمال ہماری ذات سے عبارت کیا۔ خدا مکمل خیر ہے اس لئے ہمارے لئے بھی ہمیشہ خیر ہی پیدا کرے گا۔ اور ہمیں آخرت میں جنت الفردوس سے نوازے گا۔ (۱۷)

ایتها المحزونة الباکیة　　لا تیأس من رحمة المنقذ
لعل من آلامك الطاغیة　　اذا دعوت اللہ من منقذ

فابتهلی اللّٰہ واستغفری وکفری عنک بنذ الا لسم
وقدمی التوبۃ واستمطری بین یدیہ عبرات الندم (۱۸)

علی محمود طٰہٰ کا خیال ہیکہ شاعر کے یہاں یہ تقدس اور عظمت اس کے احساسات کی دین ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ شاعر نبی کی مانند ہے۔ وہ خدا کا پیغام اور اس کے احکامات کو بندوں تک پہونچاتا ہے۔ اور عوام کو پیغام محبت اور تحفۂ حسن عطا کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے لئے باعث شفقت و رحمت ہے وہ کہتا ہے۔ (۱۹)

انا الذی قد ست احزانہ الشاعر الشاکی شقاء البشر
فتبرت بالرحمۃ العسا نہ فأملت بہا یارب قلب القدر (۲۰)

شاعر دنیا میں دست شفقت کے ساتھ آتا ہے تاکہ غریبوں اور مظلوموں کے آنسوؤں کو پونچھ سکے۔ وہ اپنے خوبصورت نغموں ہی کے سبب نبی سے مشابہ ہے۔ دونوں ہی دنیا میں پیغام رسانی ہی کے لئے بھیجے جاتے ہیں نبی پیغام الٰہی کا ذمہ دار ہے اور شاعر پیغام رحمت کا۔ وہ کہتا ہے۔

ما الشاعر الفنان فی کونہ الا ید الرحمۃ من ربہ

(جاری)

حوالہ جات

---

(۱) علی محمود طٰہٰ۔ شعر و دراسۃ۔ ص۔ و۔ ش۔ ت۔

(۲) ایضاً ص۔ ن۔ و۔ ف۔

(۳) ایضاً ص۔ ن۔ و۔ ف

(۴) طٰہٰ حسین۔ حدیث الاربعاء۔ الطبعتہ الثامنہ۔ دارالمعارف مصر سنہ ۱۹۶۸ء ۳/۱۴۳۔

(۵) تاریخ الشعر العربی الحدیث ص ۲۷۶ نیز دیکھئے عباس محمود العقاد کی کتاب "شعراء مصر وبیئاتہم فی الجیل الماضی ص ۲۰۲۔

(۶) علی محمود طٰہٰ شعر و دراسۃ ص ۴۴۷، ۴۴۸۔

(۷) تطور الشعر العربی الحدیث فی مصر ص ۱۵۱۔
(۸) الادب العربی المعاصر فی مصر ص ۱٦۳۔
(۹) ایضاً ص ۱٦۴۔
(۱۰) المجمع العلمی الہندی۔ ڈاکٹر سید مختار احمد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۷٦ء ۱/۲۸۔
(۱۱) علی محمود طٰہٰ شعر و دراستہ ص ۳۰۸۔
(۱۲) ایضاً ص ۴۹۵۔
(۱۳) ایضاً ص ۴٦۵۔
(۱۴) ایضاً ص د۔ش۔ت نیز ملاحظہ ہو "حدیث الاربعاء" ص ۳/۱۴٦۔
(۱۵) علی محمود طٰہٰ شعر و دراستہ ص ا۔ب۔
(۱٦) ایضاً ص ٦۲۰
(۱۷) ایضاً ص ط۔ا ب۔
(۱۸) محاضرات فی شعر علی محمود طٰہٰ ص ص ۲۲۸۔۲۲۹۔
(۱۹) علی محمود طٰہٰ شعر و دراستہ ص ۲۷۹۔
(۲۰) ایضاً۔

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء)

ڈاکٹر محمد عمر، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قسط ۵

(۲) دربار اور اس کے قوانین!

دربار مغلیہ کا بیان: دربار مغلیہ میں لوگ اپنے مناصب کے لحاظ سے کھڑے ہوتے تھے۔" امرار خاص سرخ کٹہرے کے اندر کھڑے ہوتے تھے۔ جن کا مقام دوسروں کے مقابلے میں تین سیڑھیاں بلند ہوتا تھا۔ اسی کے نیچے دوسرا ایک" وسیع" احاطہ ہوتا تھا جس میں سرکاری عہدہ داران کھڑے ہوتے تھے۔ اس (کٹہرے) کے باہر سرکاری فوج اور ان کے سپہ سالار کھڑے ہوتے تھے۔ اس کٹہرے کے بہت سے دروازے ہوتے تھے، ہر ایک دروازے پر ہاتھ میں سفید ڈنڈے لئے چند دربان مقرر کئے جاتے تھے۔ وہ لوگ وہاں نظم ونسق برقرار رکھتے تھے۔ بادشاہ کے سامنے ایک ماہر جلاد کے ساتھ منصفِ اعلیٰ کھڑا ہوتا تھا جس کے ساتھ چالیس معاون ہوتے تھے جو" دوسرے سب لوگوں سے روئی کی مختلف ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے" ان کے کندھوں پر کلہاڑیاں لٹکی ہوتی تھیں اور ان کے بغل میں کوڑے ہوتے تھے۔ وہ لوگ بادشاہ کے احکامات کی تکمیل کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

معائنہ!

سکّے کے علاوہ شہنشاہ روزانہ ہر قسم کے مال وزر اور جانوروں کا معائنہ

سجایا کرتا تھا۔ اس قسم کی تمام چیزوں کو مختلف طریقے سے۔ ۳۶ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا تاکہ وہ (بادشاہ) ہر ایک کو روزانہ دیکھ سکے جیسے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی، خچر اور جواہرات وغیرہ۔" اس طرح یہ سلسلہ پورے سال جاری رہتا تھا کیونکہ جو چیز آج اس کے سامنے پیش کر دی جاتی تھی تو اس چیز کو بارہ مہینوں کے بعد وہ اسی دن دیکھتا تھا۔

جائداد کی ضبطی کا قانون:

ایک منصبدار کی وفات پر بادشاہ اس کی ساری دولت کو اپنی تحویل میں لے لیتا تھا۔ متوفی کے بچوں کو جو کچھ وہ چاہتا تھا دے دیتا تھا۔ ہاکنس کے بیان کے مطابق "بالعموم وہ (بادشاہ) ان کے (بچوں) ساتھ اچھا سلوک کیا کرتا تھا۔ ان کے والد کی زمینیں ان میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ اس کے بڑے بیٹے کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ جو ایک نہ ایک دن اپنے باپ کا پورا خطاب حاصل کر لیتا تھا۔"

پرچہ نویس:

چاہے بادشاہ نشے میں ہوتا یا معتدل، اس کی خدمت میں ہمہ وقت کاتب حاضر رہتے تھے جو اس کی بات کو قلم بند کر لیتے تھے جو وہ کرتا تھا یا کہتا تھا۔ لہذا کوئی بات نظر انداز نہیں ہوتی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے بیانات کو محفوظ کر لیا جائے اور اس کی فتوحات کو قلم بند کر لیا جائے تاکہ اس کے مرنے کے بعد تاریخوں میں اس کا ذکر کیا جا سکے۔

جشنِ نوروز:

نوروز کا جشن ۱۸ دنوں تک منایا جاتا تھا۔ شاہی محل میں ہر ایک امیر کے کمروں کو بڑی حد تک سجایا جاتا تھا۔ (قلعے کے اندر) ایک وسیع میدان میں ایسے خیمے نصب کئے جاتے تھے: "جو اپنی شان و شوکت میں عدیم المثال ہوتے تھے"۔ ایک شامیانہ وسط میں لگایا جاتا تھا۔ اسے ایسی قناتوں سے گھیر دیا جاتا تھا "جو عجیب و غریب مخمل کی ہوتی تھیں۔ اس مخمل پر سنہری اور

روپہلی اور زردوزی کا کام ہوتا تھا" ہاکنس کے اندازہ کے مطابق یہ شامیانہ دو ایکڑ زمین پر پھیلا ہوتا تھا۔ اس میں ریشمی اور سنہری چٹائیاں بچھائی جاتی تھیں۔ اسے مخمل کے پردوں سے سجایا جاتا تھا۔ ان پر سنہری گل کاری کا کام ہوتا تھا۔ ان پر موتی اور قیمتی پتھر جڑے ہوتے تھے۔ اگر اس کی خواہش ہوتی تو بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے اس شامیانے کے اندر پانچ کرسیاں رکھ دی جاتیں۔ اس کی بیگمات کے لئے پردہ دار کمروں کا انتظام کیا جاتا تھا جہاں بیٹھ کر وہ جشن کا منظر دیکھتیں لیکن انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اپنی حیثیت کے مطابق ہر ایک امیر اپنے کمرے کو سجاتا تھا بادشاہ ان کے ہاں جاتا اور "اعلیٰ پیمانے پر اس کی تواضع کی جاتی" وہ امیر اس کی خدمت میں جواہرات اور دوسری نادر چیزیں پیش کرتے۔" چونکہ اس موقع پر وہ بطور عطیہ کوئی چیز قبول نہیں کرتا اس لئے وہ اپنے خازن کو حکم دیتا کہ وہ ان عطیات کی اتنی قیمت ادا کردے جو وہ لوگ ان چیزوں کی قیمت بتائیں۔

دوران جشن میں (صرف دو دن) اعلیٰ خاندانوں کی مستورات سیر و تفریح کے لئے بازار میں جایا کرتی تھیں۔

نذرانوں کے ساتھ عرضیاں :

یہ ایک عام دستور تھا کہ بلا تحفے تحائف کوئی شخص بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا تھا۔ پیش کردہ تحائف کے ذریعہ بادشاہ کو سائل کی ضروریات کا علم ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا اور اگر سب باتیں اس کے حق میں ہوتی تھیں تو اسکی درخواست منظور کر لی جاتی تھی۔

منصبداروں کی تنخواہیں :

ہاکنس نے لکھا ہے کہ "انھیں فی گھوڑا بیس روپے اور ہر ایک مشہور گھوڑے کے لئے دو روپے ماہانہ کے حساب سے دیئے جاتے تھے اور اُن کے رکھنے کے اخراجات بھی دیئے جاتے تھے" مزید براں وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ دوران جنگ میں اگر ایک سپہ سالار کو ... مشہور گھوڑے رکھنے پڑتے تھے ؛ جنہیں وہ جنگ کے لئے نہیں رکھتا تھا بلکہ اپنے اصطبل

کے لئے۔ ہر ایک مشہور گھوڑے کے لئے مزید اسے تقریباً دو روپے اور دوسرے پانچ ہزار گھوڑوں کے لئے فی گھوڑا ماہانہ بیس روپے دئے جاتے تھے۔

(۳) امرار

تین سال کے وقفے کے بعد شاہی دربار:

اگر کوئی امیر دو یا تین سال تک شاہی دربار میں حاضر نہ ہوتا اور پھر وہ حاضر ہوتا تو اس صورت میں اسے معتوب نہ کیا جاتا بلکہ وہ محل کے دروازہ پر اس وقت تک کھڑا رہتا جبتک وزیر یا بخشی اور میر دربار آکر اسے اپنے ساتھ لے جاکر بادشاہ کی خدمت میں پیش نہ کرتا۔ ان دنوں امیروں کے درمیان وہ کٹہرے کے باہری دروازہ پر آتا جہاں پر وہ بڑی سنجیدگی سے تین مرتبہ زمین بوس کرتا۔ ایسا کرنے کے بعد وہ گھٹنے کے بل جھک کر زمین پر اپنا ماتھا ٹیک دیتا۔ یہ عمل صرف ایک مرتبہ کیا جاتا تھا۔ بعدازیں اسے اور آگے لے جایا جاتا تھا اور اس کٹہرے کے وسط میں پہونچکر" ایک بار پھر وہ کورنش کرتا۔ اس کے بعد بادشاہ اُسے سات سیڑھیوں تک اوپر چڑھنے کا حکم دیتا" جہاں وہ اس سے بغلگیر ہوتا۔ اس کے بعد وہ امیر واپس لوٹ جاتا اور جاکر اپنے منصب کے مطابق جگہ پر کھڑا ہو جاتا۔

اگر کسی امیر کو معتوب کیا جاتا تو اسے سرفراز نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں عدالتی کارروائی کے انتظار میں اپنی جگہ پر کھڑا رہتا۔

(۴) عوام، مذہبی عقائد اور توہّمات

ستی: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاکنس نے کسی عورت کو ستی ہوتے نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس نے اس رسم کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس اجازت کا ذکر کیا ہے جو بادشاہ نے دی تھی۔ اس نے یہ لکھا ہے

" میں نے یہ دیکھا ہے کہ اعلیٰ گھرانوں کی بہت سی عورتوں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا کیونکہ (اس سے اجازت حاصل کئے بنا) کوئی عورت خود کو نہیں جلا سکتی تھی اور جنہیں وہ خود نہ دیکھ لیتا، میری مراد آگرہ سے ہے۔ ان میں سے جب کوئی عورت حاضر ہوتی ہے تو

بادشاہ تحفے تحائف اور مدد معاش دینے کے بہت سے وعدوں کے ذریعہ اسے اس عمل کے کرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے اگر وہ زندہ رہنا چاہے۔ لیکن میرے زمانے میں کسی عورت کو ستی ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ خود کو جلا لیتی تھی۔ جب بادشاہ یہ دیکھتا کہ اس کے منع کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا تو وہ اسے ستی ہونے کی اجازت دیتا اور وہ اپنے متوفی شوہر کے ساتھ زندہ جل جاتی"۔

(۵) متفرقات

ہندوستانی روپیہ:

"ہندوستان میں اتنی کثیر مقدار میں چاندی پائی جاتی ہے کیونکہ تمام اقوام کے لوگ یہاں سکہ لاتے ہیں اور یہاں سے اشیاء خرید کر لے جاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں یہ سکہ زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے اور یہاں سے باہر نہیں جاتا"۔

باغی سرداروں کو سزا:

باغیوں کا مقابلہ کئے بنا پٹنہ سے بھاگے ہوئے آٹھ سپہ سالاروں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ لوگ اس شہر سے بھاگ کر آئے تھے جو ایک دوسرے سپہ سالار نے ان کے حوالے کیا تھا۔ اس نے انھیں بادشاہ کی خدمت میں اس لئے بھیجا تھا کیونکہ انہوں نے بزدلی کا ثبوت دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ حکم صادر کیا کہ ان کے سروں اور داڑھیوں کے بال منڈا دیے جائیں، انھیں زنانہ لباس پہنایا جائے اور گدھوں پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جائے۔ جب انھیں واپس لایا گیا تو ان کے کوڑے لگوائے گئے اور دائم القید میں ڈال دیا گیا۔

ولیم فنچ (۱۶۰۸ تا ۱۶۱۱ء)

سوانح عمری:

"ہکٹر" نامی بحری جہاز پر سوار ہونے کے پہلے کے ولیم فنچ کی زندگی کے بارے میں بہت

حالات ...

لنن کا ملازم تھا۔

اگست ۱۶۰۸ء میں ہاکنس کے ساتھ وہ سورت کے بندرگاہ میں اترا۔ وہاں وہ اس وقت
ب انگریزوں کے گوداموں کا ناظم رہا جب تک اس کے افسر اعلیٰ نے اسے آگرہ نہ بلالیا۔ جنوری
۱۶۱۰ء میں وہ آگرہ کے لئے روانہ ہوا اور مغلیہ سلطنت کے دارالخلافہ میں وہ اپریل کے مہینے
ں پہنچا۔ اسی سال کے آخری دنوں میں نیل خریدنے کے لئے وہ بیانہ گیا۔ چونکہ وہ اس چیز
و مکہ بھیجنا چاہتی تھی، اس لئے مادر شاہ کے گماشتے بھی اسی شئے کو خرید رہے تھے۔ حالانکہ
س کے گماشتے اس چیز کو خریدنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود فنچ نے ساری نیل خریدلی، اس نے
بادشاہ سے اس بات کی شکایت کی۔ قدرتی طور پر اس بات سے ہاکنس کی سفارت پر بُرا اثر
پڑا۔

فنچ واپس آگرہ آگیا لیکن اسے خریدی ہوئی نیل کو فروخت کرنے کے لئے لاہور
بھیجا گیا۔ وہ دہلی، انبالہ اور سلطانپور کے راستوں سے لاہور ہوتا ہوا فروری ۱۶۱۱ء میں
لاہور پہونچا۔ اگست تک اسے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اس کے بعد واپس آنے کے لئے اسے ہاکنس
کا پیغام ملا۔ چونکہ وہاں کے مقامی بازار میں اس نیل کے فروخت ہونے کی زیادہ امید نہ
تھی۔ اس لئے اس نے آگرہ میں مقیم اپنے اعلیٰ افسروں سے —— یہ درخواست کی کہ یا تو اسے
برّی راستے سے اس نیل کو الیپّو لے جانے کی اجازت دی جائے یا اسے اس کی خدمات سے
سبکدوش کردیا جائے اور اس کی تنخواہ ادا کردی جائے۔

فنچ کے بارے میں ہاکنس کو بددیانتی کا شبہ تھا۔ اس نے خفیہ طور پر ایک یسوعی
کو حکم دیا کہ اگر وہ مغرب کی طرف جانے والے کسی کارواں میں شریک ہو جائے تو اسے
گرفتار کرلیا جائے۔ اسے اس کی خدمات سے سبکدوش کرنے کے لئے نیکولس اُوفٹ کو
بھیجا گیا۔ جب اس کی گرفتاری کا راز فاش ہوگیا تو فنچ طیش میں آگیا اور اس نے یہ اعلان
کیا کہ اس کے بعد وہ ہاکنس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ ہوگا۔ لہٰذا اس نے سمندری سفر
سے انکار کردیا جب جورڈین نے اسے ایسا کرنے کی دعوت دی۔ اس لئے اس نے برّی راستے

بادشاہ تحفے تحائف اور مدد معاش دینے کے بہت سے وعدوں کے ذریعہ اسے اس عمل کے کرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے اگر وہ زندہ رہنا چاہے۔ لیکن میرے زمانے میں کسی عورت کو ستی ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ خود کو جلا لیتی تھی۔ جب بادشاہ یہ دیکھتا کہ اس کے منع کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا تو وہ اسے ستی ہونے کی اجازت دیتا اور وہ اپنے متوفی شوہر کے ساتھ زندہ جل جاتی"۔

(۵) متفرقات

ہندوستانی روپیہ؛

" ہندوستان میں اتنی کثیر مقدار میں چاندی پائی جاتی ہے کیونکہ تمام اقوام کے لوگ یہاں سکّہ لاتے ہیں اور یہاں سے اشیاء خرید کر لے جاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں یہ سکّہ زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے اور یہاں سے باہر نہیں جاتا"۔

باغی سرداروں کو سزا؛

باغیوں کا مقابلہ کئے بنا پٹنہ سے بھاگے ہوئے آٹھ سپہ سالاروں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ لوگ اس شہر سے بھاگ کر آئے تھے جو ایک دوسرے سپہ سالار نے ان کے حوالے کیا تھا۔ اس نے انھیں بادشاہ کی خدمت میں اس لئے بھیجا تھا کیونکہ انہوں نے بزدلی کا ثبوت دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ حکم صادر کیا کہ ان کے سروں اور داڑھیوں کے بال منڈا دیے جائیں، انھیں زنانہ لباس پہنایا جائے اور گدھوں پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جائے۔ جب انھیں واپس لایا گیا تو ان کے کوڑے لگوائے گئے اور دائم القید میں ڈال دیا گیا۔

ولیم فنچ (۱۶۰۸ء تا ۱۶۱۱ء)

سوانح عمری؛

"ہکٹر" نامی بحری جہاز پر سوار ہونے کے پہلے کے ولیم فنچ کی زندگی کے بارے میں بہت

کم حالات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات قطعی یقینی ہے کہ جیپ سانڈ نامی مقام پر وہ ماسٹر جانسن کا ملازم تھا۔

اگست ۱۶۰۸ء میں ہاکنس کے ساتھ وہ سورت کے بندرگاہ میں اترا۔ وہاں وہ اسوقت تک انگریزوں کے گوداموں کا ناظم رہا جب تک اس کے افسر اعلیٰ نے اسے آگرہ نہ بلالیا۔ جنوری ۱۶۱۰ء میں وہ آگرہ کے لئے روانہ ہوا اور مغلیہ سلطنت کے دارالخلافہ میں وہ اپریل کے مہینے میں پہنچا۔ اسی سال کے آخری دنوں میں نیل خریدنے کے لئے وہ بیانہ گیا۔ چونکہ وہ اس چیز کو مکہ بھیجنا چاہتی تھی، اس لئے مادر شاہ کے گماشتے بھی اسی شئے کو خرید رہے تھے۔ حالانکہ اس کے گماشتے اس چیز کو خریدنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود فنیچ نے ساری نیل خریدلی، اس نے بادشاہ سے اس بات کی شکایت کی۔ قدرتی طور پر اس بات سے ہاکنس کی سفارت پر برا اثر پڑا۔

فنیچ واپس آگرہ آگیا لیکن اسے خریدی ہوئی نیل کو فروخت کرنے کے لئے لاہور بھیجا گیا۔ وہ دہلی، انبالہ اور سلطانپور کے راستوں سے لاہور ہوتا ہوا فروری ۱۶۱۱ء میں لاہور پہونچا۔ اگست تک اسے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اس کے بعد واپس آنے کے لئے اسے ہاکنس کا پیغام ملا۔ چونکہ وہاں کے مقامی بازار میں اس نیل کے فروخت ہونے کی زیادہ امید نہ تھی۔ اس لئے اس نے آگرہ میں مقیم اپنے اعلیٰ افسروں سے ـــــ یہ درخواست کی کہ یا تو اسے بری راستے سے اس نیل کو الیپو لے جانے کی اجازت دی جائے یا اسے اس کی خدمات سے سبکدوش کردیا جائے اور اس کی تنخواہ ادا کردی جائے۔

فنیچ کے بارے میں ہاکنس کو بددیانتی کا شبہ تھا۔ اس نے خفیہ طور پر ایک یسوعی کو حکم دیا کہ اگر وہ مغرب کی طرف جانے والے کسی کارواں میں شریک ہو جائے تو اسے گرفتار کرلیا جائے۔ اسے اس کی خدمات سے سبکدوش کرنے کے لئے نیکولس اوفٹ کو بھیجا گیا۔ جب اس کی گرفتاری کا راز فاش ہوگیا تو فنیچ طیش میں آگیا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ اس کے بعد وہ ہاکنس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ ہوگا۔ لہٰذا اس نے سمندری سفر سے انکار کردیا جب جورڈین نے اسے ایسا کرنے کی دعوت دی۔ اس لئے اس نے بری راستے

سے انگلستان کا سفر کیا۔ وہ بغداد میں بیمار ہوا اور اسکی موت واقع ہوگئی۔
ہگٹ نے اس کے کپڑے اور اس کے روپئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیئے
پر چاز جب کمپنی کے دفتر خانے کی تلاشی لے رہا تھا تو اس موقع پر اسے وہاں فنچ کی ایک
ضخیم روزنامچہ" ملا۔ اس وقت سے وہ قلمی نسخہ غائب ہوگیا تھا۔
چونکہ ۱۱ اگست ۱۶۱۱ء میں فنچ کا روزنامچہ ختم ہوگیا تھا اس لئے اس نے اپنی سیاحتوں
کا حال کاغذ کے پرزوں میں لکھ لیا تھا جو غالباً کھو گئے تھے۔ پرچاز کا خیال ہے کہ فنچ نے
کسی دوسرے کے مقابلے میں آدمیوں، جانوروں، پودوں، شہروں، قلعوں، پُلوں، مذاہب
کی زیادہ صحیح حقیقت بیان کی ہے، اور علاوہ ازیں برتنوں اور اشیائے تجارت کا"

The Early Travels in India

کے عنوان سے فورسٹر نے ایک چھوٹی سی جلد میں اس روزنامچہ کو شائع کیا ہے۔ یہ کتابچہ
۱۹۲۱ء میں آکسفورڈ سے شائع ہوا ہے۔ ذیل میں تمام اقتباسات اسی کتابچہ سے ماخوذ
ہیں۔

(۱) تجارتی راستے

(برہانپور) ہوتے ہوئے سورت سے آگرہ کے لئے راستہ:-

سورت، بکبریا، موتا، کرود، کرکا، نرائن پور، دیتا، بدھور، نندربار، نیم گل
سنگھ کیرا، تھلینر چوپرا، اراود، ریور، برہانپور، بورگانوں، انبالہ، مگرگانوں، بلکیر، تارپور
اکبرپور، لونرہ، دیپالپور، اجین، کنسیا، سونیرا، پیپل گانوں، سارن پور، کلسور، بورا
برائی، شکرلئے، سرونج، کچھبر سرائے، شاہ دوارہ، کالاباغ، کلہارس، سپری، ناروار
پرائچ، انتری، گوالیار، منڈیاکھیرہ، جاجو، آگرہ۔

آگرہ۔ احمد آباد:

آگرہ، فتحپور سیکری، سکندرہ باد، ہندون، چھیدر گانوں، مغل سرائے، نون گانوں

اجین، جیدا، چشو، لڈنا، موزاباد، بندر سکندر، اجمیر، مرتھا، بیپر، جوگی کا گانوں، خندیہ
جلور، مدرا، بھنل، ردھنپور، احمد آباد۔

لاہور۔ کابل :

لاہور، کچھ سرائے، امین آباد، چیما گکّر، گجرات، خواصپور، رتہاس، ہتیا، پکّا
راولپنڈی، کالا پانی، حسن ابدال، اٹک، پشاور، علی مسجد، ڈاکا، بساول، بریکا، علی بوگن
جلال آباد، لوری چار باغ، ملا، گندمک، سرخاب، جگدلک، آپ بریکی، دو ایک بکری، کابل۔

(۲) شہر، قصبات، قلعے، سرائیں اور تالاب

سورت شہر، قلعے اور گوپی تلاؤ :

یہ شہر اچھا تھا۔ بہت سے مقامات میں تاجر پیشہ لوگ رہتے تھے۔ "بندرگاہ"
جہاں بحری جہازوں سے "مال اتارا" جاتا تھا وہ مقام ندی کے دہانے سے تین کوس کی
دوری پر واقع تھا۔ اس کے آگے وہ ندی شہر تک بڑی حد تک جہاز رانی کے قابل
تھی۔ ۵۰ ٹن سامان لدی کشتیاں بڑی آسانی سے اس ندی سے گذر سکتی تھیں۔ ندی
کے کنارے آکر ہر شخص سورت کا قلعہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی "دیواریں اچھی" تھیں۔
اور اس کے چاروں طرف "خندق" بنی ہوئی تھیں۔ تقریباً اس میں دو سو گھوڑ سوار تعینات
تھے۔ اس کے اندر ایک "سبزہ زار" میدان تھا اور اس ہرے بھرے میدان کے وسط
میں روشنی کے دیے کھمبا نصب تھا۔ نوساری دروازہ کے سامنے ایک تالاب تھا جسکے
چاروں طرف سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے وسط میں ایک چھوٹا سا مکان (بارہ دری)
تھی۔ تالاب کے ایک کنارے پر بہت سے "اچھے" مقبرے تھے۔

برہانپور :

وہ شہر بڑا تھا لیکن "قابل نفریں" تھا۔ وہ نچلی سطح پر بسا ہوا تھا لیکن وہاں

کی آب و ہوا گندی تھی۔ پانی کی خرابی کیوجہ سے یہ شہر صحت کے لئے نقصان دہ تھا شہر کے شمال مغرب میں ندی کے علاوہ، بڑا اور مستحکم ایک قلعہ تھا۔ ندی میں ہاتھی کا "جیتا جاگتا" جیسا ایک مجسمہ نصب تھا۔ اور اصل کے بالکل "مشابہ" تھا۔ اس کے سر پر سرخ رنگ کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور بہت سے ہندوستانی اس کی پرستش کرتے تھے۔

منڈوگڑھ ا

یہ شہر کھنڈرات کی حالت میں تھا اس کے قریب واقع پہاڑی کی چوٹی پر ایک قلعہ واقع تھا۔ اس مقام پر مصنف نے بہت سی مسجدیں، مقبرے اور بڑے محلوں کی بعض ٹوٹی پھوٹی دیواریں دیکھی تھیں۔ شہر کے مشرقی سمت میں اچھی چراگاہیں تھیں۔ پہاڑوں پر تقریباً ۱۶ تالاب واقع تھے۔ وہ شہر بہت چھوٹا تھا۔ وہاں "مضبوط پتھروں اور بہت بلند دروازوں" کی عمدہ دیواریں تھیں۔ اس سیاح نے ایک جامع مسجد اور قدیم بادشاہوں کے مقبرے بھی دیکھے تھے۔ لیکن ان کے ذکر کی طرف سے بے اعتنائی برتی ہے۔ اس کے برعکس اس نے ایک عمارت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

" اس عمارت کے ایک سمت ایک مینار کھڑا تھا۔ جسمیں نیچے سے اوپر تک ایک سو ستر سیڑھیاں تھیں۔ وہ مینار اپنی ساخت میں گول تھا۔ ہر ایک کمرے میں کھڑکیاں تھیں۔ یہ سب کمرے اپنے اچھے دروازوں، محرابوں، کھمبوں اور دیواروں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے تجاوز کرتے تھے۔ ان سب میں ہرے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی خوبصورتی دو بالا ہوگئی تھی۔"

اس شہر کے اردگرد ایک فصیل تھی۔ جو پہاڑی کے اوپر سے نیچے کی طرف آتی تھی۔

(باقی آئندہ)

December 1993
Regd. No. DL 11
Phone : 3262815
R. No. 965-57
Per Copy Rs. 5.00

BURHAN Monthly

4136 ... Jama Masjid, DELHI 1100